در ہیچ پردہ نیست نباشد نوائے تو
عالم پُر است از تو و خالی است جائے تو

تذکرہ علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی

موسوم بہ

حیات جلیل

حصہ دوم

جسمیں میر مبرور کے کلام اور تصانیف کا مبسوط تذکرہ، اور اُن پر نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔
نیز اولاد و احفاد و اعقاب اور معاصرین قدر فرمایان کے مفصل حالات مندرج ہیں

از

مولوی سید مقبول احمد صاحب صمدنی
مایٹک سُوسائٹی آف گریٹ برٹین اینڈ آئرلینڈ - و - فیلو رایل سوسائٹی
آف آرٹس مینوفیکچرس اینڈ کامرس لندن وغیرہ

کیوں اہلِ حشر ہو کوئی نقادِ سوزِ دل
لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

فہرست عناوین مضامین تذکرہ علامہ میر عبدالجلیل بلگرامی حصہ دوم

فہرست حواشی و فوائد تحت المتن تذکرۂ میر عبدالجلیل بلگرامی حصہ دوم

بعض تصحیحات کتابت حصۂ دوم

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب	صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
ز	فہرست	۱۴	اسکی اوجہ	اسکی وجہ،	۳۳	۷	۰	تزرّدِ	تزرّدٍ
۵	؍؍	۹	احترار	احتراز	۳۶	۰	۲	۹۲۰ھ	۹۲۱ھ
۲	۰	۳	ملکی	کی	۳۷	۳	۰	بِالتِّنشاطِ	بِالتَّنشَاطِ
۴	۰	۱۶	میری	سیری	۴۴	۷	۰	اِنْجھامہٗ	اِنْجھامَہ
۱۴	۱۹	۰	مفر	سفر	۴۴	۰	۴	سنہ ۱۶۷۳	سنہ ۱۶۷۳ء
۱۵	۸	۰	بیتی	بیستی	۴۹	۶	۰	محفوظ	محظوظ
؍؍	۱۹	۰	۱۸۵۴-۱۵۳	۱۸۵۲-۵۳	۵۱	۸	۰	لسنت	نیست
۱۹	۱۹	۰	العلا	العسلا	؍؍	۱۵	۰	بتھادیا	بٹھادیا
۲۰	۶	۰	خوارند	خواندند	۵۳	۱	۰	ہُزیرَہ	ہِزَبرِہ
؍؍	۱۰	۰	تقید	تقیید	؍؍	۰	۲	موتھم افیہم	موتھم بانیہم
۲۲	۱۰	۰	پیشیر	پیشتر	۵۴	۸	۰	انصرت	نصرت
۲۴	۰	۷	عہدکی	عہدکے	۵۵	۰	۹	یعرفٌ	یُعرفُ
؍؍	۰	۹	موتیا محل	مٹیا محل	؍؍	۰	۱۱	فحول	فُحُولُ
؍؍	۰	۱۱	سید محمد قنوجی	سید محمد قنوجی متوفی	۵۶	۰	۱۰	مر	مصر
				۲۲ شوال سنہ ۱۱۰۱ھ	۵۷	۶	۰	تنیغ	تیغ
۲۵	۰	۵	۰۸۸ھ	۱۰۸۸ھ	۶۴	۷	۰	مجھے	مجھے شہ
۲۶	۰	۲	لڑکے کا	لڑکے سید نورالشمس	؍؍	۰	۷	Biggs	Briggs
				مخاطب بہ امجد خان کا	۶۵	۴	۰	بودوباش	بودوباش ۱۲ھ
؍؍	۰	۱۴	روایت	رفاہیت	۶۸	۹	۰	تخئیل	تخیل
۳۳	۷	۰	جاہلاگو	جاہلاگوَ	۷۴	۱۱	۰	مفقدین	معتقدین

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
۷۷	۵	۰	نہیا ء نماز	نہیہ نماز
۷۷	۰	۳	۱۶۷۲ ع سمبت	۱۶۷۲ سمبت
۸۰	۱۱	۰	نہ ہوا تھے	نہ ہوا ہے
″	″	۰	کنہین	کہیں
۸۲	۰	۰	چار	چہار
۸۳	۱۶	۰	बेहार	बेहात
۸۹	۱۴	۰	گرو	گرُو
۹۰	۷	۰	پیس	لیس
۹۲	۰	۳	حدف تحتانی	حذف تحتانی
۹۵	۱۴	۰	شاگرون	شاگرداں
۹۷	۰	۱۳	فرمولی	فریلی
۹۹	۰	۱۹	کے سمت	کی سمت
۱۰۲	۰	۶	دیگر مسجد	دیگر مسجد
۱۰۳	۱۳	۰	مصاحیت سے	مصاحبت کی جہت سے
″	۰	۱۹	سنہ ۱۲۰۸ھ	سنہ ۱۰۶۸ھ
۱۰۹	۰	۱۳	سنہ ۱۰۰۸	سنہ ۱۰۹۸ھ
۱۱۴	۳	۰	تخیل	تخییل
۱۱۵	۱۷	۰	نصیبا	نصیبا
۱۲۱	۱۴	۰	بگامرار	بگلزار

صفحہ	سطر متن	سطر نوٹ	خطا	صواب
۱۲۲	۵	۰	جنوبي	جنوبی
۱۲۳	۷	۰	نوسو	نوسو
۱۲۴	۱۱	۰	نواھی	نواحی
″	۰	۷	آں بگلانہ	آں را بگلانہ
۱۲۷	۰	۶	اور دیگر	و دیگر
۱۲۸	۰	۸	سنہ ۹۸۱ع	سنہ ۹۸۱ھ
۱۳۱	۰	۱۲	سنہ ۱۳۳۶ھ	سنہ ۱۳۲۶ھ
۱۴۰	۰	۳	فوجیں	فوجی
۱۵۳	۲	۰	معہ	مع
۱۵۳	۰	۹	صدی کے	صدی مسیحی کے
۱۵۵	۱۳	۱	کے مابین	نوٹ کی فاصل لکیر
۱۵۹	۲	۰	اَنعُم	نِعَمُ
″	۷	۰	المتضی	المستضیٔ
۱۷۵	۰	۱۸	وبات	دہات
۱۸۰	۵	۰	فماالقادت	فما القادت
۱۷۳	۹		qutidissime	utidissime
۱۷۳	۹	۰	qater	pater

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ازدواج و اعقاب

میر عبد الجلیل کا ازدواج سید مرتضی بن سید فیروز بلگرامی کی دختر سے ہوا تھا۔ اس قران سعید کی یادگار ایک لڑکا اور تین لڑکیاں تھیں۔ لڑکے کا نام سید محمد تھا۔ جو اپنے باپ کے خلف الصدق اور علم و فضل و سخنوری میں خاندان کا شرف تھے۔ ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ جدا لکھا جائیگا۔ میر عبد الجلیل نے وقتاً فوقتاً جو خطوط سفر سے ان کو لکھے تھے اور جن کو ترتیب دیکر انھون نے یکجا کیا تھا محل مناسب پر ان پر بھی تبصرہ کیا جائے گا۔ کہتے ہیں کہ تاریخ واقعات کو دہراتی ہے میر عبد الجلیل کے باپ (سید احمد سید عبد اللہ کے) متبنّیٰ تھے میر عبد الجلیل کے بیٹے کو بھی یہی صورت ضرورت پیش آئی۔ سید محمد کے کوئی اولاد صلبی[۵۱] نہ تھی۔ انھون نے اپنے بھانجے سید غلام امام صادق (غلام علی آزاد کے سب سے چھوٹے بھائی) کو متبنّیٰ کر لیا تھا۔

میر عبد الجلیل کی (۱) بڑی لڑکی سید محمد اشرف[۵۲] (پدر محمد یوسف[۵۳]) بن سید عبد العزیز کو بیاہی گئی سے

---

۵۱ شجرہ طیبہ۔ جلد دوم

۵۲ جب میر عبد الجلیل بھکر میں متعین و مقیم تھے تو محمد اشرف کو سیوستان میں اپنا نائب کر دیا تھا۔ محمد اشرف جب وطن آئے۔ تو سید کرم اللہ اپنے برادر عم زاد کو نیابت سیوستان پر چھوڑ آئے تھے

۵۳ محمد یوسف۔ میر غلام علی آزاد کے حقیقی خالہ زاد بھائی اور ہم عمر و ہم سبق تھے۔ ایک مدت دراز تک دونون یکجا رہے تھے جوانی اور بقیہ ایام حیات تقاضائے آب و خور سے آزاد نے سفر و سیاحت دکن میں بسر کیے اور یوسف نے وطن میں۔ یوسف نے بعد کو شاہجہان آباد جاکر علوم ریاضی و ہیئت و ہندسہ و حساب وغیرہ تحصیل کیے۔ الفرع النابت من الاصل الثابت اُن کی تصنیف ہے۔ بیمار ہوئے۔ علاج کیلئے لکھنؤ گئے۔ ۲ر جمادی الآخر ۱۱۷۲ھ (۳۱ر جنوری ۱۷۵۹ع) کو لکھنؤ میں انتقال کیا۔ نعش بلگرام آئی اور ۴ر ماہ مذکور کو دفن کی گئی۔ یوسف و آزاد کے باہم بڑی محبت تھی۔ ایام مفارقت میں بڑی درد انگیز اور ولولہ خیز منظوم مراسلات و غزلیں ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ آزاد نے تاریخ وفات لکھی ہے

ماتت نور الزمان یوسفنا + ولہ راحۃ و ریحان
اذ تقاضیت سال رحلتہ + قال قلبی علیہ رضوان

(۲) منجھلی سید محمد نوح بن سید فیروز شہید (والد غلام علی آزاد) سے اور (۳) چھوٹی سید عنایت اللہ بن سید کرم اللہ سے بیاہی گئی۔ سید غلام صادق کے بڑے لڑکے میر اولاد محمد ذکا، زوجۂ اولیٰ سے تھے۔ دوسری بی بی سے بھی اولاد ہوئی جس کا سلسلہ باقی و قائم ہے۔

سید نوح، اُن کے لڑکے اور متوسلین خود کو "بلگرامی" فخریہ بتاتے تھے لیکن بزرگان بلگرام کو اس انتساب پر ہمیشہ اعتراض رہا۔ منشی غلام حسن ثمین شرائف عثمانی میں لکھتے ہیں۔

"بزرگ حضرت آزاد مذکور از قصبہ سہارن، در عہد ملک بہلول لودی[۵۹] در بلگرام برای تحصیل علم برآمدہ بعد چندی بوجہ اخلاق اہلیان بلگرام طرح توطن انداختہ، این معنی بر جمہور قدمای بلگرام ہویدا است"

---

۵۴ سید محمد نوح سات سال تک بھکر، بہلورتان میں میر عبد الجلیل کے نائب رہے تھے۔ ۱۰ محرم ۱۱۶۵ھ (۱۹ نومبر ۱۷۵۱ع) کی شب میں ستر سال کی عمر میں بلگرام میں ناگہاں وفات پائی۔ کچھ دن تک نواب سربلند خان کی ملازمت و رفاقت میں بھی رہے تھے۔ الہ آباد مستقر خدمت تھا۔

۵۵ سید فیروز نے رجب ۱۱۲۸ھ (جولائی ۱۷۱۶ع) میں وفات پائی۔

۵۶ میر اولاد محمد ذکا، آزاد کے حقیقی بھتیجے تھے۔ ۲۰ رجب ۱۱۵۱ھ (۳۱ اکتوبر ۱۷۳۸ع) کو پیدا ہوئے اپنی تاریخ ولادت خود لکھی تھی ؎

روزے کہ نمود بندہ را حق ایجاد ۔۔۔ اولاد محمد پدرم نام نہاد
گفتم تاریخ خویشتن را من خود ۔۔۔ در ماہ رجب تولد ما رو داد

آزاد نے ان کو ۱۱۷۲ھ (۱۷۵۹ع) میں اپنے پاس بلا لیا تھا۔ وہیں اورنگ آباد میں زیر سایۂ عم محترم تعلیم و تربیت پائی۔ خوش لیاقت و خوش گو تھے۔ آزاد نے تذکرہ خزانۂ عامرہ ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ع) میں انکی فرمائش سے لکھا تھا۔

۵۷ غلام حسن صدیقی فرشوری تھے۔ نامور خاندانی قاضی اور اہل علم تھے۔ آزاد کی مآثر الکرام فی تاریخ (نسب سادات) بلگرام کے جواب میں وہاں کے شیوخ کی ایک مبسوط تاریخ شرائف عثمانی نام ۱۱۷۹ھ (۶۶-۱۷۶۵ع) میں لکھی تھی۔ ان کا تذکرہ سرو آزاد میں بھی ہے (صفحہ ۳۵۰) شرائف عثمانی ایک مستند کتاب ہے، اکثر مورخین و تذکرہ نگاران نے اس کا حوالہ دیا ہے۔

۵۸ افسوس ہے کہ یہ تاریخ اب تک طبع نہیں ہوئی۔ بلگرام، سہارن، سندیلہ وغیرہ میں اس کے متعدد نسخے پرانے رؤسا و شرفا کے یہاں محفوظ ہیں، نیز انگلستان میں انڈیا آفس لائبریری اور برٹش میوزیم میں۔ ولیم آروین نے کوارچ کے نیلام گھر سے ایک نہایت صحیح و مکلف نسخہ خریدا تھا جس پر بعض پرانے امرا کی مہریں اور بعض عالی مرتبت انگریز عہدہ داران فوجی و ملکی کے دستخط ثبت تھے۔ مفتاح التواریخ میں ٹامس ولیم بیل نے اس کتاب کا اکثر

سمدرن ضلع فرخ آباد کی مقامی روایات اور پرانے اسناد و مقالات و مقامات بھی ثمین کے قول کی تصدیق کرتے ہین۔ عہد اسلام کے ناموَر مؤرخ و محقق ولیم آروِن نے جو فرخ آباد مین مدت تک حاکم اعلیٰ رہے تھے۔ واقعات احمد شاہ ابدالی و وزیر عماد الملک[۱۱۱] کے انگریزی ترجمہ کے دیباچہ مین اس امر کو اپنے مخصوص انداز مین بیان کیا ہے۔

فرزندانِ مجازی

اس صنف مین فرزانگان پیشینہ نے عموماً تلامذہ و خوشہ چینان خرمن علم کو شامل و داخل کیا ہے۔ میر عبد الجلیل کے شاگردون کا شمار بہت کم تھا اور ظاہر ہے کہ جس شخص کی عمر یا حیات علمی کا بڑا حصہ مشاغل خدمات اور حضوری دربار مین گذرا ہو جسکے اوقات عزیز ادائے فرائض و سنن کے بعد تمامتر حل و عقد امور حکومت و نظم اور عزائم رزم و بزم مین بسر ہوتے ہون اپنے افاضے سے شائقین علم و فن کے لئے صلائے عام دینے کا موقع کہان پا سکتا تھا۔ تاہم وہ تھوڑا سا وقت جو میر صاحب بچا سکے اور جس مین اپنے ہونہار اعزہ کو اپنے ہمراہ یا زیر نظر رکھ سکے بہت قابل قدر تھا اور حقیقتاً وہ نہایت عمدہ مصرف و شغل مین گذار گیا۔ میر عبد الجلیل کے دونون جگر گوشے (دختر زادے)

حوالہ دیا ہے اور بہت سے بلگرامی حضرات کے حالات اسی سے نقل کئے ہین۔ اسکا ایک عمدہ اور مکمل نسخہ بنگال ایشیاٹک سوسایٹی کلکتہ کے کتب خانہ مین موجود ہے۔

۱۰۹ سلطان بہلول نے ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) سے ۸۹۴ھ (۱۴۸۸-۸۹ء) تک یعنی ۳۸ سال ۸ ماہ ۷ روز سلطنت کی تھی

۱۱۰ مسکین نے چند واقعات چشم دید کو ۱۷۵۷ء (۱۱۷۱ھ) مین کپتان جوناتھن اسکاٹ کی فرمایش سے قلمبند کیا تھا۔

۱۱۱ Ahmad Shah Abdali and The Indian Wazir Imad-ul-Mulk (1756-57), by William Irvine.—1907. Bombay Education Society's Press.

غلام علی آزاد اور محمد یوسف یوسف بلحاظ تعلیم و تربیت اُن کے خلف صالح اور بہترین یادگار ثابت ہوئے ہیں۔ آزاد کا ترجمۂ احوال و سوانح مستقلاً اس تذکرہ میں دیا جائیگا۔ یوسف کا مختصر تذکرہ حواشی ذیل میں آچکا ہے۔

ان کی تعلیم و تعلم کی حالت بھی یہ تھی کہ جب ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں سولہ سال کے بعد میر عبد الجلیل بلگرام آئے تھے تو آزاد سترہ سال کے تھے اور یوسف آزاد سے چھ ماہ چھوٹے۔ دونوں نے اپنے سن شعور میں ان کو پہلی بار دیکھا تھا۔ بلگرام کے دس ماہ کے قیام میں جو کچھ سیکھا ہوگا اسکو محض شرف تلمذ یا احراز سعادت کہنا چاہئے۔ اسی عمر میں اسی استعداد و قابلیت کیساتھ دونوں نے میر صاحب سے سند حدیث مسلسل بالاولیہ[۱۱۲] اور حدیث اسودین[۱۱۳] کی

---

۱۱۲ حدیث رحمت مسلسل بہ اولیت یہ ہے الراحمون یرحمہم الرحمن تبارک وتعالی ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء اس کی تضمین بہت سے ائمہ و حفاظ حدیث نے فرمائی ہے۔ شیخ ابو الخیر محمد بن محمد بن علی الشہیر بہ ابن الجزری کہتے ہیں۔

تجنب الظلم من کل الخلائق فی ۔۔۔ کل الامور فیاویل الذی ظلما
وارحم بقلبک خلق اللہ کلہم ۔۔۔ فانما یرحم الرحمن من رحما

حافظ ابو القاسم علی بن الحسن بن ہبۃ اللہ بن عساکر دمشقی فرماتے ہیں۔

بادر الی الخیرات یاذا اللب مغتنما ۔۔۔ ولا تکن عن قلیل الخیر محتشما
واشکر لمولاک ما اولاک من نعم ۔۔۔ فالشکر یستوجب الافضال والکرما
وارحم بقلبک خلق اللہ وارعہم ۔۔۔ فانما یرحم الرحمن من رحما

۱۱۳ محدثین کے نزدیک بالاتفاق اَسْوَدین (دو کالی چیزوں) سے مراد کھجور اور پانی ہیں۔ ظاہر ہے کہ عرب کی عمدہ اور نفیس کھجور سیاہ ہوتی ہے۔ اُس کی مجاورت و مقارنت کے سبب سے پانی کو بھی سیاہ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کلام عرب میں اس طرح اکثر آتا ہے جیسے ابوین اور قمرین۔ اسیکو تغلیب کہتے ہیں۔

مآثر الکرام میں حدیث اسودین کی سند کا حاصل کرنا لکھا ہے۔ اور وہ حدیث یہ ہے عَنْ عَائِشَةَ قَالَتْ تُوُفِّیَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَمَا شَبِعْنَا مِنَ الْاَسْوَدَیْنِ متفق علیہ۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ پیغمبر خدا نے وفات پائی اور ہم نے دو سیاہ چیزوں یعنی کھجور اور پانی سے پیٹ نہیں بھرا (جیسے یہ قوت بھی بطریق سیری نہ ملا) اس کو بخاری و مسلم نے نقل کیا ہے۔

مسلسلات میں بھی ایک حدیث متعلق بہ اسودین داخل ہے جو حدیث مسلسل بالضیافۃ علی الاسودین

حاصل کی۔ اکثر کتب احادیث کی بھی اجازت پائی۔ اِس کے بعد یہ دونون (خالہ زاد بھائی جو ہم عمر اور ایک ہی سال کے پیدا تھے اور ہمیشہ ایک جگہ رہے تھے) ۱۱۳۴ھ (۲۲-۱۷۲۱ء) مین میر عظمت اللہ بلگرامی کو ساتھ لے کر شاہجہان آباد گئے اور وہان دو سال کے قریب اُن کی صحبت مین رہے اور بعض کتابین حدیث و سیرۃ نبوی و ادب و دیگر فنون کی پڑھین لُغت بالخصوص قاموس جس کے میر صاحب ماہر فرید سمجھے جاتے تھے اُنھین سے پڑھی۔ طریق تحصیل یہ تھا کہ ہمیشہ دو کتابین یا ایک ہی کتاب دو مقام سے باہم ملکر پڑھتے تھے۔ ایک سامع ہوتا تھا دوسرا قاری۔ دونون کی رفتار علم یکسان و برابر رہتی تھی۔ احیاناً اگر ان مین سے ایک بیمار پڑجاتا یا کوئی اور امر مانع پیش آجاتا تو دوسرے کا سبق بھی ناغہ کر دیا جاتا، معرض توقف مین رکھا جاتا۔ اسکے ساتھ یہ روش بھی جاری رہتی کہ یہ دونون جب موقع پاتے تو اورون کو بھی پڑھاتے تھے۔

میر عبدالجلیل کے جامع کمالات و فنون بیٹے میر سید محمد کو بھی ان کے فیضان صحبت اور ارشاد و ہدایت سے کافی حصّہ پہنچا تھا۔ اُنھون نے اپنے باپ کے پارہائے جگر یا زادہائے طبع کے القاء و ترتیب مین حصّہ لیا تھا اسلئے وہ بھی جداگانہ تذکرہ کے محتاج و مستحق ہین۔

---

۱ حدیث مسلسل بالاضافۃ علی الاسودین کہلاتی ہے وہ یہ ہے

قال علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ۔ اضافنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی لتمر والماء ثم قال من اضاف مؤمنا فکانما اضاف آدم علیہ السلام ومن اضاف مؤمنین فکانما اضاف آدم وحوا ومن اضاف ثلاثۃ فکانما اضاف جبرئیل ومیکائیل واسرافیل ومن اضاف اربعۃ فکانما قرأ التوراۃ والانجیل والزبور والفرقان ومن اضاف خمسۃ فکانما صلی الصلوۃ الخمس فی جماعۃ من اول یوم خلق اللہ عزوجل الخلق الی یوم القیامۃ ومن اضاف ستۃ فکانما اعتق ستین رقبۃ من ولد اسماعیل علیہ السلام ومن اضاف سبعۃ غلقت عنہ ابواب جہنم السبعۃ ومن اضاف ثمانیۃ فتحت لہ ثمانیۃ ابواب الجنۃ ومن اضاف تسعۃ کتب اللہ لہ حسنات بعدد من عصاہ من اول یوم خلق اللہ الخلق الی یوم القیمۃ ومن اضاف عشرۃ کتب اللہ لہ اجر من صام وصلی وحج واعتمر الی یوم القیمۃ۔

جب تک دارالخلافہ میں قیام تھا بعض جلیل القدر مشائخ و علما بھی ان کے حلقۂ درس میں حاضر ہوتے اور مائدۂ فیض سے زلّہ ربائی کرتے رہتے فقر و تصوّف کی کتابیں پیش نظر ہوتیں۔ مجاہدات و ریاضت و تزکیۂ نفس و مکاشفات کے مسائل زبان حال سے بیان ہوتے، غوامض و نکات حل کئے جاتے۔ انوار و برکات کا نزول ہوتا۔ ایک طرف دونوں نور دیدہ (آزاد و یوسف) علم و ادب کے سبق لیتے۔ دوسری طرف سیّد غلام مصطفےٰ شہید معتمد و مصاحب نواب مبارز الملک سربلند خاں توفی ناظم گجرات، مثنوی مولانا روم کا ورد کرتے سبقاً سبقاً پڑھتے اور اجازت و سند لیتے تھے، میر آزاد ید بیضا میں لکھتے ہیں "مستعد انے کہ در وادی علوم علم مہارت می افراشتند اکثر مشکلات لاینحل خود را برای عقدہ کشائی آنجناب عرض می داشتند"

میر عبدالجلیل کے بعض خواص تلامذہ اور نیازمند احباب یہ تھے

(۱) میر احمد لاہوری متخلص بہ فائق۔ عالمگیری منصب دار اور لاہور میں مہتمم خزانۂ سرکار تھے بڑے طباع و ذہین نظم میں سلیقۂ وافر رکھتے تھے جس زمانہ میں کہ میر صاحب شاہ دولا گجرات میں تشریف رکھتے تھی میر احمد اپنے اشعار انکے پاس بھیجا کرتے تھے اور بڑے عجز و عقیدت سے اصلاح کیلئے درخواست کرتے تھے۔ انکے بعض مسودات کے آخر میں انکے قلم سے لکھی ہوئی یہ عبارت ملی تھی

"سیدا، ملاذا، مشفقا، مہربانا! درین ولا از شغل باز ماندہ از گفتنی ہا گذشتہ غزلے چند نوشتہ شدہ بنظر اصلاح خواہد درآمد۔"

۱۳ نواب سے اور مہاراجہ ابھے سنگھ والی مارواڑ سے احمد آباد گجرات کے قریب ۸ ربیع الآخر ۱۱۴۳ھ (اکتوبر ۱۷۳۰ع) میں جنگ شدید ہوئی اسی میں شہید ہوئے تھے نعش مبارک ہرچند تلاش کیگئی نہیں ملی۔ شہادت سے پہلے یہ رباعی کہی تھی جسمیں حال آیندہ کی خبر دی تھی ؎

درخلوت ما ورائے ما پایۂ نیست ۔۔۔ یعنی کہ بعرش و فرش اعیاں نیست

ماچون جانیم پاک ز آلایش مرگ ۔۔۔ مارا بہ جنازہ و کفن کارے نیست

میر عبدالجلیل کے ہموطن اور بڑے مرتاض اور عالم ربّانی تھے گو لظاہر سپہ گری کے پیرایہ میں بسر فرماتے ابتدا میں فارغ متخلص کرتے تھے پھر ترک کر دیا تھا۔ غزل اور رباعیات کا دیوان مکمل ہو چکا تھا۔ توحیدی باعتبار

فائق کا خاندان بھر شاعر، اور شہرت یافتہ شاعر تھا میر جلال الدین سیادت، ان کے حقیقی بھائی تھے لیکن فائق نے ایک بیگانہ سے تلمذ، اصلاح پسند کی۔ بھائیوں سے رجوع نہیں کیا یہ محض قدر کمال اور نظر انتخاب کی کشش تھی۔

(۳) سید محمد زمان راسخ سرہندی ایک بڑے پایہ کے شاعر اور خوش گو تھے۔ انکی شہرت اور ناموری ایران تک پہونچی تھی۔ مرزا طاہر نصیر آبادی نے اپنے تذکرۃ الشعرا میں ان کو یاد کیا ہے۔ شاہزادہ محمد معظم بن عالمگیر بادشاہ کی سرکار میں منصب ہفت صدی ذات پر سرفراز تھے اور حسن شمائل و لطف خصائل سے متصف میر عبد الجلیل اور راسخ سے بڑا ارتباط تھا کچھ روز تک دونوں آگرہ میں اقامت گزین رہے تھے اُس وقت کا اختلاط و وداد آخر تک قائم رہا۔ اُسی زمانہ سے راسخ اپنا کلام میر کو دکھاتے تھے۔ سنہ ۱۱۰۷ھ د ۱۶۹۵ع میں سرہند میں وفات پائی۔ "راسخ بمرد" تاریخ ہے۔ مثنوی خوب کہتے تھے یادگار شایستہ چھوڑی تھیں۔ راسخ ہی نے ناصر علی کو بچایا اور دہلی بھجوا دیا تھا۔ شیخ محمد معصوم ناصر علی کو ایک باغ میں شراب پیتے دیکھا اور پوچھا کیا ہے؟ جواب ملا کہ "وہ شراب جس کو ملائکہ پیتے ہیں"۔ شیخ نے تو درگزر فرمایا لیکن صوفیوں اور علمار نے تکفیر کی بنا پر محضر قتل تیار کیا راسخ مع اپنے اقربا کے مسلح ہو گئے اور ناصر علی کو ساتھ لے جا کر سرہند سے دہلی روانہ کر دیا۔

راسخ کے لڑکے میر معصوم مخاطب بہ عالی نسب خان متخلص بہ وجدان بھی مشہور شاعر تھے ارادت خان اور میر غازی شہید دونوں راسخ کے شاگرد تھے۔

(۴) شیخ محمد رضا جن کا ذکر پیشتر آچکا ہے۔ اصل گلشن شستر کے رہنے والے تھے۔ بھکّر میں توطّن اختیار کر لیا تھا۔ عربی فارسی میں استعداد کامل رکھتے تھے۔ عالمگیر بادشاہ کے عہد سے لے کر محمد شاہ کے زمانہ تک بھکّر کے اکثر عہدے مثلاً فوجداری بھکّر وغیرہ اصالتاً و نیابتاً ان کے تعلق رہے تھے۔ میر عبد الجلیل سے اعتقاد تمام رکھتے تھے اور بے انتہا انقیاد و اطاعت سے پیش آتے، اپنا کلام شاگردانہ دکھاتے تھے سنہ ۱۱۴۲ھ د ۱۷۳۰ع میں وفات پائی۔ میر عبد الجلیل جب

کے لکھنے میں سلیقۂ عالی رکھتے تھے حکیم سحابی کی تقلید میں ایک پورا دیوان رباعیات کا مرتب کر لیا تھا۔

ہندوستان چلے آئے تھے تو بھکر میں شیخ کو اپنی خدمات پر نیابتاً مقرر کر آئے تھے۔

(۴) شیخ سیف الدین محمد طبیعت تخلص، اعیان و مشائخ اَلوَر[۱۵] سے تھے۔ ان کے والد شیخ غلام محی الدین، صاحب فضل و کمالات تھے علوم متداولہ اور فنون متعارفہ میں دستگاہ کامل عربی و فارسی ہندی کی نظم میں سلیقۂ خوب رکھتے تھے۔ شیخ سیف الدین نے اوائل میں مختصرات متداولہ مختصر المعانی تک اپنے والد سے پڑھی تھیں۔ اس کے بعد میر عبد الجلیل کی صحبت میں پہونچے اور اُن سے فضائل و کمالات اکتساب کئے۔ علوم ادبیہ میں پوری مہارت اور عربی و فارسی کی نثر میں یدطولی رکھتے تھے۔ میر غلام علی آزاد جب ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴-۳۵ع) میں سفر سندھ سے واپس آرہے تھے تو شیخ سے ملاقات کا اتفاق ہوا تین ماہ کے قریب شب و روز صحبت رہی

---

۱۵ الور، شمالی راجپوتانہ میں ایک بڑی ریاست ہے جس کے اطراف میں صوبہ پنجاب، ریاست ہائے جے پور، نابھہ و پٹیالہ و بھرت پور واقع ہیں۔ یہاں کی پہاڑیوں میں بعض نہایت عمدہ قسم کے پتھر برآمد ہوتے ہیں شہر الور۔ راجپوتانہ مالوہ ریلوے لاین پر واقع ہے۔ الور کا لفظ مختلف طور پر کہا جاتا ہے اور مختلف وجوہ تسمیہ بتائی جاتی ہیں بعض کہتے ہیں کہ پہلے اس کا نام اَلپُور یعنی مضبوط شہر تھا بعض کا قول یہ ہے کہ اس کا پرانا نام اَرَبل پُور یعنی شہر اَربلی منسوب بہ اروَلی (سلسلہ کوہ) تھا جسکے ساتھ الور کی پہاڑیاں وابستہ ہیں۔ جنرل کننگھم کا خیال تھا کہ یہ نام قبیلہ سَلوَنس سے نکلا ہے پہلے سَلوہ پورہ تھا پھر سَلوَر پھر ہَلوَر اور بالآخر اَلوَر ہوگیا۔ شہر کے پانچ پھاٹک ہیں اسکے گرد فصیل و خندق ہے صرف ایک موقع پر اسی طرف اتنی جگہ پر نہیں ہے جو سلسلہ کوہ سے محفوظ ہے اور جس طرف سے قلعہ ہر قسم کے حملوں سے بچا ہوا ہے۔

۱۹۰۱ع میں شہر کی آبادی ۵۶۷۷۱ تھی مگر گذشتہ مردم شماری (۱۹۲۱ع) میں ۴۴۷۶۰ رہ گئی عمارات قدیمہ میں ایک پرانا مقبرہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ۷۹۵ھ (۱۳۹۳ع) میں ترنگ سلطان کی یادگار میں بنایا گیا تھا جو فیروز شاہ تغلق کا بھائی تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ ناہر خان میواتی کا پوتا تھا چند قدیم مساجد بھی ہیں جن کے کتابے ستاہ حال و مقال ہیں۔ ان میں سے حسب ذیل قابل تذکرہ ہیں (۱) مسجد، جو دائرہ کی مسجد کہلاتی ہے قریب ۱۵۷۹ع (۹۸۶ھ) کی تعمیر ہوئی ہوگی جب اکبر کا گذر اس طرف سے ہوا تھا۔ یہی اکبری مسجد بھی کہلاتی ہے اور محلات کے قریب ہے (۲) اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی مسجد۔ (۳) قلعہ نہایت مستحکم و استوار اسکی ارتفاع کی بلندی پر واقع ہے۔

میر آزاد ان کی خوبی و فضائل و حسن شمائل، تہذیب اخلاق، مکارم آداب، شائستہ تمکین و وقار، ہر بزرگ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ شیخ کہتے تھے کہ میں مدت سے میر عبدالجلیل کے کمالات کا شہرہ سن رہا تھا اور ان کی محبت غائبانہ میرے دل میں پیدا ہو گئی تھی اور بڑھتی جاتی تھی۔ سنہ ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں میں وارد دہلی ہوا۔ اتفاقاً جہاں فروکش ہوا تھا اُسی کے قرب و جوار میں میر مرحوم بھی اقامت گزین تھے مجھے جیسے ہی اُنکی اطلاع ملی میں نے اُنکی خدمت میں رقعہ لکھا۔ اُس میں یہ دو شعر استاد مرحوم کے بھی داخل کر دیئے تھے۔ ؎

سلام علی من شاقنی بوصاله ۔۔۔ وان لم افز الا بطیب جماله
عشقت وما ابصرته غیر اننی ۔۔۔ سمعت من الحاکین وصف کماله

رقعہ بھیجنے کے بعد خدمت میں حاضر ہوا اور سعادت ملازمت حاصل کی۔ میں نے جو کچھ پایا ہے یہ سب میر کے فیض تربیت سے ملا ہے۔

خُدّام

عالمگیر سا باجبروت و جوہر شناس شہنشاہ اپنے رقعات میں ہر جگہ کاردان و کار آمد آدمی کے نہ ملنے کا اعتراف کرتا اور کہتا ہے کہ "آدم خوب نایاب است" اسکی زبان پر یہ شعر بار بار آجاتا ہے ؎

آنچہ بسیار است و کم دیدیم بسیار است نیست ۔۔۔ نیست جز آدم درین عالم کہ بسیار است و نیست

یہ تو ڈھائی سو برس پہلے کی بات تھی۔ اب اس زمانہ میں کہ ہر طرف سے قحط الرجال کی شکایت کی

نگوہتھار اجیپوران نے اسکو بنوایا تھا جو خانزادوں کے تسلط سے پہلے یہاں قابض و حکمران تھے۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ایک بڑی قبر ہے جو فتح جنگ کی کہلاتی ہے غالباً وہ بھی خانزادہ تھا لیکن اُس کا نسل ہنود سے ہونا کتبہ سے عیاں ہے کتبہ سنہ ۹۵۴ھ (۱۵۴۷ء) کا ہے اور ناگری ہے۔ یہ مقبرہ ساٹھ فیٹ مربع ہے۔ تین منزلیں ہیں اور طول و عرض یا [illegible] جن پر گنبد نما [illegible] گنبد [illegible] چاروں کونوں پر [illegible] سب سے اوپر ایک چوتھی منزل [illegible] جو مربع ہو کر [illegible] عرض و طول کسی قدر کم ہے۔ اسکی [illegible] گنبد، صراحی دار گردن سے ابھرتا ہوا گنبد بنا ہوا ہے۔ اس پر ایک چھوٹا سا مربع قبہ بنا ہوا ہے جو ایک برگ و بار دار ظرف پر قائم ہے۔

صدائے دلخراش اور بھی بلند ہو رہی ہے کون شخص اُس خوش نصیبی کا اندازہ کر سکتا ہی جو میر عبد الجلیل کو اپنے ملازمان خدمت اور مقربان صحبت کے بارہ مین حاصل تھی۔ اُن کے خطوط سے جو میر سید محمد کو لکھتے ہین پایا جاتا ہی کہ ان افراد وار ذال کی تعداد کثیر تھی مسلمان چاکرون سے ہندو نوکرون اور کہارون کا شمار زیادہ تھا جو ہر قسم کی خدمت بجالاتے اور وطن اور عزیزان وطن کی خبر اور ڈاک برابر لاتے رہتے تھے۔ اُن خطوط سے معلوم ہوتا ہی کہ فرجام حسین ۔ مداری و فیض اللہ خان خدمتگار ذاتی تھے گھاسی قاصد تھا فرید ۔ باندے چنتا من ۔ جمال ، رامو وغیرہ بھی ہم وطن اور معتمد ملازمان خدمت سے تھے۔ نیز کا کوئی خط ان لوگون کے ذکر سے خالی نہین جاتا تھا کبھی اصرار کرتے ہین کہ ان رفیقان دور افتادہ از وطن کے گھر والون کی خبر خیریت پہونچا دینا کبھی فرزند رشید کو لکھتے ہین کہ ”جانی و درگاہی کے بارہ مین آپنے لکھا تھا بالفعل مین روپیہ بھیجتا ہون ۔ اس کے بعد اور بھی بھیجون گا خاطر جمع رکھو گا اس وقت اس سے زیادہ میسر نہوا“ کم از کم ہر تحریر مین یہ تاکید ضرور ہوتی تھی کہ ”ہر مردم ہمراہی“ کے گھر بنام خیریت کہدینا اور سلام پہونچا دینا۔ اہل وطن سے کسی کا قاصد جب کبھی خبر خیریت لے کر گھر سے آتا تھا تو اُسپر بھی نگاہ لطف و کرم مبذول ہوتی تھی میر صاحب معمولاً اپنے خدمتگاران کو نفر لکھتے تھے اور سپاہی چپراسی کو پیادہ ۔

ہیرا سنگھ اُن کا منشی اور مقرب خاص تھا جس زمانہ مین دربار کی حاضری دونون وقت دینی پڑتی تھی اور میر صاحب عدیم الفرصت تھے تو افسوس کرتے تھے کہ ”ہیرا سنگھ بیمار ہست لہذا جواب خطوط نامرقوم

اکبر کے زمانہ مین الور صوبہ اگرہ مین ایک سرکار تھا ۔ ابو الفضل لکھتا ہی ۔ ”الور قلعہ دارد از سنگ بالای کوہ“ ہز ہائی نس راج راجیشر بھارتہ دہرم پربھاکر سوائی مہاراج شری جے سنگھ جی ورمیندر وشترمونی بالقابہ کے عہد دولت مین شہر اور ریاست الور نے کمال رونق و ترقی حاصل کی ہے حضور ممدوح بڑے علم دوست ہنر پرور بیدار مغز و روشن خیال فرمانروا ہین ۔ الور کے ممتاز و ناموررؤسا کو جو دلچسپی السنہ علوم مشرقیہ کے ساتھ رہی ہے اور جس کا جلوہ مرزا غالب اور دیگر انشا پردازون کی نیاز مندانہ و شکرانہ تحریرات مین نظر آتا ہے ۔ وہی التفات و سرپرستی سرکار عالی بھی مبذول فرما رہے ہین ۔

آنجا کہ میر سند لمی شود کہ بنویسیم۔ پھر کدام عذر خواہند گفت"۔ دوسرے خط میں لکھتے ہیں کہ "مُسکھ
بتاریخ ششم جمادی الآخر سنہ ۴ بقضائے الٰہی فوت شد۔ تاسف بسیار نمودیم بجز صبر چارہ نیست"
کوئی نوکر مر جاتا تو ان کو بے حد قلق و الم ہوتا۔ میر عبدالجلیل کا ایک پروردہ یا غلام تھا جس نے
سفر دکن میں بہت خدمت کی تھی اور کمال وفاداری و ثابت قدم ثابت ہوا تھا۔ قضائے الٰہی سے
خلد مکان کے لشکر میں وبا پھیلی۔ ایک عالم تاراج فنا کے حوالہ ہوا۔ اس غریب کا پیمانۂ عمر بھی لبریز ہو گیا
میر نے اس رفیق دیرینہ کے ماتم میں ایک نہایت پُرسوز مثنوی لکھی جس کا مطلع یہ تھا؎

بیا اے خامۂ ماتم روایت　　　پریشان ساز گیسوئے حکایت

میر ناصر علی[116] سرہندی سے ایک روز اس مثنوی کا ذکر آگیا۔ سن کر نہایت محظوظ ہوئے۔ نقل کی
استدعا کی۔ میر عبدالجلیل نے ایک نسخہ بھیج دیا۔ ناصر علی نے اسکی رسید میں یہ شعر فی البدیہہ کہہ کر اور
زرافشان کاغذ کے شقہ پر لکھ کر بھیج دیا۔؎

ندانم تا چہا از دست آلوب تو می آید　　　کہ بوئے خون مظلومان زمکتوب تو می آید

ہزار رحمت ہو اس گمنام غلام پر جس کی موت اُسکے بقائے نام کا باعث ہوئی اور شہرت دوام کی ضامن
غرض جامع ان کا ملازم ذات تھا۔ بلگرام میں بیمار پڑ گیا تو برابر اسکی مزاج پرسی کرتے اور دعا کے ساتھ یہ کہلا
بھیجتے ہیں کہ "اگر خوب تندرست ہو گئے ہو اور سفر کی طاقت ہو تو یہاں آنا۔ ورنہ وہیں ٹھہرنا تکلیف نہ کرنا۔"

---

[116] شیخ ناصر علی سرہندی استاد تھے۔ نیک بخت و بزرگی کے اعتبار سے شیخ کہلاتے تھے۔ بڑے مشہور اور قادر الکلام
شاعر تھے۔ علوم و فنون ظاہری کے سوا کمالات باطنی میں بھی پایہ بلند حاصل تھا۔ شیخ محمد معصوم خلف الصدق حضرت
مجدد سے استفادہ کیا تھا۔ سلسلۂ علیا نقشبندیہ میں منسلک تھے۔ اپنے وطن سرہند میں پیدا ہوئے۔ وہیں درس و
تعلیم پائی۔ ابتدا میں مرزا فقیر اللہ مخاطب بہ سیف خان بدخشی تخلص بہ فقیر کے یہاں ملازم رہے۔ جب مرزا صوبہ
الہ آباد کی حکومت پر مامور ہوا تو شیخ بھی اُس کی رفاقت میں الہ آباد چلے آئے اور چند روز تفریح کی سیر
و تفریح سے دل و دماغ تازہ کرتے رہے۔ سیف خان خود جوہر قابل و قابل و درست تھا۔ فن موسیقی اور
رقص ہندی میں ایک نہایت نفیس کتاب فارسی زبان میں "راگ درپن" نام لکھی ہے۔ اس کے ساتھ
شیخ کی خوب بسر ہوئی۔ اسکی وفات پر سنہ ۱۰۹۳ھ ۱۶۸۲ع میں شیخ بیجاپور چلے آئے اور امیر الامرا

اَولادِ مَعنوی

اس ذیل میں میر عبدالجلیل نے کچھ بڑا سرمایہ نہیں چھوڑا۔ اس کے وجوہ بھی یقیناً وہی تھے جو فرزندان مجازی کے تذکرہ میں بیان ہو چکے ہیں۔ تاہم یہ عنوان بھی خالی نہیں رہا بلکہ اسکی بحث و تحقیص و تبصرہ نے اس ناچیز تالیف کے چند اوراق سے زیادہ حصہ لے لیا ہے۔ اس ہیچمدان نے ہر صنف کلام کو جدا جدا رکھنا اور ان پر نظر ڈالنا چاہا ہے۔ میر صاحب کے نتائج طبع سے چند مختصر مثنویان چند قصائد چند رباعیان چند معمے۔ اور چند قطعات تاریخ یادگار ہیں۔

مثنویات میں سے صرف مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ ایک مستقل کتاب ہے جو طبع ہو چکی ہے جس پر جدا گانہ تبصرہ کیا جاویگا۔ اسطرح مثنوی کتخدائی ارشاد خان اور مثنوی امواج الخیال۔

اور بھی چند چیزیں ہیں جو آزاد کے زندہ جاوید قلم کے طفیل میں کم و بیش ہم تشنہ کامان علم و ادب تک پہونچی ہیں۔

باوجودیکہ میر عبدالجلیل اپنی خدمات شاعرانہ و ثناگستری کا صلہ نہیں لیتے تھے تاہم بوجہ تعلقات دربار و ملازمت سرکار آپ کو امرا کی قصیدہ خوانی بارہا کرنی پڑتی تھی۔ ان کے بعض قصائد اپنے اپنے موقع پر حسب ضرورت نقل کیے جائینگے۔ ان کے قصیدے متوسط درجہ اور حیثیت کے ہوتے تھے جنمیں کوئی زور یا خاص شان سخنوری یا لطافت ادا نہیں پائی جاتی۔

باقی چیزیں (تاریخیں۔ رباعیان قطعات او معمیات) نہایت مختصر اور متفرق ہیں جن کو اس خاندان کے علمی متروکات سے ڈھونڈھ کر نکالنا پڑا ہے۔

ذوالفقار خان بن اسد خان وزیر اعظم اورنگزیب و شاہ عالم پسر شریف خان صدر کل و غضنفر خان کی قدر شناسی و زر پاشی سے بہ رفاہ و آسایش گذاری۔ بالآخر ایک فقیر مجذوب شاہ حمید کے کہنے سے دکن سے پھر ہندوستان چلے آئے شاہجہان آباد میں قیام اختیار کیا قلندرانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ ۲۰ رمضان ۱۱۰۸ھ (۵ اپریل ۱۶۹۷ء) کو ساٹھ سال کی عمر میں رحلت فرمائی۔ مرقد حضرت سلطان المشائخ کے حوالی میں دفن ہوئے۔ ان کی مثنویوں کو اہل سخن بڑی قدر اور لطف سے دیکھتے اور پڑھتے ہیں بعض حضرات نے انکی تقلید بھی کی مگر ناکام رہے

میر غلام علی آزاد سبحۃ المرجان مین میر عبد الجلیل کے تفردات سے ایک دلیل ہندی کا بھی حوالہ دیتے ہین جو مسئلہ جزء لا یتجزٰی کے ابطال کے بارہ مین ہے۔ اس رسالہ تک چھپیز کو دسترس نہ ہو سکا ورنہ کچھ اُس سے بھی التقاط و استنباط کیا جاتا۔ آزاد نے جس قدر نقل کیا ہے۔ وہ عام فہم نہ ہونے کی وجہ سے قطعًا دلچسپ نہین۔

بل صاحب کی انگریزی تاریخ مطبوعہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۹۱ء مین دو کتابون کا نام اور لیا گیا ہے (۱) آداب المرسلین (۲) تبصرۃ الناظرین - (حالانکہ تبصرۃ الناظرین میر سید محمد کی تحریر ہے)

میر غلام علی آزاد اور دیگر تذکرہ نویسون نے میر عبد الجلیل کی تصنیفات مین ان دونون کتابون کا ذکر نہین کیا اور اس لئے اِن کو میر عبد الجلیل سے منسوب ماننے مین تامل ہوتا ہے۔

ایک اور چیز بھی مستقل تذکرہ اور تبصرہ کی محتاج و مستحق ہے اور جس کی نسبت آزاد نے مآثر الکرام مین تحریر[۱۶] دیا تھا کہ "میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق الشان پارہ از منشآت والا جمع کردہ اند" یہ خطوط وہی ہین جو میر صاحب نے اپنے صاحبزادہ کو سفر دکن (تر پایہ تخت دہلی) سے لکھے تھے اور جن سے زیادہ تر ذاتی معاملات اور تعلیمات اور خاندانی احوال پر روشنی پڑتی ہے اور کاتب اور اُسکی ناجمعیت خاطر اور دربار کے پر آشوب حالات کا پتہ چلتا ہے۔ لکھنے والے کو قلم اُٹھاتے وقت یہ وہم و گمان بھی نہ ہوگا کہ یہ تحریرات خانگی عوام کے ہاتھون مین کسی وقت پہونچین گی۔ اور دو ڈھائی سو برس بعد اُن حالات و کیفیات کو طشت از بام کرین گی جنکی بروقت خبر و شہرت ہوجاتی تو ہنگامہ برپا ہو جاتا اور سیل خون روان ہوجاتے۔ ان کے علاوہ کچھ اور منتشر و متفرق رقعات تلاش سے ایسے بھی ملتے ہین جو اپنی عالمانہ انشاپردازی اور عارفانہ نکتہ طرازی مین بے مثل ہین اور جنکا نقل کرنا ناچیز جامع اوراق نے ناگزیر سمجھا ہے۔

---

[۱۶] مآثر الکرام مطبوعہ مطبع مفید عام آگرہ ۱۳۲۸ھ (۱۹۱۰ء) صفحہ ۲۶

انشائے جلیل

میر عبدالجلیل کی جملہ تصانیف معلومہ مین غالباً یہی پہلی ہے اس لیے اس نقش اوّل کا ذکر بھی سب سے پہلے کیا جاتا ہے۔

نام کی وضع و اسلوب کا اقتضا تو یہ تھا کہ یہ انشا میر کے رقعات و خطوط کی متضمن ہوتی لیکن اسکے علی الرغم مصنف فاضل نے اسمین شہنشاہ اورنگ زیب کی بعض لڑائیون اور فتوحات دکن کو تحریر کیا ہے عبارت کا طرز وقائع نعمت خان عالی سے ملتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وقائع کی طرح اسمین تلازمہ کی صنعت ملحوظ نہین رکھی گئی ہے۔ وہ کمی کثرت آیات قرآنی، احادیث نبوی اور اقوال عرب سے پوری کی گئی ہے۔ اپنے اور دوسرون کے طبع زاد اشعار بھی حسب ضرورت درج کیے ہین۔

واقعات تمام تر وہی ہین جو اس ناچیز تذکرہ مین محل مناسب پر مذکور ہو چکے ہین۔ میر محمد رضا کی رفاقت مین سنہ ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) مین میر عبدالجلیل وطن سے نکل کر بمقام "برہمپوری اسلام پور" پہونچے میرزا محمد علی کی وساطت سے نواب تخلص یا اک مخلص خان کی ملازمت، بعد ازان بادشاہ دین پناہ کی حضوری کی عزت حاصل کی میر نے اپنے مربیون اور محسنون کے سلسلہ مین ملتفت خان خواص، جملۃ الملک اسد خان، بخشی الملک بہرہ مند خان، روح اللہ خان میر ساماں، تربیت خان میر آتش، ضد اللہ خان افسر جواہرات، مرزا یار علی بیگ داروغہ ڈاک، شیخ نور الحق محتسب وغیرہم کے نام لیے ہین اور ان کا اور انکی عنایات و توجہات کا ذکر اپنے اپنے مقام پر کیا ہے۔ مضامین مین سے چند کے عنوان یہ ہین۔

عرض مطالب سلطنت۔ ہنگامہ مزاحمت جوبداران و احوال خود و دیگر مردم (مین زیادہ شکایت مسلمان جوبدارون کی ہے جنکا شمار کعبہ کی راہ بند کر دینے والے فرنگیون سے کسی طرح کم نہ تھا) میر کی عمر اب تک چند کلیس فراغت مین گذری تھی، ان کے لئے سفر دور و دراز نیاز کیشی و زحمت کوشی کا یہ دوسرا موقع تھا یہی پریشانی و سرگردانی سنہ ۱۱۱۰ھ مین ان کو ناکام و نامراد واپس لائی تھی

تا نہ پرورد تنعم نہ بردراہ بدوست + عاشقی شیوۂ رندان بلاکش باشد" لطیفہ استادہ شدن
وتقدیم و تاخیر" میں اپنی سرگذشت لکھتے ہیں صف دوم میں ان کو جگہ دینا قرار پایا تھا مگر اس ہنگامہ
رستخیز میں ، با سوء اتفاق سے درجہ چہارم میں کھڑے کیے گئے۔ اس کے بعد "کوچ از بنگاہ" اور "فتح
بسنت گڈھ" کا بیان ہے۔ میر صاحب نے فتح کی پانچ تاریخیں کہی تھیں جنہیں سے نکالا۔ اس انشا
میں درج کی ہیں۔ اور جامع احوال نے ان کو اس تذکرہ میں تحت عنوان مناسب نقل کر دیا ہے۔
۱۶ ر جمادی الآخر کو حضرت کی سواری "سیر بسنت گڈھ" کے لیے جاتی ہے۔ نواب صاحب میر عبد الجلیل
کے بارہ میں گذارش کرتے ہیں۔ میر "نیاز عقیدت" یعنی اپنی تاریخیں پیش کرتے ہیں۔ پڑھنے کیلئے
ارشاد ہوتا ہے۔ صلہ ایک لطیفہ بن کر سامنے آتا ہے۔ بخشی الملک مخلص خان "جاہ بیتی" عرض
کرتے ہیں۔ قدر شناس بادشاہ "منصب صدی" مرحمت فرماتا ہے۔

مزید واقعات ان عنوانات سے واضح ہوں گے۔

محاصرۂ قلعہ ستارہ، سوختن باری قلعہ نانگیر بشاہی مورچال، غنیم کا مقابلہ۔ لڑائی کی تفصیل
۲۰ ذیقعدہ کی شام کا معرکہ۔ تسخیر، یورش قلعہ۔ فتح قلعہ پرلی۔

استعدادِ مہمات سے اسی دوران میں برسات کا موسم آجاتا ہے جو فوج کشی، زور آزمائی اور
صف آرائی کے منافی و مناقض ہے۔ افواج کی مراجعت کا فرمان صادر ہونے سے ہنگامہ بار برداری
بلند ہو جاتا ہے۔ دریائی کشنا کا عبور اور تعدی جماعہ اوزبکیہ کی روداد بھوشان گڈھ پہنچ کر بند
ہو جاتی ہے مگر خود اس قلعہ (بھوشان گڈھ) کی تفصیل، اس کے استحکام و استواری کی تشریح
کچھ دور تک ختم نہیں ہوتی۔

با ایں ہمہ تفصیلات و تعدد مضامین و عنوانات کتاب محض مختصر ہے۔ ضخامت ۱۳۵ صفحات سے
متجاوز نہیں۔ مولوی مسیح الزمان لکھنوی نے اپنے مطبع مسیحائی (لکھنؤ) میں ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ء) میں
طبع کرائی تھی۔ حاشیہ پر انشا کی شرح موسوم "کلمات الجلیل" مطبوع ہے جو مولوی سید امیر حیدر
بلگرامی متخلص بہ امیر (میر غلام علی آزاد کے پوتے، میر عبد الجلیل کے سرنانی) نے ۱۱۸۶ھ (۱۷۷۲ء)

مین قالبند کی تھی۔ مطبع کے خطّاط، لالہ رنگین لال شاداب نے کتاب نہایت پاکیزہ، واضح، خوشخط اور حتی الوسع صحیح لکھی ہے تحشیہ حافظ سید محمد عبداللہ کے قلم سے ہوا۔ اشیاء عتیقہ اور کمیاب کتابون کے دلدادہ، مولوی سید مسعود حسن رضوی ادیب، پروفیسر لکھنؤ یونیورسٹی کے نفیس ذخیرہ مین اس کا ایک سال خوردہ نسخہ کمال احتیاط و عرق ریزی کے ساتھ تجلید کیا ہوا موجود ہے۔

آخر کتاب مین میر غلام علی آزاد کے چار قصیدے شامل کر دیے گئے ہین۔ چارون مطلعے ملا کر ایک سو ایک شعر ہین جن سے تاریخ وفات ۱۳۰۰ھ نکلتی ہے۔ میر سید محمد کو بھی اسمین یاد کیا اور اُن کا نام نامی لیا ہے۔ تاریخ کی پابندی اور اہتمام کے باعث سے آزاد کے اکثر شعر بے لطف بلکہ بعض مطالب و معانی کی رفاقت و رقابت سے بے نیاز و آزاد نظر آتے ہین، یا ایسے پیچیدہ، دقیق اور عسیر الفہم ہو گئے ہین جن پر المعنی فی بطن الشاعر کا اطلاق ہو سکتا ہے۔

منشآت جلیل

انشائے جلیل کو چھوڑ کر، نثر کی دوسری یادگار یہی ہے۔ وہ توقعات جو انشائے جلیل کے نام سے پیدا ہوئی تھین کچھ نہ کچھ اس مجموعہ سے پوری ہو جاتی ہین گویا کہ اُس ملبد اکی یہ خبر ہے۔ میرے نزدیک یہ مکاتیب انشائے جلیل سے زیادہ کارآمد اور قابل قدر اس اعتبار سے ہین کہ ذی فہم پڑھنے والے کو یہ ایک وقت ادب و انشا کا بھی سبق دیتے ہین اپنے واندر کا بھی علم و عمل کا بھی اسی کے ساتھ ان سے اُس گئے گذرے زمانہ کی بہت سی غیر معروف باتون اور معاملون کا پتہ چلتا ہے ان سے نہ صرف ایک متنفس کاتب خطوط کی زندگی کے ہر پہلو اسکی عزیمت و استقلال جرأت و استقامت کا اظہار ہوتا ہے۔ بلکہ یہ سبق بھی ملتا ہے کہ دنیا مین افراد انسانی کو کیونکر رہنا اور بسر کرنا چاہیے جس کا ماحصل حافظ کی زبان مین یہ ہے ؎

آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف ست
با دوستان تلطف با دشمنان مدارا

مین تو اس نایاب مجموعہ کو بارھوین صدی ہجری کے ممتاز علمی و ادبی کارنامون مین شمار کرتا ہون
میر غلام علی آزاد نے مآثر الکرام مین بذیل ترجمہ میر عبدالجلیل لکھا تھا کہ "میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ خلف الصدق ایشان پارۂ از منشآت والا جمع کردہ اند"، افسوس ہے کہ وہ سب خطوط جنکی ترتیب تہذیب میر سید محمد کے ہاتھون ہوئی تھی، دستیاب نہین ہوتے۔ زیر نظر مجموعہ صرف بائیس خطوط مختصر و مطول کا ہے جو میر عبدالجلیل نے اپنی بیکاری و امیدواری کے ایام مین اپنے فرزند دلبند میر سید محمد کو سفر سے بھیجے تھے جن کا حوالہ اس تذکرہ مین پیشتر بھی دےچکا ہون۔

محب فرزانہ مولوی حافظ محمد عثمان صدیقی (استاد معاون، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج الہ آباد) کے کتب خانہ مین ایک نادر الوجود چیز اورنٹیل مسلینی نام The Oriental Miscellany, I یعنی نخبۃ الشرق حصہ اول ہے جس کا آج کوئی دوسرا نسخہ ہندوستان کی مشہور لائبریریون مین پایا نہین جاتا جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مین بعض کتب و مکتوبات شرقیہ سے التقاط و اقتباس کیا گیا ہے اور اصل فارسی عبارت کے ساتھ ترجمہ انگریزی کو بھی صفحات مقابل پر جگہ دی ہے۔ یہ کتاب دار الامارۃ کلکتہ مین ۱۷۹۸ع مین طبع اور غالباً زیر اہتمام افسران سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی شائع ہوئی تھی پیش نظر جلد ۱۸۰۱ع مین فورٹ ولیم کالج کے طلبہ کے مصرف کیواسطے حوالہ کی گئی تھی۔ اس مین بعض منتخبات تاریخی و علمی و ادبی و سیاسی کے سوا شہنشاہ اکبر اور سلطان اورنگ زیب عالمگیر کے چند کمیاب فرامین بھی ہین نیز ایک مکمل و مبسوط تحریر کا انگریزی ترجمہ ہے جو سید امیر حیدر بلگرامی نے جب وہ صدر نظامت عدالت کے مفتی کے منصب پر مامور تھے دربارہ حقوق مالی سرکار و محاصل کاشت اراضی وغیرہ بحوالہ کتب فقہیہ و احکام شریعت اسلام علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام فارسی مین قلمبند فرمائی تھی میرے نزدیک جس حصہ پر فی الواقع جامع کتاب کو نازش و مباہات ہونا چاہیے وہ (میر عبدالجلیل کے) یہی منشآت اصلی ہین جو مع ترجمہ ۴۲ صفحات پر چھپے ہین اور مختلف مضامین و مباحث پر مشتمل ہین۔ ان خطوط سے ان ایام کی اکثر تاریخی و ملکی اقعات کے علاوہ میر کے خاندان کی اندرونی حالت، سادہ و بے تکلف طرز معاشرت، اور قصباتی شرفاء

کے ماند و بود کی کیفیت اور سچے اخلاص و مودت کا اظہار ہوتا ہے بطور دیباچہ یا تعارف انگریزی میں تین صفحہ پر میر کے مختصر حالات بھی درج کر دیئے ہیں۔ اُن کی بے نیازی اور شان استغنا کی بالخصوص تحسین و مدحت کی ہے۔ جامع متفرقات لکھتا ہے کہ "میر عبدالجلیل نے یہ خطوط میر سید محمد کو لکھے تھے میر سید محمد نے ان کو سلسلہ تاریخ سے یکجا کر لیا تھا پھر اپنے بھانجے[۱۹] کے حوالہ کیا تاکہ اس کے منشیانہ انداز پر نظر ڈال لیں اصل فارسی کا طرز تحریر سلیس و صحیح ہے۔ انداز کلام نہایت شاندار اور پُر اثر واقع ہوا ہے۔ دربار دہلی کے بعض واقعات و حالات جو اثنائے مکاتبت میں سپرد قلم ہو گئے ہیں بغایت دلچسپ ہیں۔ نظر بر جمیع حالات یہ مجموعہ فارسی زبان کے نوجوان شائقین کو بیحد مفید و کارآمد ثابت ہوگا اور انگریزی خوانوں کو بھی پوری دلچسپی و تفنن کا ذخیرہ اس میں فراہم ملے گا۔"

قرینہ غالب ہے کہ اس کتاب (اورینٹل سلیبی) کی تجویز و ترتیب میں مفتی میر امیر حیدر کی شرکت و اعانت ضرور رہی ہوگی اور یہ خطوط انھیں کے ذریعہ سے انگریز مؤلفین کو دستیاب ہوئے ہوں گے۔ مگر ان خطوط کی ترتیب ٹھیک نہیں پائی جاتی نہ ان کے آخر میں تاریخ تحریر درج ہے اس لئے ان کے سلسلہ و ترتیب کے متعلق یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ میر سید محمد، میر غلام علی یا میر امیر حیدر نے اس مجموعہ خطوط کا نام کیا رکھا تھا۔ انگریزی مؤلف نے "مختلف معاملات پر باپ کے اصلی خطوط بیٹے کے نام" سے ان کا تعارف کرایا ہے۔ منشآت جلیل، کا عنوان جامع تذکرہ (فقیر مقبول) کا مجوزہ ہے سہولت و دلچسپی کے لئے بعض خطوط یا اُن کے مضامین کا اقتباس پیش کیا جائے گا۔ کچھ شک نہیں کہ بہت سی باتیں چھوٹی چھوٹی اور معمولی ہیں مگر انھیں کے پڑھنے اور جاننے سے روشن ہوتا ہے کہ دُنیا کی رفتار اور ہمارے ملک کے متوسط طبقہ کے زندگی بسر کرنے کا رنگ ڈھنگ ڈھائی سو برس پہلے بھی کم و بیش ایسا ہی تھا جیسا کہ آج ہے۔

---

۱۹ غالباً میر غلام علی آزاد سے مُراد ہے

اگرچہ خطوط تمامتر خانہ داری کے ترددات، اور دنیوی معاملات کی خبرگیری و خبرداری کے حامل ہین اور ظاہر ہے کہ انھین ضرورتون سے معرض ترقیم ہین آئے ہونگے تاہم کوئی رقعہ اخلاقی تربیت، دینی تعلیم، علمی نصائح اور آداب و تہذیب آموز ہدایات سے خالی نہین پایا جاتا فرزند سعادت منش کی کوئی ضرورت یا فرمایش پوری کرتے ہین تو اسی کے ساتھ پند و موعظت بھی کرتے جاتے ہین اور ہر حال مین تحصیل علوم پر کمال سعی مبذول رکھنے کی تاکید کرتے ہین ایک طرف میر سید محمد کے لئے سرمہ چشم تلاش کرکے یا امین الدین خان صاحب فوجدار سرکار بھکر سے لے کر بھیجتے ہین تو دوسری طرف کتابون کو دھوپ دینے اور بیش قیمت و کمیاب نسخون پر لحاظ خاص اور توجہ کامل رکھنے کے لیئے قدغن فرماتے ہین۔ حفاظت و نگہداشت کے لئے محض تاکید ہی نہین ہوتی بلکہ اس کی تفصیل و تشریح کا کوئی جزئیہ ترک نہین ہونے پاتا۔ جیسا کہ روضۃ الناظر اور رسالہ کلمۂ طیبہ کے بارہ مین نقل ہو چکا ہے۔

تشویق تحصیل علم باوجودیکہ میر سید محمد پختہ عمر پر پہونچ چکے ہین خود بھی ذی فہم و ذی علم ہین لیکن پدر شفیق کا بزرگانہ ارشاد یہی ہے۔

درشغل تحصیل علم سعی بر کمال نمائید و محط نظر علم تفسیر و حدیث و فقہ و اصول باشد و اضراب از علوم دیگر بالکلیّہ نباید نمود۔ اقل مرتبہ این است کہ مصطلحات ضروری علوم دیگر البتہ آشنائی تمام حاصل باید۔ اگرچہ خمیر مایہ تحصیل علوم دینی قرار باید داد اما از نمک گیری منطق و حکمت بقدر کفایت و دیگر علوم متعارف روزگار غافل نباید بود باجملہ مضمون این شعر رنگین را مد نظر باید داشت

احرص علی کل علم تبلغ الاملا ولا توانس بعلم واحد کسلا

یعنی حریص باش بر ہر نوع علم تا برسی امید خود را و اُلفت مگیر بر علم واحد از روے کاہلی

النحل لما رعت من کل فاکھۃ ابدت لنا الجوھرین الشمع والعسلا

مگس شہد ہرگاہ می چرد از ہر میوہ، ظاہر می گرداند برای ما دو قسم جوہر را یکے موم و دیگر شہد

الشمع باللیل نور یستضاء بہ والشہد یبری باذن الباری العللا

جوہر موم در شب نورے است کہ طالب روشنی کردہ می شود از ان نور، و جوہر شہد صحت می بخشد بحکم خدائے آفریدگار بیمار بیمار را۔

ترہیب و ترغیب: ایک دوسرے والا نامہ میں نصیحت فرماتے ہیں۔

در باب خواندن خود کہ رسالۂ اعلام الہدی میخوانند نوشتہ بودند معلوم شد۔ برخوردار را خواندن رسالہائے غیر متعارف فائدہ ندارد۔ باید کہ کتب درسی متعارف را تحصیل نماید کہ ہمین کتب درسی خواندہ شد رسالہائے غیر متعارف خود بخود آسان می شوند مثلاً شرح عقائد را اگر خواندند دیگر رسا اکر اعلام الہدی حل می شود سعی نماید کہ تحصیل علم بترتیب شود کہ این معنی ضروری ست و ہمین ایام تحصیل کمالات است باز این وقت بدست نخواہد آمد۔

ایک تیسرے موقع پر ایک سچی اور سادہ زبان ترجمانی دل یوں کر رہی ہے" عربی پڑھنے میں جو اپنی تقصید کا حال لکھا تھا موجب انشراح خاطر ہوا حق تعالی میری زندگی میں تمکو کمال انسانی پر پہونچا دیوے تاکہ ہماری آنکھوں کو روشنی حاصل ہو"

صلاح نیک: میر سید محمد کو عینک کی ضرورت ہے یا محض شوقیہ فرمائش میر عبدالجلیل حکم میں تلاش کرتے ہیں نہیں ملتی ہے معذرت کرتے ہیں اور لکھتے ہیں" ابھی ہم تلاش باقی ہے جسوقت میسر ہوگی بھیجدوں گا مگر خیال رہے کہ جس وقت آنکھ خیرگی کرنے لگے تورات کو مطالعہ موقوف رکھے گا۔ آنکھ کی محافظت بھی ضرور ضرور چاہیئے۔"

خیر اندیشی و شفقت: میر عبدالجلیل از خود جتنے تحائف و ہدایا بھیجتے تھے اُن میں ضروریات نفاتی یا مصنوعات مقامی یا دیگر اشیائے کار آمد کے سوا کوئی نہ کوئی سلاح یا سپاہیانہ ہتھیار ضرور ہوتا تھا چنانچہ بھکر سے سرمہ اور ایک جلد شرح مُلا کے علاوہ ایک حلقہ کمان بھی فرید ملازم کے ہاتھ بھیجا گیا تھا۔ یہ چیز فوجدار صاحب نے میر سید محمد کے لئے خاص کر بہم پہونچائی تھی۔

مالی مشکلات و وصول نقد

بھکر سے اکثر ہنڈوی آٹھ نوسو روپیہ کی آیا کرتی تھی معمول یہ تھا کہ جب کوئی معقول رقم جمع ہو جاتی تھی تو شیخ محمد رضا نائب خدمات خرچ کے لئے میر صاحب کے پاس بھیجا کرتے تھے لیکن ہنڈوی کا بھنانا اور مہاجنوں سے روپیہ کا منگانا ایک کار اہم ہوتا تھا جس کے منگانے اور لانے کیلئے خاص آدمی بھیجنا پڑتا تھا اور جس میں بعض اوقات صرف بھی زائد ہو جاتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک ہنڈی آٹھ سو روپیہ کی آئی تھی جس میں سے ما حصہ صرف ہنڈیاوں کے بابت بھکر میں خرچ ہو گیا تھا باقی روپیہ شاہجہان آباد سے اکبرآباد میر صاحب کے پاس پہونچا اور ان کے کام آیا۔

ایک دشواری و طوالت اور بھی تھی کہ بھکر میں کوئی مہاجن ایسا نہ تھا کہ اکبرآباد یا قنوج کو براہ راست ہنڈوی لکھ دیتا بھکر سے ملتان، اور ملتان سے لاہور، اور لاہور سے اکبرآباد، اور وہاں سے قنوج چلتی، ہنڈوی لکھانا ہوتی تھی اور اس صورت سے چار جگہ ہنڈوی کو باحتیاط بقید جنس سکہ و سنہ لکھانا پڑتا تھا

سید محمد نوح جب تک سیوستان میں رہے خطوط اور ہنڈوی شاہجہان آباد بھیجتے تھے۔ یہاں بھی وہی مرحلہ پیش آتا تھا کہ ایک معتبر آدمی بھیجکر روپیہ وصول کیا جاتا اور پھر ہنڈوی قنوج بھیجی جاتی تھی میر عبدالجلیل کے بعض رقعات میں سید محمد نوح اور ان کے خطوط کا حوالہ ہے۔ ان کے خطوط اپنے مفصل ہوتے تھے کہ بلگرام کو ان کا بافصلہ بھیجدینا ضروری سمجھ لیا گیا تھا

ایک بار سید نوح نے سیوستان سے کچھ روپیہ بھیجا تھا۔ ہنڈوی شاہجہان آباد کے مہاجن کے نام تھی وہاں تک قاصد کے بھیجنے اور روپیہ منگانے میں دیر ہوتی تھی۔ ضرورت شدید تھی۔ آخر میر عبدالجلیل نے وہیں اکبرآباد میں کسی مہاجن کے ہاتھ کچھ نقصان اٹھا کر فروخت کردی۔ ایک ہزار ایکسو تیس روپیہ وصول ہوئے۔ آٹھ سو ستائیس روپیہ کی ہنڈوی قنوج کو میر سید محمد کے نام روانہ کی گئی۔ بسلغ فرخ سیری سکہ اٹاوہ لکھائے گئے تین سو چھ روپیہ اکبرآباد میں تقاضا دار لوگوں کو ادا کیا گیا۔ اس قرض و تقاضا کی وجہ میر عبدالجلیل یہ لکھتے ہیں۔ کہ نواب اخلاص خان کی سرکار سے جو دو روپیہ روز ملتا ہے اس میں

کیسے پورا پڑ سکتا ہے ایک روپیہ روز اوپر خرچ ہو جاتا ہے۔ نوکروں کی تنخواہ (طلب نفران) خرچ دربار اور دیگر ابواب اِسکے علاوہ ہیں۔ آٹھ سو ستائیس [۸۲۷] روپیہ جو گھر بھیجے ہیں۔ اُس کے خرچ کی تفصیل و مدات بتاتے ہیں کہ پانچ روپیہ میر صاحب و قبلہ شاہ لطف اللہ کو، اور تین سو ساٹھ [۳۶۰] روپیہ برخوردار سید محمد نوح کے گھر میں (میر عبدالجلیل کی منجھلی بیٹی کو) اور بیس [۲۰] روپیہ اپنی بڑی بہن اور بیس روپیہ چھوٹی ہمشیرہ کو اور چار سو بائیس [۴۲۲] روپیہ اپنی والدہ کو گھر کے خرچ کے واسطے دیدینا۔ اس روپیہ میں جو ضروری اور ناگزیر اخراجات ہوں اُن کو مقدم رکھا جائے اور جو رقوم دس بیس روز کے توقف سے ادا ہو سکتی ہوں ان میں توقف کر دینا چاہئے۔ چند روز کی رخصت لے کر وطن آرہا ہوں اُس وقت جیسا مناسب ہوگا انجام دیا جائے گا۔"

نئی چیز:۔ سید کی تیلیوں کی چھتریاں ہماری یاد کی بات ہیں اور خال خال اب بھی نظر آجاتی ہیں۔ مگر دو ڈھائی سو برس پہلے کے عجائبات ہیں۔ یورپ کی عینک لکڑی کے فریم کی ہوتی تھی اور بڑی قدر و احتیاط کی چیز تھی۔ میر عبدالجلیل دہلی میں عینک کے محتاج ہیں۔ فرزند رشید کو پیشتر بھی لکھ چکے ہیں اور اب پھر لکھتے ہیں کہ "یوں تو دہلی میں عینکیں بہت ہیں بہت ملتی ہیں لیکن نگاہ کی موافقت معدوم۔ ایک نہایت عمدہ عینک بھکر میں دستیاب ہو گئی تھی اُس کو نوکروں نے گم کر دیا۔ ہر چند اسباب میں ڈھونڈھا نہیں ملتی ہے۔ "فرنگی عینک حلقہ چوبی" کی گھر پر چھوڑ آیا تھا اس نظر سے کہ بڑی نفیس شئے تھی اور اُس وقت میں چنداں محتاج بھی نہ تھا سمجھتا تھا کہ گھر پر با احتیاط رکھی رہے گی۔ ممکن ہے کہ تم نے کسی اور کو دیدی ہو۔ اگر اُس سے واپس لینا ممکن ہو تو مسترد کر لو وہ میری آنکھوں کے بہت موافق تھی۔ ادہم اسمار، تک نظر آتا تھا۔ میں یہاں سے دو عینکیں خرید کر کے تمھارے لئے بھیجتا ہوں یا بیت معلوم ہے صرف ناموافقت چشم کی وجہ سے اِس درجہ مبالغہ کر رہا ہوں۔ حسین خدمتگار سے پوچھے گا کہ آخر بھکر والی عینک کیا ہوگئی، قلمدان میں طاق پر رہا کرتی تھی۔ کس نے اٹھائی۔ کہاں رکھدی؟"

دُور کی خدمت قبول کرنے سے گریز تیرھویں عنایت نامہ میں تحریر فرماتے ہیں "جب نواب میر جملہ روانہ بنگالہ ہو گئے تو رفعت پناہ عوالی دستگاہ شیخ لالن نے جنکو حال میں محمدی خان کا خطاب ملا ہے منزل (کیمپ) فرید آباد سے خدمت سوانح نگاری سرکار امتیاز گڈھ عرف اودنی اور سرکار قمر نگر عرف

کرنول مضاف بیجاپور کی سند بندہ کے نام تیار کرکے بھیجدی اور معذرت فرمائی کہ "اگرہم شاہجہان آباد رہجاتے تو آپ کے لئے ضرور کوئی خدمت ہندوستان کی حاصل کرتے اب کہ نواب بنگالہ جا رہے ہیں ناچار یہی بھیجی جاتی ہے۔ ہر چند دور ہے مگر خدمت اچھی ہے۔ بندہ وہان کے جانے نہ جانے مین متردد تھا۔ مکنون خاطر یہ تھا کہ اگر سرکار نواب امیر الامراسے کوئی خدمت کم و بیش ہندوستان کی میسر آجاتی تو قناعت کرلیتا۔"

طریق سفر قنوج [۱۹] کے شارع اعظم پر واقع ہونے کی وجہ سے بلگرام سے آنے جانے والون کی پہلی منزل وہین ہوتی تھی میر عبد الجلیل اور ان کے سب اہل خاندان کا بھی معمول یہی تھا جب دہلی مین کچھ عرصہ رہکر اور کوشش کرکے سید محمد کو اپنی جگہ کرا دیا ہے تو ان کو دہلی بُلا رہے ہین بضرورت شدید

---

۱۹ ۔ قنوج کسی وقت شمالی ہند کا دار الملک، اور سب سے بڑا اور پرانا شہر تھا۔ اب ضلع فرخ آباد مین ایک چھوٹا شہر یا بڑا قصبہ رہ گیا ہے۔ پرگنہ و تحصیل دونا کا صدر مقام ہے۔ دریائے گنگ کے داہنے کنارے ایک پرانی بلند پہاڑی پر آباد تھا۔ مگر اب دریا چار میل پورب کو ہٹ گیا ہے شارع اعظم شاہی اور ریل اسٹیشن سے پختہ سڑک شہر تک گئی ہے۔ تقریباً ۲ میل کا فاصلہ ہے۔

گذشتہ صدی کے اندر اسکی آبادی مین تغیر نمایان ہوتا رہا ہے ۱۸۴۷ء مین ساڑھے سولہ ہزار نفوس کی تھی ۱۸۵۳ء مین بائیس ہزار پائی گئی ۱۹۰۱ء مین ۱۸۵۵۲ اور ۱۹۲۱ء مین ۱۸۲۵۸ تھی۔ باشندگان قریب دو ثلث کے ہندو اور ایک ثلث مسلمان ہین۔ رقبہ مسکونہ دوسو اٹھانوے ۲۹۸ ایکڑ پانچ مواضع، قنوج و کندرولی و تاج پور نو کاشت و علاء الدین پور و عمر پور کی اراضی مین پھیلا ہوا ہے۔ آبادی کی شکل مثلث نما واقع ہوئی ہے پرانے شہر کے کھنڈرون، ویرانون، منادر و محلات کے ٹیکرون پر کوسون تک ہر طرف جدہر نظر پڑتی ہے خشت پارے اور سنگ ریزے ہر جگہ سنگ راہ ہوتے ہین۔ پرانے ٹھیکرے پرانے سکّے، مورتون کے ٹوٹے ہوئے حصے اطراف کے کھیتون اور خالی زمینون مین دور تک ملتے ہین۔ کرنیل ٹاڈ Colonel Tod لکھتے ہین کہ کبھی اس شہر کا حصار تیس میل سے زاید تھا۔ مگر دیگر اہل فرنگ مورخین اس کو مبالغہ پر محمول کرکے باور نہین کرتے چینی سیاح ہیون تھسانگ کی مفصل تحریر اور زمانہ موجودہ کے کھنڈرون سے ثابت ہوتا ہے کہ پرانا قنوج گنگا کی پرانی پہاڑی پر تین میل سے زیادہ طول مین آباد رہا ہوگا۔ آبادی تمام تر نشیب و فراز اور پست و بلند واقع ہوئی ہے۔ بہت سے نالے کھائے زمین کو کاٹتے ہوئے دریا مین جا کر مل گئے ہین بہت سے مکانات جو اس وقت نیم ویران، غیر آباد و شکستہ حال نظر آرہے ہین کسی وقت نہایت شاندار مرتفع اور مستحکم عمارات رہی ہونگی۔

تعمیرات محمدیہ مین نالے پر ایک پل ہے جس کو سمبت ۱۶۵۸ (۱۶۰۱ء) مین چند اگروالہ دولتمندون نے

تاکید کرتے ہین اور لکھتے ہین کہ "پرانا گھوڑا اب سواری کے قابل نہین رہا ایک منزل بہل وطن سے قنوج تک کے لئے کرایہ کرلو اور محض ضروری (لابدی) اسباب لے کر چلے آو"۔ آگے چل کر تسلی دیتے ہین کہ "جب انشاء اللہ منصب و خدمت تمھارے نام ہوجائیگی تو یہانجان بھکر سے تمھاری ضروریات سفر کا سرانجام کراکے پالکی کی سواری پر روانہ بھکر کرادینگے۔ وطن سے صرف ضروری سامان لے کر چلنا ہے چند کمتر و سکتر آسودگی میسر۔ انشاءاللہ جب اپنے تعلقہ خدمت مین یا ملتان تک پہونچ جاوگے تو جو کچھ چاہو سب میسر و مہیا ہوجائے گا۔ بالفعل یہان خود جریدہ پہونچ جاو"۔ پھر خیال آتا ہے کہ دہلی جلد تر پہونچنے کی ضرورت ہے تاکید بھی کررہا ہون بہل آہستہ آہستہ چلیگی۔ دیر مین پہونچین گے تو تاکید و ہدایت فرماتے ہین کہ "چار کہار جوان زود رو کرایہ کرکے چوپالہ مین تنہا ہمارے پاس چلے آو۔ دو دست رخت پوشاکی دربار سوائے پارچہ پوشاکی خانہ مطلوب ہین۔ اگر موجود ہون تو بہتر۔ ورنہ فرجام کے ہمراہ جو سامان

بنوایا تھا۔ ڈائمنڈ جوبلی ہائی اسکول۔ اس کا زراعتی فارم اور بورڈنگ ہوس کلب گھر شفاخانہ، اور کوتوالی مقبرہ عام عمارات ہین۔

قنوج جتنا قدیم اور عظیم شہر رہا ہے اُس کی مناسبت سے یہان کے آثار و صنادید نہ تو عتیق ہین نہ کثیر التعداد بے شبہ اسکی کہن سالی اور تاریخی عظمت کے اعتبار سے اس سے زیادہ کی توقع کی جاتی تھی۔ انگریزون کی رائے ہے کہ ہندوؤن کے زمانہ کی یادگارون اور مذہبی عمارات کو تو دسوین صدی مین محمود غزنوی کے غیظ و غضب اور بے پناہ تیغ و تبر نے غارت و تاراج کردیا تھا۔ اسلئے جو کچھ آثار قدیمہ باقی ہین وہ صرف مسلمانون کے عہد کی ہین۔ بلحاظ اہمیت یا وسعت جو قابل لحاظ ہین حسب ذیل ہین۔

(۱) نواب بہادر خان شاہجہانی امیر کی تعمیر کردہ سرائے کا مغربی پھاٹک اور چند کوٹھریان

(۲) رنگ محل یا موتیا محل جس کو سید محمد قنوجی استاد اورنگ زیب و بانی سرائے میران نے سنہ ۱۰۹۶ھ / ۱۶۸۵ء مین تعمیر کرایا تھا۔ عمارت تقریباً نابود ہوچکی۔ بنیادین اور کچھ کچھ دیوارین قائم ہین

(۳) مقبرہ سید محمد قنوجی مذکور۔

(۴) جامع مسجد جسکی نسبت ہندو سیتا کی رسوئی ہونے کا دعوی کرتے اور پانڈو نسل کے راجگان کی تعمیر بتاتے ہین۔ ایک بلند پہاڑی پر پرانے قلعہ کی ناف مین واقع ہے ملک الشرق ابراہیم شاہ والی جونپور نے

بھیجا گیا ہے اس میں سے جو پسند ہوئے کرجامہ اور دوتہی تیار کرا کے لیتے آؤ۔ اگر پہلے سے تیار ہوں تو نئے کپڑے بنوانے کی احتیاج نہیں ہے خواہ مخواہ دیر ہوگی جب تعلقہ خدمت پر پہونچ جاؤ گے تو وہاں بہت سے کپڑے اور دوتہی میسر آجائے گی" ہر چند یہ سب اسباب آسودگی بیشتر دراز دستی کا سبب راہ فراغت کامل نہ"

سوز و محبت اولاد و عیال کی الفت جو فطرت انسانی کا خاصہ ہے میر عبدالجلیل پر بھی بدرجۂ نہایت غالب تھی ہر چند کہ سادہ بیانی اور احتیاط سے کام لیتے تھے لیکن جذبات دل کی جھلک ہر ہر قدم پر نمودار ہو جاتی تھی۔ یہ وہ انداز تحریر نہیں ہے جو اکثر انشا پردازوں میں نظر آجاتا ہے بلکہ حقیقت حال کا اظہار کرتا ہے۔ میر عبدالجلیل نے ان تمام رقعات میں میر سید محمد کو ایک بیٹی کی

اس کی ترمیم و اصلاح ۸۰۹ھ (۱۴۰۶ء) میں کرائی تھی۔ جنرل کننگھم نے اس کو پہلے ۱۸۳۸ء میں اور بعد مرمت ۱۸۶۲ء میں دیکھا تھا۔ اپنے سیاحت نامہ میں دونوں حالتوں کا فرق دکھایا ہے۔

(۵) روضہ شیخ کبیر بالا پیر متوفی ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) سنگ در سے سال تعمیر ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ء) پایا جاتا ہے

(۶) روضہ شیخ محمد مہدی (فرزند شیخ کبیر) بعہد اورنگ زیب ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں تعمیر ہوا تھا۔ شیخ مہدی نے ۱۰۸۸ھ (۱۶۷۷ء) میں انتقال کیا۔

(۷) عالمگیری مسجد جو ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ء) میں شیخ مہدی نے رنگین پتھروں سے تعمیر کرائی تھی۔ مسجد مذکور کا بیرونی دروازہ ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء) میں تیار ہوا تھا۔

(۸) درگاہ شیخ ناگاہ ۱۰۷۹ھ (۱۶۶۸ء)

(۹) مسجد مخدوم جہانیاں جہاں گشت، بخاری، و مقبرہ سید جلال وغیرہ۔

(۱۰) روضہ اولاد مخدوم۔ صدر دروازہ کے کتبہ سے واضح ہے کہ اس کو سید راجو نے ۸۸۱ھ (۱۴۷۶ء) میں بعہد سلطان حسین شرقی تعمیر کرایا تھا۔ مع مقبرہ وغیرہ ان عمارات کو زلزلہ سے نقصان پہونچا تھا ۱۲۰۹ھ (۱۷۹۴ء) میں کامل درست ہوگئی۔

(۱۱) روضہ مخدوم آتی جنبید۔ واقع رہنگیرہ ۹۳۳ھ (۱۵۲۶ء) کی تعمیر ہے۔ اورنگ زیب نے درستی کرا دی تھی۔

(۱۲) روضہ چندن شہید واقع اسمٰعیل پور نور الدین جس کی تعمیر بابر بادشاہ نے کرائی تھی۔ مابین ۹۳۲ھ و ۹۳۷ھ (۱۵۲۶ء – ۱۵۳۰ء)

(۱۳) سید محمد قنوجی کی تعمیر کردہ پختہ سرائے جو محمد آباد کبیر معروف بہ سرائے میران میں بر لب شارع اعظم قنوج سے

مختصر طرز سے برابر مخاطب کیا ہے" برخوردار سعادت اطوار میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ "مگر تیسرے خط
میں قلم کی متانت و سنجیدگی پر دل کی بے چینی و بے قراری غالب آگئی ہے۔ میر صاحب ضبط نہیں کر سکے
ہیں۔ فرماتے ہیں:۔

"برخوردار سعادت اطوار کامگار میر سید محمد مشمول سلامت۔ بعد دعوات مزید حیات و ترقی درجات
مشوق ملاقات کہ بیرون از احاطۂ عبارت است مشہود خاطر عزیز آنکہ خطوط آن برخوردار مصحوب فرجام
و حسین متواتر رسیدند۔ از خبر خیریت آن برخوردار خاطر را مسرور گردانیدند۔ الحمد للہ علی ذالک شوق ملاقات

کوس کھر پور سے واقع ہے سنہ ۱۰۹۴ھ (سنہ ۱۶۸۳ع) میں تیار ہوئی تھی۔

(۱۴) سرائے مذکور کے قریب ایک باغ اور احاطہ کے اندر سید موصوف کے لڑکے کا عالی شان مقبرہ۔

(۱۵) میر بنگالی کی عظیم الشان حویلی جو ایک زمانے میں کمال رفعت و استحکام کے ساتھ بنائی گئی تھی اب صرف چار دیواری، بروج اور پھاٹک باقی ہے۔

عہد ہنود کے آثار میں "پرانا قلعہ" ہے جو عام طور راجہ جے چند راٹھور کا قلعہ کہلاتا ہے۔ ایک انجینیر اور سپاہی جنرل کننگھم کا قول ہے کہ "اسکا موقع نہایت محکم اور مضبوط ہے۔ توپ کی ایجاد اور استعمال سے پہلے اس نے قنوج کو ایک زبردست اور اہم مقام بنا رکھا ہوگا"۔ اب اس میں صرف ایک شمالی برج کے کچھ نشانات باقی رہ گئے ہیں۔ راجہ پال کا مندر قلعہ کے اندر سب سے پرانی یادگار ہے۔ اسکی جگہ خستہ و ویرانی پر مگر تعمیر جدید مختصر ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے محمد بن قاسم ثقفی نے سنہ ۹۲ھ (سنہ ۷۱۱ع) میں قنوج پر حملہ کیا اور بعہد خلیفہ ولید اسلامی جھنڈا نصب کیا تھا۔ مسلم مورخین و سیاحین میں سے ابن وہب ہے جسکا سفرنامہ اب نایاب ہے مگر ابو زید نمیری بصری تیسری صدی اسلامی کا مورخ اس کا حوالہ دیتا ہے۔ چوتھی صدی کے سیاح و تاجر و جغرافی ابن حوقل موصلی اسی عصر کے مورخ مسعودی بغدادی۔ آٹھویں صدی کے لغوی و محدث فیروز آبادی نے اپنی تالیفات میں قنوج کا ذکر کیا ہے۔ اسی صدی کا نامور سیاح ابن بطوطہ طنجی مغربی بھی یہاں آیا تھا اپنے رحلہ و سفرنامہ میں اسکی ویرانی و بربادی پر آنسو بہاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ نے قنوج کی سرسبزی، رعیت اور آبادی کے بابت سے حالات لکھے ہیں جن کے ماننے میں صاحبان نظر اور اہل تحقیق کو کلام ہے۔ آئین اکبری میں لکھا ہے "قنوج با حویلی قلعہ از خشت پختہ دارد، از امصار بزرگ ہندوستان"۔

ممالک غیر کے مورخین میں سے طالمی Ptolemy نے اس کو کنیا جیزا Canogiza کے نام سے یاد کیا ہے۔ چینی بودھ زائر فاہیان Fa Hian یہاں پانچویں صدی عیسوی کے آغاز میں آیا تھا

آن برخوردار در عرصۂ تحریر گنجایش نپذیرفتست شعر

كتبت وكدت من شوق وتوق اليك اكون سطرا في الكتاب

یعنی نوشتم من خط را و قریب بودم از شوق و آرزومندی که سوی تست انکه باشم من سطر

در خط خود. بیت

دل جدا دیده جدا سوی تو پرواز کند گرچه من در قفسم بال و پرم بسیار است

حق سبحانہ این آرزو را که منتهی الہم است بخیر و خوبی زود بسر آرد۔

تیسرے خط میں تعلق خاطر اور اشتیاق دیدار یوں ظاہر فرماتے ہیں :-

برخوردارا! در خط مرا ہی حسین خدمتگار از کسل جسمانی خود نوشته بودند که اکثر علیل می باشند
بنابر آن اراده سفر این طرف دارند۔ برخوردارا! خود می دانید که در بساط ما همین شاید کسے که یک
پسر داشته باشد باختیار خود جدائی پسر را قبول ندارد۔ تاہم آرزوے ما ہمین ست که شما را سیر ببینیم
اما اسباب مختلفہ و دواعی متفرقہ نمی گزارند که شما را بطلبم

ہیون تھسانگ Hewen Thsong ساتویں صدی عیسوی میں بعہد ہرش وردھن آیا تھا اُسوقت قنوج منتہائے عروج و ترقی پر تھا۔ اُس نے پوری تفصیل کے ساتھ یہاں کے حالات ماضیہ و عصریہ لکھے ہیں۔ انگریز مورخین سیاحین میں سے پادری ٹیناٹ Rev. Mr. Tennant اٹھارہویں صدی کے ختم کے قریب اور مسٹر ولیم ہنٹر William Hunter اُن کے بعد ہی آئے تھے۔ مشہور صناع دانیال Daniell نے قنوج کا نقشہ کندہ کر کے سنہ ...ع میں شائع کیا تھا۔ میجر تھارن Major Thorn نے ۱۸۰۵ع میں جنگ مرہٹہ کے زمانہ میں قنوج کو دیکھا تھا۔

عصر موجود میں قنوج فی الجملہ ترقی کر رہا ہے۔ تجارت عطر و عطر سازی اور روغن خوشبو تیار کی طرف چوبی صندوقچہ منقش و گلکاری و پارچہ دیسی چھپائی و پاپوش وغیرہ کی چھپائی کے لئے بہت شہرت رکھتا ہے۔ سواد و مضافات شہر میں دور دور تک بیلا چنبیلی اور گلاب کے باغات چلے گئے ہیں۔

انگریزی کا ہائی اسکول اور سنسکرت و عربی کے متعدد مدارس شائقین علم اور طلبہ کو فیض عام پہنچا رہے ہیں۔

میر عبدالجلیل کو اپنے نواسہ کے ساتھ بھی بڑی محبت و الفت تھی باوجود پریشانی خاطر اسکا جلوہ اکثر مواقع پر نظر آتا ہے۔ میر سید محمد کو لکھتے ہین۔

برائے علاج درد گوش برخوردار سید غلام علی قلمی بود۔ آنحق بسبب سواری دو وقتہ بسفر ہمراہی نواب امیر الامرا کہ نسبت دو دو روزہ بہ سر اوشان ماندیم وار شش منزل شاہجہان آباد رخصت فرمودند از خاطر رفتہ بود۔ بحال انشاء اللہ از حکیم جیو حقیقت ظاہر نمودہ نسخہ گرفتہ و تیار کردہ می فرستد۔

اعتراف منت حکیم جیو، حکیم صاحب مہربان حکیم محمد جعفر تھے جنکی سعی و توجہ سے ذی قعدہ سنہ جلوس ... ۱۱۳۰ھ میں شدید علالت اور تپ محرقہ سے میر عبدالجلیل کو نجات ملی تھی۔ میر صاحب دلی پہونچتے ہی سخت بیمار ہوگئے تھے۔ نو وارد تھے نہ کوئی یار تھا نہ مددگار۔ ناآشنا لوگون سے واسطہ تھا۔ کسی خطوط مین اس بیماری، اپنی تکلیف بخار کی شدت، تیمم سے نماز ادا کرنے، تیل کا استعمال چھوڑ دینے، سخت پرہیز کرنے اور بعد صحت ایک ضیافت و دعوت کی تقریب مین پرہیز توڑنے کی تفصیل لکھی ہے ہر موقع پر اس معالج مہربان کا بار بار شکر ادا کرتے اور اس ابرائے آزار کی ستایش و تحسین فرماتے ہین"

۱؎ ہندوستان بلکہ تمام ممالک عرب و عجم مین اس شریف پیشہ کی بڑی عزت و توقیر تھی۔ اسی وقت تک اطبا کا یہ فیض رسان و کریم النفس طبقہ طمع و آز سے پاک و بے نیاز تھا حکما کی مدد معاش اور بہ اطمینان گزران کے لیے سلطنت کی طرف سے بیر حاصل جاگیرین، اور معافیان عطا کی جاتی تھین۔ امرا اور اہل دول وظائف و سالیانے مقرر کردیتے تھے۔ اطبا خواہ کسی درجہ و شان کے ہون اس کار خیر کی انجام دہی کے لئے کوئی مزد یا اجرا لینا اپنے مرتبہ سے فروتر اور باعث ننگ و عار سمجھتے تھے۔ سلاطین عہد ان کو بڑے بڑے خطاب حکیم الملک، حاذق الملک، شفاء الملک وغیرہ دیتے تھے۔ ان کا رتبہ وزرائے سلطنت سے بالاتر مانا جاتا تھا۔ حکیم الملک، بہادر شاہ اور عظیم الشان کا طبیب خصوصی تھا اور شیخ محمد حسین شیرازی متخلص بہ شہرت، اعظم شاہ اور شاہ عالم بہادر شاہ کا شیخ میر تھے اسکو حکیم الممالک خطاب دیا تھا۔ میرزا محمد ہاشم شیرازی مخاطب بہ سید علوی خان معتمد الملوک، عالمگیر و محمد اعظم و شاہ عالم کا حکیم تھا۔ محمد شاہ نے اسکو ایک سونے مین تلوایا تھا شش ہزاری منصب رکھتا تھا تین ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ پاتا تھا۔ اسکے کمال اور حذاقت کی وجہ سے نادر شاہ تہران مین اسکو بڑی کوشش سے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔

حکیم جعفر خان بسا میر کے ہموطن تھے۔ تفسیر سے تعین کرتے ہین کہ آپ استاد حکیم صاحب تھے شاہجہان آباد

شکرِ صحت نویں والا نامہ میں دو کلمہ خیریت باخبر دہ صحت اپنے قلم سے (یا اس زمانہ کی محاورہ کے موافق "بخط خود") لکھ کر اہل خاندان کو بھیجتے ہیں تاکہ خاطر جمع ہو، ہر خط میں از سر نو زندگی پائے اور موہبت الٰہی کا دل و زبان سے شکر بجالانے کے لئے اپنے بزرگ متعلقین کو تاکید کرتے اور لکھتے ہیں کہ "ایک من آرد کی روٹی پکوا کر فقرائے بلگرام کو بانٹ دینا۔

فحمد الله ثم حمداً له علی ما حبانا من الاجلا"

خدا کا شکر ہے پھر خدا کا شکر ہے کہ ہم کو بیماری سے صحت بخشی۔

عنایت نامہ (ذیل) بیست و دوم اس سلک گوہرین کا واسطۃ العقد ہے یہ مجموعہ منشآت اس خط پر ختم ہو جاتا ہے میر عبدالجلیل ایک مدت مدید تک وطن سے دور اور اہل وطن سے مہجور رہ کر اب بلگرام پہنچنا چاہتے ہیں جہاں شاہی دربار کے مخصوصوں، امرائے دولت کی سازشوں اور نفاق اور پرشور پرخطر حوالی سے مامون و محفوظ رہنے کی توقع ہے خود تو گھر پہنچنے اور گھر والوں اور متوسلوں کو دیکھنے کی عجلت و بیقراری ہے مگر ان پر اصرار و تاکید ہے کہ اپنے جذبات و شوق کو روکیں، ان کے استقبال کے لئے دور تک نہ آئیں گھر کے قریب لے لیں۔

برخوردار کامگار میر سید محمد سلمہ اللہ تعالیٰ۔ بعد دعوات مزید حیات مشہود آنکہ روز پنجشنبہ دوم جمادی الآخر ۱۲۳۱ھ از جناب عالی متعالی مرخص شدہ روانہ وطن گردیدہ چہارشنبہ ہشتم ماہ مزبور بخیر و عافیت بقنوج رسیدیم شنبہ ۲۴ جمادی الاولی قاصد آمدہ و ارباد و پروانہ جاگیر خود و شما روانہ وطن کردہ از آمدن خود اطلاع دادہ بودم دالفیار و عدہ کہ پیش از رسیدن خود بوطن پنج شش روز خبر خواہم داد بجا آوردم صاحبی میر کرم اللہ و میر اشرف بسواری دو بہل کرایہ تا قنوج رسیدند۔ آدم پیش آن برخوردار فرستادہ شد امروز کہ پنجشنبہ است انشاءاللہ بوطن می آرم دو سواری اسپ از برادران بعبارت بسنت آوردہ برائے ہر دو کس تا آب گنگ بفرستند

آگے لکھوں گے کہ ان سے ادا اور تعبیر از اللہ مرض کرنا چاہیئے"

کہ از آرزوے آب پر پیان سوار شدہ بوطن برسند بشتر برخوردار سیر محمد اعظم برائے باربرداری بار کہ بہل بود باشلیتہ ورسن تیز لفرستند یک پہر روز برآمدہ بندہ از قنوج روانہ بلگرام خواہد شد شاید تا ظہر آن ۔ دسے آب بہم الٰہی برخوردار و ہر کس کہ ہمراہی شما کند ہرگز ارادہ آمدن تا لب آب گنگ نخواہید کرد کہ ہوا بسیار گرم است من خود آنجا میرسم آخر روز اگر تر بجد در آمدن باشید تا گرانی بیایند والا ہیچ در کار نیست بندہ اگر ہرگز راضی نیستم ہمان جا ملاقات خواہد کرد کہ خوش وقتی ما درین است زیادہ بجز شوق چہ نویسد و السّلام

شاعری

سید عبد الجلیل کو شاعری میں چندان شغف نہ تھا نہ اس میں کوئی دلچسپی و شیفتگی تھی ۔ آپ کا شعر کہنا محض "تقریبی" ہوتا تھا ۔ مدتیں گزر جاتیں اور ایک مصرع موزون کرنے کی نوبت بھی نہیں پہونچتی تھی لیکن جب کوئی تقریب پیش آجاتی تو اندک توجہ سے معانی و مضامین سحر و جادو نظر آتے تھے ۔ آپ کی طبیعت قدرۃً معنی آفرین واقع ہوئی تھی ۔ شعر گوئی محض تفنن خاطر کے لئے ہوتی تھی یا اس خیال سے کہ کوئی صنف کمال ان سے باقی نہ رہ جائے ۔ وہ شاعری کو اپنے مرتبہ سے پست و حقیر سمجھتے تھے جیسا کہ اپنے "قصیدہ نسبی" میں فرماتے ہیں ؎

مقصود من تفنن طبع است از سخن ورنہ سزائے رتبۂ من نیست شاعری

اصل یہ ہے کہ یہ قصیدہ ان کے تمام قصائد میں ممتاز اور خوبیوں سے مالامال ہے اس میں متانت و استواری و پختگی کلام کے ساتھ خیال آفرینی ، نزاکت ادا اور حسن ترکیب نمایاں ہے بندشیں دلآویز ہیں ۔ باقی قصائد میں کوئی مابہ الامتیاز شے نظر نہیں آتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان میں آورد کا حصہ آمد سے غالب رہتا تھا ۔ جو کثیر المشاغل اور مختلف المقاصد شخص دور از کار باتوں سے زبان کو آلودہ نہ کرتا ہو وہ تزئینات شاعرانہ پر کب توجہ کرے گا لیکن خواہش منداور با

احتیاج مانتے نہ تھے مجبورانہ اُن کی تشنگی و ضرورت رفع کردیجاتی تھی چنانچہ قصیدہ فتح اگرہ مین لکھتے ہین ؎

شعر گر بفضل من نہ پوشیدے ۔۔۔ می شدم در فن سخن اقدم
گر بہ پرسی زجامشیت من ۔۔۔ میر خسرو دہد جواب نعم

میر صاحب نے ضرورتاً قصائد زیادہ کہے ہین ۔ اُن کے کلام مین کہین کہین ابوطالب کلیم ملک الشعرائے شاہجہانی اور حاجی محمد جان قدسی کے رنگ کی جھلک پائی جاتی ہو معاصر نہ سہی یہ دونون قریب العہد ضرور تھے ۔ اگر ان کے کلام و کمال کا گہرا رنگ میر عبد الجلیل پر چڑھ گیا ہو تو تعجب کی بات نہین ۔ البتہ تشبیہات کی ندرت اور استعارات کی شوخی یہان کمیاب ہے مگر مشقی اور کم توجہی ان تقصیرات کی ذمہ دار ہے ۔ ورنہ جودت طبع ذہانت اور وسعت نظر و معلومات مین میر صاحب کس سے کم تھے ؟

میر عبد الجلیل ہفوات شاعرانہ سے نہایت احتراز کرتے اور اپنے فرزندان و تلامذہ پر اس قسم کے لوث و آلودگی سے محفوظ رہنے کے لئے سخت تاکید رکھتے تھے بالخصوص انبیا علیہم السلام کی شان مین حضرت یوسف پر معشوق مجازی کو ترجیح دینے اور صبر ایوب پر عاشق کے طعن کرنے پر نہایت سرزنش کرتے (علیہما السلام) اگر کسی جگہ اس قسم کے ترہات و اباطیل نظر سے گذر تو سورہ شعرا کی آیہ خاتمہ زبان پر آجاتی تھی یعنی وَسَيَعْلَمُ الَّذِينَ ظَلَمُوا أَيَّ مُنْقَلَبٍ يَنْقَلِبُونَ (اور جنھون نے لوگون پر ظلم کئے ہین اُن کو عنقریب معلوم ہوجائے گا کہ کیسی جگہ اُن کو لوٹ کر جانا ہے ۔ جزو ۱۹ ۔ سورۃ الشعراء ع ۱۱-۱۵)

میر صاحب کا کلام عربی و فارسی و ترکی و ہندی چار زبانون مین پایا جاتا ہے اور انصاف یہ ہے کہ باوجود عدم اعتنا و فقدان توجہ کے انھون نے اپنا کمال کمال دکھادیا ہے ۔ بیشک وہ غزل کم کہتے تھے لیکن باقی تمام اقسام سخن مین بے مثل جواہر بکھیرے ہین اور ثابت کیا ہو کہ شخص واحد کو تمام انواع شاعری پر اس درجہ دسترس و عبور بہم پہونچنا دشوار ہے وہ بھی نہ آکر

بلکہ زاہد خشک، لیکن آغاز شباب میں رنگین مزاجی وظرافت میں بھی کامل تھے۔ ع

ہم آج پیر ہوئے کیا کبھی شباب نہ تھا؟

تخلّص میر عبد الجلیل ابتدا میں "طرازی" تخلّص کرتے تھے پھر اس مناسبت سے کہ سیّد واسطی الاصل تھے "واسطی" قرار دیا لیکن زیادہ تر دیکھا یہی گیا ہے کہ وہ اپنا پورا نام "عبد الجلیل" اور کبھی کبھی "میر جلیل" داخل کلام کرتے تھے۔ وہ دونوں تخلص ان کی جوانی اور ان کی شاعری کی جوانی کے یادگار تھے اور نام کا لینا یا نظم کر دینا انحطاط عمر یا زمانہ پختگی کلام و کمال میں اختیار کیا تھا۔ صاحب حیات الشعرا نے ان کا نام میر جلیل لکھا اور ان کو حرف میم میں ذکر کیا ہے۔ خود میر نے ایک موقع پر فرمایا ہے ؎

خدنگِ غمزۂ شوخِ مغِ صنوبر قد　　زکند شست خستہ جانِ میر جلیل

عَرُوض

میر عبد الجلیل کی مہارت فن عَروض عربی و فارسی میں بدرجہ نہایت تھی۔ شیخ سعدی کا شعر ہے

وَاِنَّ سَلِیْمَ الْاِنْسَانِ مِنْ سُوْءِ نَفْسِہٖ　　فَمِنْ سُوْءِ ظَنِّ الْمَرْءِ لَئِنْ یَسْلَمُ

میر نور اللہ احراری نے اس قول کی شرح میں لکھا ہے کہ لَئِنْ یَسْلَمْ سے لَا یَسْلَمْ زیادہ فصیح معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ بحالت لَئِنْ ہونے کے مصرع گر جاتا ہے۔

میر عبد الجلیل نے اس قول پر معارضہ کیا اور یہ حاشیہ لکھا ہے۔

"مخفی نماند کہ این بیت بر وزن دوم از اوزان ثلثہ بحر طویل است کہ عروض و ضرب آن مقبوض می آید و تقطیع مصراع ثانی کہ ناظر گفتگو ست اگر موزون بوزن فعولن مفاعیلن فعولن مفاعلن باشد چنین است فمن سو فعولن ء ظن نلمر مفاعیلن ء لئن فعولن یسلمو مفاعلن۔ و چون از تقطیع مذکور معلوم گردید ظاہر شد کہ واجب و متعین است کہ نسخہ لئن یسلم باشد نہ لا یسلم چنانچہ میر گمان برده چہ حرف لام و یا از حرف لیس در تقطیع با الفاظ و حتی اگر کشیدہ

فعولن خواہد شد وتسلیم بر وزن فاعلن خواہد ماند و فاعلن در ضرب بحر طویل نمی آید چنانچہ بر متتبع عروض پیدا است چہ ضرب بحر طویل تام می باشد یا مقبوض یا محذوف۔ و فاعلن ازین ہر سہ قسم خارج ست پس آنچہ میر نوشتہ کہ از نسخہ لیس صرع زیادہ می شود موافق میزان طبع میر است نہ موافق میزان عروض طرفہ آنکہ مصراع در صورتیکہ لاتسلیم باشد کم می شود۔

وجہ مناسب این مقام است بیتے کہ خلیل بن احمد واضع فن عروض در مثال وزن دوم بحر طویل آوردہ ؎

سَتُبْدِي لَكَ الْأَيَّامُ مَا كُنْتَ جَاهِلًا [521] وَيَأْتِيكَ بِالْأَخْبَارِ مَنْ لَمْ تُزَوِّدِ

و عبارت میر کہ لاتسلیم فصیح تر از لیس یسلم می نماید چہ در نسخہ لیس مصراع زیادہ میشود انتہی محل تأمل ست۔ زیرا کہ منطوق عبارت دلالت دارد برین کہ زیادت مصراع منافی فصاحت ست و وزن عروضی را وجود او عدم او در فصاحت و عدم آن دخلی نیست در حالیکہ آنکہ ہیچ یکے از علمای معانی این معنی را در فصاحت کلمہ و کلام و عدم آن اعتبار نہ کردہ۔ بہ فرض تنزل مقتضای عبارت میر آنست کہ بر تقدیر زیادت فصاحت مرتفع می گردد در حالیکہ آنکہ لفظ فصیح تر کہ برای تفضیل است دال ست برین کہ نسخہ لیس یسلم ہم فصیح است پس فصاحت این نسخہ با زیادت وزن باعتقاد میر چہ قسم جمع می توانند شد اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ هَفَوَاتِي وَاعْفُ عَنْ زَلَّاتِي "

حسن طلب

میر عبدالجلیل کو ایکبار زمخشری[522] کی کتاب ربیع الابرار[523] کی ضرورت ہوئی خواجہ عبدالباسط دہلوی سے منگائی اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا ؎

---

۵۲۱ عنقریب زمانہ تجھ پر بہت سی نامعلوم باتیں ظاہر کرے گا اور تجھے وہ شخص خبریں دیگا جس کو تو نے اس غرض سے بھیجا نہیں۔ "سبعہ معلقہ" قصیدہ ثانیہ طرفہ بن عبد البکری۔

۵۲۲ زمخشری، ابوالقاسم جاراللہ محمود بن محمد بن عمر خوارزمی طریقتاً حنفی عقیدتاً معتزلی تھے۔ ائمہ نحویین

ﮯ یا باسط الایدی یا غیث الندی　　صیرت مزرعۃ العطا مربعا

ﮯ لا غروان ارجوا الربیع بفضلکم　　فالغیب یعطی العالمین ربیعا

خواجہ صاحب نے کتاب مذکور فوراً سیر صاحب کی خدمت میں بھیجدی جو اُن کے کتبخانہ میں مدت تک موجود رہی۔

؎ ل سبحۃ المرجان میں یہ مصرع یوں لکھا ہے۔ لا غروان اطلب ربیعا منکم

ﮯ مربع بروزن ربیع سرسبز۔ ظاہرا مربعہ کہنا چاہیئے تھا برعایت مزرعۃ ارض مربعہ مخصبۃ کو کہتے ہیں

داخل ہیں۔ ان کا دعوی تھا کہ اُن کی تصانیف نحویہ اپنی جامعیت کے لحاظ سے سیبویہ کی کتابوں سے کسی طرح کم مرتبہ نہیں رکھتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ بڑے بلند پایہ لغوی، ادیب، مفسر بھی تھے۔ ابو عمر و عامر بن حسن سمسار کہتے ہیں کہ زمخشری روز چہارشنبہ ۲۷ رجب ۴۶۷ھ (۲۲ مارچ ۱۰۷۵ع) کو بمقام دیہہ زمخشر ملک خوارزم پیدا ہوئے شب عرفہ ۵۳۸ھ (۷ دسمبر ۱۱۴۳ع) میں قصبہ جرجانیہ (خوارزم) میں وفات پائی [جرجانیہ معرّب ہے اصل نام فارسی کاگرگانج تھا۔ دریای جیحون کے کنارے واقع ہے] فاضل ابو مُضَر کے شاگرد تھے اُستاد شفیق کی رحلت پر مرثیہ رنّانہ لکھا تھا۔

وقائلۃ ماھذہ الدرر التی　　تساقطھا عیناک سمطین سمطین

فقلت لھا الدر الذی کان قد ملا　　ابو مضر اذنی تساقط من عینی

حج بیت اللہ کی عزلت سے جب زمخشری بغداد ہو کر گذرے تو اُن کی آمد پر شیخ شریف ابو السعادات ابن شجری مبارکباد کہنے آئے اور چند اشعار پڑھے۔ زمخشری کی مدح و ثنا کی۔ زمخشری خاموش بیٹھے سنتے رہے حتی کہ شیخ نے اپنی تقریر ختم فرمائی۔ تو زمخشری نے اُن کا شکر ادا کیا تعظیم دی اور اپنی جانب سے تواضع و انکسار کا اظہار کیا۔ اسکے بعد ایک روایت بیان کی کہ جب زید الخیل بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے اور جمال مبارک دیکھا تو بے اختیار بآواز بلند تشہد پڑھنے لگے۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اے زید الخیل ہر مرد کہ جسکی مجھسے توصیف کی گئی ہو، میں نے اُس کو اُن صفات سے دون و فروتر پایا مگر تم کو کہ تم بیشک اُن اوصاف سے جو سُنے تھے فوق و بالاتر ہو پھر زمخشری نے کہا کہ یہی کیفیت ہمارے شیخ شریف کی بھی ہے اور اُن کو دعائیں دیں اور ثنا و صفت کی۔ شیخ شریف اپنی مجلس میں وقور و صاحب سمت حسن تھے۔ ادب نفس اور آداب درس سے خالی کوئی کلمہ زبان سے نہیں نکالتے تھے۔ اس لئے حاضرین متعجب تھے کہ سلالہ نبوت کا ایک وجیہہ و معمّر معزز شخص نوجوان شعر پڑھ رہا ہے اور اُسکے روبرو ایک ادیب و شاعر مناسب حال حدیث بیان کرتا ہے

زمخشری اور ابن عطیہ کے ساتھ جو مباحثے اثیر الدین ابو حیان اندلسی نے کئے تھے ان کو ابو حیان کے شاگرد

لیکن فعیل مذکر و مونث دونون کے لئے آتا ہے جیسے اِنَّ رَحْمَةَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (خدا کی رحمت خلوص رکھنے والون سے قریب ہے ترجمہ سورۃ الاعراف ع ۷-۱۴) صاحب قاموس نے رسل کے مادہ مین اس قاعدہ کی تصریح کی ہے۔ لاغرو ولمعنی لاعجب۔ رشید وطواط نے حدائق السحر بین تاکید المدح بمایشبہ الذم کی مثالون مین بدیع ہمدانی سے یہ مثال نقل کی ہے ؎

هُوَ البدر الّا انّه البحر زاخرًا   سوی انّه الضّرغام لکنّه الوبل

اور لکھا ہے کہ مین نے یہ شعر بلخ مین ابراہیم غزی شاعر کے روبرو پڑھا اُس نے یاد کرلیا اور ایک ہفتہ سے زیادہ اس کے مثل کہنے کی فکر کرتا رہا مگر ناکام رہا اور اپنے عجز کا اعتراف کیا اور اقرار کیا کہ بدیع سے پیشتر نہ تو کسی نے ایسا کہا اور نہ اب کہہ سکے گا۔ میر عبدالجلیل فرماتے ہین کہ اس نفی تابیدی سے تعجب ہے جو رشید وطواط نے غزی سے نقل کی ہے۔ چنانچہ اسی طرز پر ایک شعر خود نظم کیا اور اسمین مراعات نظیر کا حق ادا کر دیا ہے ؎

هو القطب الّا انّه البدر طالعًا   سوی انّه المریخ لکنّه السّعد)

شیخ تاج الدین احمد بن عبدالقادر بن مکتوم نے قلمبند کرلیا تھا۔ درّ اللقیط نام رکھا تھا۔ زمخشری و وطواط سے بھی مناظرہ ہوا تھا۔ اُس کی روئداد کا ایک ورق مدینہ منورہ مین عارف حکمت بے کے کتبخانہ مین محفوظ ہے۔ ابن وہاس بلیانی فقیہ مکّی کا قصیدہ زمخشری کی مدح مین مشہور ہے۔

زمخشری کی بہت سی تصانیف موجود ہین۔ ربیع الابرار و نصوص الاخیار و متشابہ اسامی الرّواۃ و النصائح الکبار والنصائح الصغار، ضالۃ الناشد والرائض فی علم الفرائض، شقائق النعمان فی حقایق النعمان، شافی العی من کلام الشافعی، القسطاس فی العروض، معجم الحدود ومنہاج فی الاصول، مقدمۃ الادب، کتاب الکشاف عن حقائق التنزیل (تفسیر مین) کتاب المفصل فی النحو، کتاب المفرد والمولف (نحو مین) اور اطواق الذہب غایت شہرت سے محتاج تعارف نہین۔ ان کے سوا کتاب الفائق (تفسیر حدیث مین) اساس البلاغۃ (لغت مین) اور کتاب اسمار الادویہ والجبال، مقامات الزمخشری اور اعجب العجب شرح لامیۃ العرب (للشنفری) بھی قابل ذکر ہین۔

ف حضرت زید الخیل الطائی کا نام نامی حضور اقدس صلعم نے "زید الخیر" رکھا تھا۔ آپ کے حالات استیعاب اور اصابہ وغیرہ مین ملتے ہین۔ عرب کے نام آور شاعرون مین سے تھے۔ الشعر والشعراء مطبوعہ لیڈن مین (صفحات ۵۶ الغایتہ ۱۵۸ پر) آپ کے اخبار و احوال بالتفصیل مرقوم ہین۔

اشعارِ متفرق

(فارسی)

(۱)

وردِ خود نام خدا با نام احمد کردہ ام ‏ دانۂ تسبیح از میم محمد کردہ ام

(۲)

بجز مژگان ندارد چشم بیمار تو غمخوارے ‏ بلا گردانی برگشتہ مژگانت تماشا کن

(۳)

سرت گردم ادا فہمی سواد نامۂ گلگون ‏ چو دود آہ در بخت جگر پیچیدہ می آید

(۴)

شام غم را در سواد نامہ پنہان کردہ ام ‏ صبح محشر می دمد از صفحۂ مکتوب ما

(۵)

خزان بہار ندارد، ولے حنائے نگار ‏ خزان چو کرد، نماید بہار نیلوفر

(۶)

بانتظار قدوم تو، لالہ در گلشن ‏ ستادہ قہوہ بکف در پیالۂ یاقوت

---

۵۲۳ ربیع الابرار اب تک حلیۂ طبع سے معرّیٰ ہے البتہ تلاش سے کہیں کہیں اسکے خطیہ نسخے مل جاتے ہیں پانچ چھ سو صفحات کی ضخامت ہوگی عربی سے فارسی میں بھی ترجمہ ہوا ہے محمد بن یعقوب نے ۹۲۱ھ (۱۵۱۵ع) میں اصل عربی کا اختصار کرکے روض الاخیار المنتخب من ربیع الابرار کے نام سے موسوم اور سلطان سلیم خان بن بایزید خان عثمانی سے منسوب کیا تھا۔ یہ مختصر ۱۲۸۰ھ میں مصر میں طبع ہوا تھا۔ بعض لکھتے ہیں کہ ابو الحسن الواحدی نے متنبی کی شرح لکھی تھی زمخشری نے اس سے التقاط کیا۔ قاضی نور اللہ نے مجالس میں ربیع الابرار کا حوالہ دیا اور ذکر کیا ہے مولانا ابو الحسنات عبد الحی فرنگی محلی نے بھی فوائد البہیہ فی تراجم الحنفیہ میں ربیع الابرار کا نام لیا ہے۔

مُستزاد

یہ رُباعی چاروں زبانوں میں محض اپنی تفریح طبع کے لیے بصنعت مُستزاد کہی تھی ؎

جَاءَ النَّیْرُوْزُ بِالنَّشَاطِ الاَوْفیٰ — فِیْ خَیْرِ قُدُوْمٍ — سال نو کا دن بڑی خوشی کیساتھ آیا — نیک آپکے ساتھ
پھولین دُرم بیل کھلی بن اولیا — ترور ہی جھوم — شاخین چھوٹیں نئے رنگین جنگل لہلہانے لگا — درخت پنا سر ہلانے لگے
نیکی کند روز کلدی یری بولدی لیش — قتلغ بو سوم — نئے سال کا دن آیا بیابان سرسبز ہوگیا — مبارک ثابت ہو
چون شہپر طاؤس گل اندر صحرا — آورد ہجوم — سو کوں کھلی ہوئی ہم کیطرح ہنسی جنگلیں لپا — اکٹھے ہوگئی این

۳۳ نوروز ماہ کا پہلا دن ہے - اس روز آفتاب برج حمل میں آتا ہے -
مولوی محمد حسین آزاد دہلوی دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ "نوروز کو ایشیا کی ہر قوم و ملت اور ہر ملک کے لوگ ہمیشہ عید مانتے اور مناتے رہے ہیں - موسم بہار میں طبائع انسانی میں ایک ولولہ و جوش پیدا ہوجاتا ہے خواہ ترکان چنگیزی ہوں یا آتش پرستان ایرانی . . . . اسی لئے بادشاہان تیموری بھی نوروز کے دن شاہانہ فر و سطوت و شکست جشن کیا کرتے تھے - اکبر نے اس کے اہتمام و احتشام کو زیادہ چمکا دیا تھا - نوروز سے لے کر اٹھارہ دن تک اُمرا اُسکے تکلفات و ضیافت میں مشغول و مصروف رہتے تھے - رقص و طرب کی محفلیں گرم ہوتی تھیں ، اور وہ سب رسوم ادا کی جاتی تھیں جو اکبر کے نزدیک ہندوستان کی دلدہی اور استمالت کے لئے ضروری تھیں - راجہ مہاراجہ ایک طرف ، ایرانی تورانی سردار دوسری طرف اپنی شان و شوکت اور بہادری و شجاعت کی نمائش کرتے تھے - پہلے شاہزادوں کی پھر امرا کی درجہ بدرجہ انذریں گزرتی تھیں تخت گاہ تک پہونچکر آداب زمین بوس بجالاتے شعرا قصاید پیش کرتے صلہ و خلعت پاتے . بادشاہ کا تُلادان سونے کی ترازو میں سونا چاندی سے کیا جاتا - "

شاہجہان نے اس رسم کو بالکل اٹھا دیا تھا - شاہزادہ ولی عہد محمد معظم بہادر شاہ نے ایک مرتبہ یہ جشن منایا تھا . عالمگیر کو خبر ملی تو فرزند سعادت توام کو ان الفاظ میں سرزنش فرمائی -

" از عرض بے غرضے ظاہر شد کہ امسال نوروز سے بطور اہل ایران بتکلف کردہ اند بفضل الہی عقائد خود درست دارند - این بدعت تازہ از کہ آموختہ اند - ظاہر آن عرب کہ خود را سنی می گوید تعلیم کردہ باشد - بہر حال چون این روز از اعیاد مجوس ست و اعتقاد ہنود در روز جلوس بکرماجیت وسمہ از تاریخ است بعد عمل نیاید و چنین جہالت بفعل نہ گرایید - "

اشعارِ عربی

(میر عبد الجلیل کا کلام عربی کبھی مُدوّن نہین ہوا متفرق اشعار جا بجا تذکرون مین ملتے ہین بعض منتخب نقل کئے جاتے ہین ؎

یا صاح لا تلم اللتیمّ فی الھوی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ھو عاشق لا ینثنی عن خلہ
ابی الدواء سقامہ کعیونہ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ فعلی الطبیعۃ یا معالج خلّہ

حبیبی قوس حاجبہ کنون ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وصاد یدا بن مقلۃ شکل عینہ
لعمری انہ نصّ جلیٌّ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ علی ان الرمایۃ حق عینہ

کسی شاعر کے دو شعر مشہور ہین اُس رنگ مین فرماتے ہین

حبیبی ثغرہ کالسین شکلا ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ وکالمیم السّہ ورشکل فیہ
ھما سم، ویا عجبا حیاتی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اذا ما ذقتہ لا شک فیہ

میر غلام علی آزاد لکھتے ہین کہ اسمین ضمیر مذکر حیوۃ کیطرف راجع کردی گئی ہو اسمین اصلاح اس طرح پر ہوسکتی ہے

"رفع بدعت نوروز و تبدیل آن بجشن نشاط افروز جلوس مبارک" کے عنوان سے منشی محمد کاظم بن محمد امین نے عالمگیر نامہ (مطبوعہ کالکتہ کالج پریس ۱۸۶۸ء صفحہ ۳۸۹) مین ان احکام و ہدایات شاہی کا ذکر کیا ہے۔
شاہ دین پناہ کی رحلت کے ساتھ جب مہمات مملکت مین تخالل اور اساس سلطنت مین تزلزل آیا تو یہ بدعات و رسوم پھر تازہ ہوگئین
دولت و حشمت کے ایسے کرشمے دورِ زمانہ نے بہت دیکھے ہین ؎

این چنین بسیار کرد است و کند ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سبحہ را زُنّار کرد است و کند

ہندوستان مین سال شمسی کے آغاز پر نوروز ۲۲ یا ۲۳ مارچ کو ہوتا تھا اور مغلون کے آخر عہد تک بڑے تزک و احتشام سے منایا جاتا تھا۔

فتاۃ ثغرھا کالسیر شکلا | وکالمیم المدور شکل فیھا
ھما سُمٌّ وباعجبا حیاتی | اذا ماذقتہ لا شک فیھا)

مُعمّے

یدِ بیضا میں لکھا ہے کہ میر عبدالجلیل کے معمیات چاروں زبانوں میں ہیں اور بکثرت ہیں منجملہ اُن کے یہ دو معمے نقل بھی کئے ہیں جن کا آیات قرآنی سے استخراج کیا تھا۔

(۱) علی کے نام کا وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ یَقُولُ الْاِنْسَانُ یَوْمَئِذٍ اَیْنَ الْمَفَرُّ [اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں۔ اُس دن آدمی بول اُٹھیگا کہ اب کدھر کو بھاگ جائیں جز۲۹۔ سورۃ القیٰمۃ۔ ع ۱-۱۶] شمس سے مراد عین ہے اور قمر سے ماہ۔ اور ماہ سے تلیث اور یہ سے لام اور یقول کی تحلیل سے دو چیزیں پیدا ہوئیں۔ ایک ”ی“ دیا اور دوسرا قول یعنی قیل دکھا گیا، کہ جب نام علی نکل آیا تو اس کے معنی یہ ہوئے ”جب وہ لایا جائے جو انسان کامل ہے۔ آج اُس سے گریز کہاں ممکن ہے“

(۲) بصیر کے نام کا۔ اِذْهَبُوا بِقَمِيصِي هٰذَا فَاَلْقُوْهُ عَلٰى وَجْهِ اَبِيْ يَاْتِ بَصِيْرًا [میرا یہ کُرتا لے جاؤ اور اس کو والد صاحب کے مُنہ پر ڈال دو کہ وہ دیکھنے لگیں گے جز۱۳۔ سورۂ یوسف۔ ع ۱۰-۴] ’ابی‘ سے مراد اُس کا مرادف ’والدی‘ ہے۔ عدد ’قمیصی‘ اور ’والدی‘ کے ’بصیر‘ کے اعداد کے برابر ہیں تو معما کے معنی یہ ہوں گے ”پس اس کو میرے والد (باپ) کے اوپر ڈال دو۔ جو ’ابی‘ کا مرادف ہے“ اور آیہ کی عبارت سے بھی لفظ بصیر کا خروج ظاہر ہے۔ آج یہ تکلفات بارگراں، اور نازک خیالیاں روح فرسا ثابت ہو رہی ہیں لیکن ڈھائی سو برس پہلے یہی مغز کاویاں و صنعت کاریاں معیار کمال اور حُسن کلام سمجھی جاتی تھیں۔

مُلا محمد قاسم کاہی نے ایک پورا رسالہ فن معما میں لکھا ہے۔ انہیں نبی کے نام کا یہ معما تحریر کیا ہے

برہ شعر تا شستافتہ ام | از محمد نبی ستگافتہ ام

میر عبد الجلیل نے بھی اسی طرز پر معمّا امام کے نام کا نکالا ہے ؎

در معمّا چو کام یافتہ ام — من علی را امام یافتہ ام

علی کے نام کا یہ معمّا ناصر علی سے منسوب ہے جس میں اعراب کی بھی تصریح ہے ؎

چشم بکشا، زلف بشکن، اے جانِ من — بہرِ تسکینِ دلِ بریانِ من

یہ عل مرادف چشم یعنی عین ۔ و بکشا بمعنی افتح یعنی عین کو فتحہ دیجیئے۔ زلف بعمل تشبیہ سے لام ہو جاتی ہے۔ بشکن بعمل مرادف سے بمعنی اکسر یعنی لام کو کسرہ دیجیئے۔ دل بریان، یا ہے تسکین، سکون دینا۔ حاصل کُل عَلِیْ ہوا۔

آزاد نے بھی ایک معمّا باسم ممنون لکھا تھا جس پر میر عبد الجلیل نے صاد کیا تھا ؎

غم من بے نتیجہ بود اوّل — شکر ایزد نتیجہ داد آخر

غم من، اول شکل منطقی ہے یعنی غم صغریٰ و من کبریٰ۔ اوّل بے نتیجہ ہو گیا یعنی غین کا نون جاتا رہا۔ م، کہ حد اوسط ہے باقی رہا۔ آخر نتیجہ غین، نون ہوا۔ نون رہا۔ ممنون حاصل ہوا۔

متصوّفانہ مکاتبت

سید اسمٰعیل[۲۵] بلگرامی خلیفہ شاہ عبد الرزاق بانسوی نے ایک رقعہ میر عبد الجلیل کو لکھا تھا۔ سوال یہ تھا کہ یقظہ (بیداری) افضل ہے یا نوم (خواب)؟

میر صاحب مشفق مہربان فیض رسان سلامت حقیقت نوم و یقظہ پر ارباب معانی منکشف

---

۲۵ میر سید اسماعیل سادات حسینی واسطی کے خشیرہ پنج بقیہ سے بلگرام محلہ میدان پورہ کے باشندے تھے ابتدائے حال میں کتب درسی پر عبور حاصل کیا اور فضائل رسمی کو اکتساب فرمایا تھا میر طفیل محمد بلگرامی کے علاوہ دیگر اساتذہ سے مختلف مقامات میں بھی تحصیل علوم کی تھی۔ خدا طلبی کی شورش جب سر میں بڑھی تو شیخ عبد الرزاق بانسوی کی خدمت میں پہونچے شرف بیعت حاصل کیا اور مورد عنایات خاص ہوئے۔ بارہ سال کے قریب شیخ کے زیر سایہ تربیت رہ کر ریاضت ہائے شاقہ فرمائیں اور دفائز بفیوض گرانبہا معانی

وہویدا است بعضی نوم را بر یقظہ ترجیح دادہ اند و بعضے یقظہ را بر نوم ۔ این معنی بما مشروحاً تحریر فرمایند
والسلام علیکم وعلیٰ من لدیکم ۔

میر صاحب نے اس کا جواب حسب ذیل تحریر فرمایا ۔

بیدار دل، خوابیدہ ہوا، ثابت مقام تسلیم و رضا سلامت ۔ از معارضۂ نوم در تفضیل یقظہ بر نوم نگارش رفتہ رمز آگاہا! اگرچہ منطوق کلام اَلنَّاسُ نِیَامٌ فَاِذَا مَاتُوْا اِنْتَبَهُوْا و حدیث شریف اختصام ملاء اعلیٰ در تصعید عمل متیقظ بہ بالا روی با انحطاط در جہ جواب دارد ع چشم تو نہ بخت ماست پر خواب چراست؟

پہونچ گئے شیخ کے انتقال کے بعد سجادۂ خلافت کو زینت دی حضرت شیخ کے تمام خلفا اور مریدان کو اپنا مقتدا سمجھتے اور مانتے تھے ۔ اعتقاد کامل رکھتے اور ادب و احترام کرتے تھے حسب روایت مآثر الکرام علامۃ العصر مولوی نظام الدین خلف الصدق مولانا قطب الدین شہید سہالوی نور اللہ ضریحہما نے بھی شیخ کی وفات کے بعد میر کی خدمت میں رجوع کیا تھا ۔ میر نے سوَلی (ضلع بارہ بنکی) تابع لکھنؤ میں قیام اختیار فرمایا تھا لیکن گاہ گاہ بھی اکثر تشریف لاتے اور ارشاد و ہدایت میں مشغول رہتے تھے ۔ ارادتمندان عقیدت کیش کی تعداد اکثر تھی ۔ ۱۴ ذی الحجہ ۱۱۶۴ھ (۲۵ نومبر ۱۷۵۱ء) کو سوَلی میں استراحت دائمی پسند فرمائی ۔

۵۲۶ شاہ عبد الرزاق، دراصل قصبہ محمود آباد (جوار بانسہ) کے رہنے والے تھے، بانسہ تابع لکھنؤ (حال واقع ضلع بارہ بنکی) کے شیوخ قدوائی میں آپ کا ننھیال تھا ۔ اسی ارشاد ری کے علاقہ سے بانسہ میں توطن فرمایا تھا ۔ شروع زمانہ میں پیشہ نوکری اختیار کیا تھا کسب معاش فرماتے رہے ۔ پھر ترک ملازمت فرما کر ایک عمر سیر و سیاحت میں گذار دی ۔ سواد احمد آباد گجرات میں شاہ عبد الصمد خدانما کی خدمت سے مشرف ہوئے ۔ مرید ہو کر مقاصد اعلیٰ پر پہونچے ۔ وہاں سے وطن مالوف واپس آئے ۔ لباس ہمیشہ اہل دنیا کی طرح پہنتے اور شغل کاشتکاری سے قوت حلال بہم پہونچاتے تھے ۔ حضرت کی حالت دیکھ کر ہر شیخ و شریف مطیع و منقاد ہو جاتا تھا ۔ علمائے متبحر اور فضلائے عصر آپ کے حلقہ بگوش اور ارادت مند تھے ۔ با این کہ امی محض تھے آیات قرآنی کو از بر پڑھتے اور نہایت خوب تفسیر فرماتے تھے ایسے حقائق و معارف و اسرار بیان کرتے تھے کہ جن کو سن کر عقلاء و دانشمند متحیر رہ جاتے تھے ۔ بروایت میر غلام علی آزاد ۔ ۵ شوال ۱۱۳۶ھ (۲۹ رجون ۱۷۲۴ء) کو اور حسب تحریر بزرگان فرنگی محل ۶ شوال روز چہار شنبہ کو رحلت فرمائی ۔ مدفن شریف بانسہ میں ہے ۔ مزار متبرک ہے ۔

۵۲۷ اختصام ملاء اعلیٰ حدیث شریف میں آیا ہے کہ تین اعمال کے لیجانے میں ملائکہ باہم خصومت اور جھگڑا کرتے ہیں اِطْعَامُ الطَّعَامِ وَلِیْنُ الْکَلَامِ وَالصَّلٰوۃُ بِاللَّیْلِ وَالنَّاسُ نِیَامٌ (۱) کھانا کھلانا (۲) کلام کی نرمی

امضمون کریمه ﴿وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ﴾
باعتبار کفالهٔ تقلیب که مشتمل ست بر امر عجیب، دلالت بر رفعت شان از خود خوابیدگان وارد ع
زہے مراتب خوابے که به ز بیداری است.

واگرچه بظاهر خطاب قُم یا نومان ناظر به نیم ست اما تقطیعه بفضل عبا مشعر به غایت تعظیم و ہم
چنین مضمون این منظومهٔ ہندی ع یا رآیو تب گانون سوئے کیسین نجگت پراپت ہوئے،
اگرچه ایمائے به تنقیص نوم دارد اما فحوائے دوہره ؎

سپنین دیکھون پیہ میں کھل گئی انکھ ادہاگ — اور گنواوت سوئی سب سوون تو گنوائیو جاگ

از غایت نزاکت کاری مبنی است به تفضیل نوم بر بیداری ؎

خوشا نجالت آن عاشقے که در شب ہجر — به خواب اش آئی و او شرمسار برخیزد

تحقیق مقام آنکه تا سرے به خیال او داری اگر بیداری است به از نوم، واگر نوم است به از بیداری
که رنگ ریزی شبلی و حشیم و مترد برای رفع خواب و خوابیدن عبود ہفت سال و اول ورا این او به بہشت،
ہر دو صواب است. این ست ما حضر فکر مستقیم ﴿وَفَوْقَ كُلِّ ذِي عِلْمٍ عَلِيمٌ﴾

---

(۳۴) نماز نوافل شب جس وقت که لوگ سو رہے ہوں۔ یہ حدیث تمامہ مشکوٰۃ کی تیسری فصل، باب المساجد و مواضع الصلوٰۃ میں موجود ہے۔

ف۳۵ اور تو ان کو سمجھے کہ جاگتے ہیں حالانکہ وہ سوتے ہیں اور ہم داہنی طرف کو اور بائیں طرف کو اُن کی کروٹیں بدلواتے ہیں۔ (جز ۱۵۔ سورۃ الکہف ع ۳ ۔ ۱۵)

ف۳۶ قم یا نومان۔ غزوہ خندق میں کفار کے فرار کی شب میں ابر و سردی سخت اور ہوا نہایت تند تھی حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حذیفۃ الیمان کو کفار کے لشکر کی خبر لگانے اور پتہ چلانے کو بھیجا اور دعا فرمائی جس کی سردی اور کھوکھانکی دور ہو گئی یہ جیسے گرمی لوٹ کر آتے جاڑے کا اثر تیز ہو گیا حضرت صلعم نے فضل عبا یعنی اُس لباس کلیم کا جو دوش مبارک پر تھا گوشہ نماز اُنکو اٹھا دیا اور پائے مبارک اُنکے سینہ پر رکھ دیا لیکن ہو گئی اور سو گئے جب نماز صبح کا وقت قریب آیا تو آپ نے فرمایا ''قُم یا نومان'' یعنی اے بہت سونے والے اٹھ۔

ف۳۷ عَبُود بفتح عین وتشدید بائے مضموم۔ ایک حبشی غلام تھا جو سات سال تک سوتا رہا اور سب سے پہلے بہشت میں داخل ہوا سبب یہ ہے کہ اس زمانہ کے پیغمبر کو اُن کی اُمت نے ایک کنوئیں میں بند کر دیا تھا عبودؓ

بعض تاریخین

میر عبدالجلیل کو تاریخ گوئی مین بڑا ملکہ تھا۔ ان سے سنکر اس فن کی ابتدائی تاریخ آزاد نے سبحۃ المرجان مین درج کی ہے۔ ان کے دائرہ تاریخی کا ذکر اور اسکے متعلق شیخ غلام نقش بند کی ستائش پیشتر حوالہ قلم کر چکا ہون۔ یہان صرف چند تاریخین جو خوبی فن اور لطافت محاضرات کے لحاظ سے قابل لحاظ ہین نقل کی جاتی ہین۔

تہنیت فتح یا جلوس مین بارگاہ شاہانہ مین پیش کی گئین۔

سلطان اورنگ زیب عالمگیر نے جب ۱۳ ذی قعدہ سنہ ۱۱۱۱ھ (۲۲ اپریل سنہ ۱۷۰۰ع) کو مرہٹون کو شکست دیکر قلعہ ستارہ گڈھ[۵۳۳] (واقع دکن) فتح کیا تو اُسی شب مین میر عبدالجلیل نے عربی و فارسی و ہندی مین یہ تاریخین کہین

اُن پر ایمان لایا اور تمام قوم سے چھپا کر اُن کی خبرگیری و خدمت کرتا رہا۔ صاحب قاموس نے اس کا پورا قصہ مادہ بحیر مین ذکر کر دیا ہے۔

۵۳۲ اور ہر ایک دانا سے بڑھ کر دوسرا دانا ہے (جز ۱۳ سورہ یوسف ع۔ ۹۔ ۳)

۵۳۳ ستارہ (یا شہر ستارہ۔ اُسی ضلع کا صدر مقام صوبہ بمبئی مین) دریای کرشنا اور دینا کے اتصال پر واقع ہے۔

ستارہ کا مضبوط قلعہ ایک چھوٹے سے ڈھالو مگر سنگلاخ کوہچہ کی چوٹی پر نصب کیا ہوا نظر آتا ہے ہندو مورخین لکھتے ہین کہ اسکا نام ستارہ، اسکی سترہ (۱۷) دیوارون، برجون اور پھاٹکون کے شمار د مناسبت سے پڑا تھا جو اُن کی تحریر کے مطابق اس قلعہ مین تھے۔

مسلمانون کا پہلا حملہ دکن پر ۱۲۹۴ع (سنہ ۶۹۳ھ) مین ہوا تھا۔ دیوگری کا یادو خاندان سنہ ۱۳۱۸ع (سنہ ۷۱۸ھ) مین برباد ہوا تو مسلمانون کا تسلط بخوبی ہو گیا۔ سنہ ۱۳۴۷ع (سنہ ۷۴۸ھ) مین بہمنی خاندان نے عروج پایا۔ پندرھوین صدی کے آخر مین بہمنیون پر زوال آیا اور ہر سردار بجائے خود ذی اختیار بن بیٹھا حتی کہ سلطنت بیجاپور قائم ہوئی جسکے تحت مین مرہٹون نے بڑھنا شروع کیا۔ ستارہ مع اضلاع ملحقہ پونا اور شولاپور کے مرہٹون کی قوت کا مرکز بنگیا۔ ستارہ اور اُس کے متصل کے قطعات کو دکن مین مرہٹون کی تاریخ کے بہت سے اجزا اور اُن کے اعمال و افعال وقوع پذیر ہوے ہین۔ سیواجی کو پہلے پہل اسطرح شہرت نصیب ہوئی کہ اُس نے جاؤلی (متصل مہابلیشر) کے راجہ کو قتل کر ڈالا اور واسوتا کا زبردست قلعہ اور جاؤلی کو فتح کر لیا۔ سنہ ۱۶۵۶ع (سنہ ۱۰۶۶ھ) مین

لکھیں اور رسالہ ترتیب دے کر بادشاہ کے حضور میں پیش کیں اور خسروانہ تحسین کے مورد و مستحق ہوئے۔ رسالہ کا نام گلزار فتح شاہ ہند، طوطی نامۂ فیروزی شاہ عالمگیر رکھا تھا۔ خوبی یہ ہے کہ ان دونوں ناموں سے بھی تاریخ ۱۱۱۱ھ برآمد ہوتی ہے۔ پہلی تاریخ عربی کی اور دوسری فارسی کی تقریباً ایک ہیں۔ ان کا اختراع صنعت تعمیہ کے عجائبات میں شمار ہوتا ہے۔

فی العربیۃ ؎

لَمَّا تَوَجَّهَ سُلْطَانُ الْأَنَامِ إِلَى   رَبِّ السَّمٰوَاتِ فِي تَأْيِيدِ اِسْلَاءِ

أَقَرَّ إِبْهَامَهُ فِي أَصْلِ خِنْصَرِهِ   لِوِرْدِ يَا قَادِرٍ أَفْتَاحِ أَكْمَاءِ

فَصَارَ حِينَ افْتِتَاحِ الْاسْمِ مُفْتَتِحًا   حِصْنٌ لِمَنْ عَبَدَ وَأَحْجَارَ أَصْنَامِ

سیواجی نے پرتاب گڈھ کا مشہور و مضبوط حصار تعمیر کیا جس پر بادشاہ بیجاپور نے بسر کردگی افضل خان مرہٹوں کے استیصال اور اس قلعہ کے فتح کرنے کیلئے فوج بھیجی سیواجی مشاورت و مصالحت کے حیلہ سے قلعہ کی دیوار کے نیچے افضل خان سے ملاقی ہوا اور اُس کو اپنے مشہور خنجر "داگھ نکھ" (نام) سے ہلاک کردیا فوج منتشر و پریشان ہوگئی سنہ ۱۶۷۳ء (سنہ ۱۰۸۴ھ) میں اُس نے ستارہ فتح کیا۔ راے گڈھ میں اپنی آزاد بادشاہی کی راجدھانی قائم کی سنہ ۱۶۷۴ء (سنہ ۱۰۸۵ھ) میں تاج پوشی کی رسم ادا کی سنہ ۱۶۸۰ء (سنہ ۱۰۹۲ھ) میں اُس نے وفات پائی سمبھاجی جانشین ہوا سنہ ۱۶۸۹ء (سنہ ۱۱۰۰ھ) میں اورنگ زیب نے حملہ کرکے اسکو گرفتار کرکے قتل کرادیا۔ عالمگیر کی سیل رواں طاقت کو کون روک سکتا تھا۔ اُس نے سنہ ۱۷۰۰ء (سنہ ۱۱۱۱ھ) میں قلعہ ستارہ بھی فتح کرلیا اور مرہٹوں کو شکست فاش دی سنہ ۱۷۰۷ء (سنہ ۱۱۱۹ھ) میں اورنگ زیب نے وفات پائی

پیشوا کی لڑائی کے اختتام کے قریب خفیف مزاحمت کے بعد ستارہ انگریزوں کے قبضہ میں آگیا مگر فاتحین نے اسکو مع قطعات متصلہ کے پھر سیواجی کے خاندان کے قائمقام کے حوالہ کردیا سنہ ۱۸۴۸ء میں اخیر راجہ کی وفات اور اولاد نرینہ نہ چھوڑنے پر یہ ریاست بحق سرکار برطانیہ ضبط ہوگئی

شہر ستارہ کی آبادی بھی رو بہ زوال ہے سنہ ۱۹۰۱ء میں چھبیس ۲۶ ہزار کے قریب تھی سنہ ۱۹۲۱ء میں ۲۲۴۵۴ رہ گئی۔ یہ قلعہ والی پہاڑی کے دامن میں آباد ہے سنہ ۱۸۲۰ء میں محض ایک کوچہ سفالپوش مکانات کا تھا جس میں کچھ سنگین تھے اور کچھ خشت پختہ کے۔ راج کی شکست کے بعد قدرتاً آبادی میں زوال شروع ہوگیا۔

نَظَرَتْ فِی اَلِفَاتٍ وَهِیَ اَرْبَعَۃٌ ۔ مِنْ فَوْقِ اِبْهَامِهٖ مِنْ غَیْبِ اِبْهَامِ
وَجَدَتْهُنَّ لِعَامِ الْفَتْحِ حَیْنَئِذٍ ۔ رَقَمًا عَلٰی سَنَۃٍ مِنْ مَدِّ اِبْهَامِ
لِلّٰهِ تِلْكَ یَدٌ بَیْضَاءُ قَدْ نُزِعَتْ ۔ لِلنَّاظِرِیْنَ فَیَا لِلْمُعْجِزِ السَّامِی
هٰذَا الْبَدِیْعُ مِنَ التَّارِیْخِ اَنْشَأَهٗ ۔ عَبْدُ الْجَلِیْلِ بِتَائِیْدَاتِ اِلْهَامِ

اہل اوراد کا داب و دستور یہ ہے کہ جب انامل پر ورد کا شمار کرنے لگتے ہین تو خنصر (انگشت شہادت) کی جڑ سے ابتدا کرتے ہین میر صاحب نے ابہام (انگوٹھا) کا خنصر کی جڑ مین ٹھہرانے کا ارادہ کیا ہے جس سے تاریخ کی خوبی اور بھی بڑھ گئی ہی یعنی اس سے سنہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے پھر رقم کے الف اس پر درج کر لیجیے جیسا کہ اکثر نسخ نویسان کا معمول ہی۔ رقما علی سنۃ من مد ابہام مین اسی طرف اشارہ ہے۔ اس مین شک نہین کہ یہ تاریخ بہترین قسم کی ہی جو بڑی عرق ریزی و خوض سے کسی کو مل سکتی تھی اگر اسکے حسن کو اشعار مین بھی ظاہر نہ کر دیا ہوتا تاہم اس کی خوبی و شان و جدت اختراع روشن تھی۔

اسی کے ہم مضمون اور ہم شکل ذیل کی فارسی تاریخ مین جو انگلیون کی شکل سے نکالی ہو ایک جدت آفرینی کی ہی اور کمال طباعی و ذہانت دکھائی ہے ؎

چو شہ ابہام زیر خنصر آورد ۔ بورد اسم اعظم در شمارہ
قلاع کفر شد مفتوح فی الحال ۔ ز تیغ او عدو شد پارہ پارہ
ز انگشتان شہ بر مد ابہام ۔ برابر چار الف کردم نظارہ
بعینہ بود شکل سال ہجری ۔ پئے تاریخ تسخیر ستارہ
چنین تاریخ گفتن اختراع است ۔ شد از عبد الجلیل این آشکارہ

اس نوع کی تاریخ کو استنباط کہتے ہین۔ اعداد کی صورت مین سال تاریخ بیان کر دی ہی یعنی بادشاہ کی چارون انگلیون کو چار الف تصور کیا کہ جن سے اعداد سال ہجری یعنی گیارہ سو گیارہ

آثار گذشتہ مین صرف راجہ کا محل باقی ہی جس مین اب جج صاحب کی کچہری ہوتی ہے۔

۵۳۳ میر حمزہ تاشکندی نے بھی خواجہ محمد کی وفات کی تاریخ (صوری معنوی) اسی پیرایہ پر کہی تھی یعنی مرتبہ احاد و عشرات و مأت کے توافق پر ع نہ را بر رقم سہ بارہ نویس۔ جب نو کے ہندسے کو تین بار لکھا جاوے تو نو سو ننانوے ہوتا ہی یعنی نہصد و نود و نہ ۔ دوسرا لطف یہ ہے کہ مصرع کے اعداد جمل کے حساب سے بھی وہی ہوتے ہیں۔ ہندی کو کسی شاعر نے ہندسہ نو کے مضمون کو ہندی زبان مین کسقدر خوب ادا کیا ہی ۔ دا کو نانو مرد پیچھے جا لگت ایر ۔ پونا بیسے کو تو نو دکی مادہ نہ نا بچارے

کی صورت پیدا ہوئی اور ابہام در انگشت کو سنہ کی شکل ما نا کہ جس پر وہ چار دون الف مرقوم تھے۔ اس تاریخ فارسی نے عربی تاریخ سے بھی زیادہ شہرت وقبولیت پائی۔

ایک اور تاریخ تعمیہ کے ساتھ یہ ہے ؎

چو شاہ عالمگیر آفتاب عالم تاب — کہ تیغ اوست بگیتی کلید فتح الباب
ستارہ قلعہ کفار را محاصرہ کرد — بعزم آنکہ نماید بنائے کفر خراب
چنان بزلزلہ آمد زمین ز ہیبت او — کہ کوہ گشت چو دریا و قلعہ شد گرداب
چو فتح شد پئے تاریخ فکر می کردم — بر آمد از تہ دریائے فکر دُرِّ خوش آب
چو از درون ستارہ جنود شرک برفت — طلوع کرد درو آفتاب عالم تاب

یعنی لفظ "ستارہ" کے اعداد سے "جنود شرک" کے اعداد خارج کر دیجیے اور "آفتاب عالمتاب" کے اعداد شامل کر دیجیے تو تاریخ فتح بے تکلف برآمد ہوگی۔

یہ ایک قطعہ ہے جس سے چار مرتبہ تاریخ نکلتی ہے ؎

چو محی الدین محمد شاہ غازی — ستارہ فتح فرمود از اشارہ
رقم کردم ز نکات فکر بیتے — کز و شد چار تاریخ آشکارہ
بود ہر مصرعہ اش تاریخ منقوط — ہمان عاطل ہمان شد در شمارہ
محمد شہ اساس سطح را کند — بر آمد باطل از حصن ستارہ

آخر کے دونوں مصرعوں سے از روی حساب جمل جداگانہ تاریخ برآمد ہوتی ہے اور اگر اس شعر کے حروف منقوطہ یا غیر منقوطہ کو لیجیے تو بھی وہی تاریخ نکلے گی۔

بہ طریق تعمیہ یہ تاریخ بھی ہے ؎

جشن سہ بارہ گیر بہ فتح ستارہ گڈھ — نظارہ کن جوانب و اطراف بوستان
این بیت را بہ تعمیہ گیرد اگر کسے — تاریخ با لفظ شود از لفظ او عیان

یعنی لفظ جشن کو اگر تین بار حساب کیا جاسے تو کمبر از ۱۰۵۹ حاصل ہوتا ہے بوستان کے اطراف

بے، دو نون، ہین کہ جن کے اعداد دو اور پچاس، باون ہوتے ہین۔ مجموعہ ایکہزار گیارہ ہوا جو تاریخ کا عدد ہے اور مادۂ تاریخ الفاظ جشن ب ون ہے کہ ان مین سے ہر ایک منقوط ہے۔

تاریخ مندرجۂ ذیل بھی بطور تعمیہ ہے ؎

چو سیوا و سنبھا و رانا بہ گیتی — ز تیغ شہنشاہ گشتند پارہ
الف ہای این راجہ ہا را بیک جا — نوشتیم تاریخ فتح ستارہ

یعنی ایک الف اسم سیوا اور ایک الف نام سنبھا و دو الف اسم رانا کہ جن کا مجموعہ چار الف ہوتا ہے جب یکجا لکھے جائین تو سال ہجری کے اعداد یعنی ۱۱۱۱ کی شکل پیدا ہوگی۔

فتح بسنت گڈھ کی پانچ تاریخین لکھی تھین۔ انشای جلیل مین چار نقل کی ہین۔

نثر عربی مین — صَارَ دِیَارُ الْکُفْرِ مَکَانَ الْاِسْلَام

نظم عربی ؎ جَاهَدَ السُّلْطَانُ بِالْوَجْهِ الْاَتَمِّ — صَارَ دَارُ الْکُفْرِ طَمْسًا بِالْیَقِیْن
قُلْتُ فِی تَارِیْخِ هٰذَا الْاِفْتِتَاح — مُحَمَّدٌ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ الْمُبِیْن

نثر فارسی — فتح بسنت گڈھ بمدد ایزدی

نظم فارسی ؎ شاہ اورنگ زیب عالمگیر — چون کمر از پی جہاد ببست
کرد فتح بسنت گڈھ بغزا — سال تاریخ گو کہ کفر شکست

میر عبد الجلیل نے فرخ سیر بادشاہ کی تخت نشینی کی تاریخین بھی چارون زبانون مین لکھی تھین۔ آیۂ کریمہ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاءُ سے اس کا استخراج کیا ہے ؎

قَدْ تَوَلّٰی فَرُّخْ سِیَر مُلْکَ هِنْد — وَلَهُمْ عَوْنُ الْقَدِیْر اِعْتِلَاء
فَاقْتَبَسْنَا تَارِیْخَهٗ مِنْ کَلَام — صَمَدِیْ یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَاء

ہمزہ بشمار داخل حساب ہے سال جلوس ۱۱۲۴ ہجری تھا

مفتاح التواریخ اور بیلس اورینٹل بایگرفی کل ڈکشنری مین زمانہ جلوس جنوری سنہ ۱۷۱۳ع

۱۱۲۴ جس کو چاہتا ہے اُس کا وارث بنا دیتا ہے (جزو ۹ سورۃ الاعراف ع ۱۵-۵)

مطابق ۱۱۲۵ھ لکھا ہے یہ صریحًا غلط ہے فرخ سیر کی تخت نشینی قلعۂ دہلی میں جمعہ ۲۳ ذیحجہ ۱۱۲۴ھ کو ہوئی تھی جو ۹ جنوری ۱۷۱۳ء کے مطابق ہوتا ہے۔ غالباً مسٹر ہبل نے انگریزی سے سال ہجری بنانے میں غلطی کی ہے۔

خطاب

نواب غازی الدین خان نظام الملک آصف جاہ کو جب شاہ عالم نے صوبہ داری اودھ اور فوجداری لکھنؤ پر متعین کیا اور "خان[۵۳۵] دوران بہادر" خطاب دیا تو میر عبد الجلیل نے تاریخ عطائے خطاب "خان دوران بہادر" سے نکالی ۱۱۲۴ھ

ولادت

میر سید نور الحق خلف الصدق سید العارفین شاہ لدھا بلگرامی کی ولادت

از لفظ "بخت مند" ۱۰۹۶ھ سے ہائے۔

میر غلام نبی[۵۳۶] میر صاحب کے خواہر زادے بلگرام میں ۲ محرم ۱۱۱۱ھ (۲۰ جون ۱۶۹۹ع) کو تولد ہوئے۔ میر صاحب اسوقت اردوے عالمگیری کے ساتھ نواحی قلعہ ستارہ میں تشریف رکھتے تھے، خبر پہنچی تو تاریخ نکالنے کی فکر ہوئی۔ اسی خیال میں سو گئے۔ عالم رویا میں بچہ کی صورت نظر آئی زبان سے کہہ رہا تھا ع نور چشم باقر عبد الحمید م بیدار ہونے پر اعداد کا شمار کیا۔ پوری تاریخ تھی تین مصرعے اور لگا کر بحر رمل مسدس سالم میں جو تین بار فاعلاتن ہوتی ہے، قطعہ نظم کر دیا ؎

---

۵۳۵ دولت تیموریہ کے تیسرے امیر تھے جنکو یہ خطاب عطا ہوا تھا۔ مفصل تذکرہ اپنے موقع پر آئیگا۔ "خان دوران چہارم" صمصام الدولہ عبد الصمد خان، بہادر جنگ تھا۔

۵۳۶ میر غلام نبی۔ علاوہ قرابت کے میر عبد الجلیل کے تلمذ سے بھی شرفیاب تھے۔ میر سید محمد کے بعض خطوط میں بھی انکا تذکرہ ہے اور بڑی محبت و اشتیاق کیساتھ یاد کیا ہے۔ پایان عمر میں نواب صفدر جنگ کے رفقاء و متوسلین میں ہو گئے تھے افاغنہ کے معرکہ میں ۲۲ شوال ۱۱۶۳ھ (۱۷۵۰ع) کو اس خاکدان ہستی کو چھوڑا۔ نعش کا پتہ بھی نہ چلا۔ ہندی میں تخلص رس لین کرتے تھے یعنی "رس میں محو"۔ متعدد تصانیف چھوڑی ہیں۔ "انگ درپن" بالخصوص قابل ذکر ہے۔ ہندی شعرا کے تذکروں میں انکا نام ممتاز اور جیوتی کے لوگوں میں بتاتے ہیں۔ میں بھی انکو عزت و اختصاص کی جگہ دی گئی۔

نورچشم میر باقر گفت بامن — چون گل خورشید در عالم دمیدم
سال تاریخ تولد خود بگفتستم — نورچشم باقر عبد الحمیدم
۱۱۱۱ھ

باقر باپ کا نام اور عبد الحمید دادا کا تھا۔ اہل وطن کو لکھا کہ یہ مولود مسعود شاعر ہوگا۔ جیسا آپ نے فرمایا تھا آخر ویسا ہی ہوا۔ میر غلام نبی شاعر غرا ہوئے۔ نبی تخلص تھا۔ موسیقی اور ساز ہندی میں ماہر کامل تھے۔ مرزا جان جاناں مظہر دہلوی فن شعر ہندی میں ان کے شاگرد تھے۔ مرزا مظہر ان کا بڑا معتقد تھا۔ غلام نبی کے ہندی اشعار اور غلام علی کے عربی قصائد سنکر نہایت محظوظ ہوتا تھا اور یہ قطعہ نظم کیا تھا ؎

درین زمانہ کہ ارباب فضل کمیاب ست — ز بلگرام دو شخص اند در سخن استاد
یکے امام زمان سید غلام علی — کہ شعر عرب مثل او ندارد یاد
دگر جہان ہنر سید غلام نبی — رسانده فطرت او شعر ہند را بمراد
نگاہدار الٰہی ہمیشہ ایشان را — بمرسلِ عربیِّ و آلہِ الامجاد

میر عبد الجلیل کو اعزہ کی فرمائشات کی تعمیل میں کبھی دریغ نہ ہوتا تھا۔ سید محمد روشن ساکن سیانڈی کے یہاں لڑکا پیدا ہوا جس کی میر سید محمد ساندوی نے اطلاع دی اور تحریر قطعہ تاریخ کے لیے استدعا کی۔ چنانچہ یہ تاریخ تولد ان کو لکھ کر بھیجدی گئی ؎

حق تعالیٰ بہ محمد روشن — پسرے داد سعادت میلاد
سال تاریخ چو جستم ز خرد — گفت از دو چشم پدر روشن باد
۱۱۳۴ھ

متعلق وفات

میر سید مبارک محدث بلگرامی ؎

مقدس گوہر میر سید مبارک — چو شد در بحر رحلت آشناه
پے رحلت آن مطہر سرشت — خرد گفت تاریخ رضوان پناه
۱۱۱۵ھ

سید عربی بلگرامی اور میر سید احمد بن سید بدہ بلگرامی نے ایک سال میں رحلت فرمائی دونو کی

تاریخ بھی ایک ہے ؎

میر سید احمد آن بحر سخا — مولوی سید مرلی دین پناہ
ہر دو زین گلخن سرائے بی بقا — جانب فردوس سر کردند راہ
عالم اندر دیدہا تاریک شد — مردمک پوشید زین ماتم سیاہ
تا قیامت از دل پرسوز خلق — بر مزار ہر دو سوزد شمع آہ
خواستم از بہرشان تاریخ سال — گفت ہاتف ہر دو خلد آرامگاہ ۱۱۱۷ھ

سید محمدی بلگرامی اور قاضی محمد حافظ بلگرامی کی مشترک تاریخ ؎

چون میر محمدی و قاضی حافظ — بردند بیک سال سوی جنت راہ
گفتند برضوان الٰہی واصل — ہاتف تاریخ گفت رضوان اللہ ۱۱۲۳ھ

بندگی سید محمد حسن بلگرامی۔ ایما تخلص۔ جوان نازک و نازنین تھے۔ دھول پور کی لڑائی میں جو عالمگیر کی رحلت پر شاہ عالم اور اعظم شاہ کے مابین ۲۰ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ (۱۰ جون ۱۷۰۷ء) کو ہوئی یہ شاہزادہ عظیم الشان بن شاہ عالم کے ساتھ تھے اور ان کے باپ سید محمد اشرف درگاہی شاہزادہ محمد اعظم کے لشکر شاہ عالم میں تھے۔ جب لڑائی سے فارغ ہو کر ۲۱ تاریخ کو سید محمد حسن قیامگاہ پر پہونچے۔ ہتھیار سب بدن پر سجے ہوئے تھے۔ گرمی اور تابش آفتاب اور حرارت موسم کی تاب نہ لا سکے۔ خیمہ پر آتے ہی رفقا سے کہا کہ سر سے ہتھیار اتار لو۔ اسباب و طاقت نہیں رہی ہے۔ سیدھے لیٹ گئے اور چراغ حیات گل ہو گیا۔ تجہیز و تکفین کر کے دھول پور کے دروازہ پر دفن کر دیا۔ جب آمد و رفت کے لئے راہ کھلی تو سید درگاہی لڑکے سے ملنے گئے۔ وہ جوان مرگ زیر خاک تھا۔ رنج و الم کیا۔ بے سود تھا۔ میر عبدالجلیل نے تاریخ رحلت آیۂ کریمہ اِنَّمَا اَشْكُوْا بَثِّيْ وَحُزْنِيْٓ اِلَى اللّٰهِ میں پائی (جو بیٹا تھی اور رنج مجکو ہے اسکی فریاد خدا ہی سے کرتا ہوں۔ جزو ۱۳ سورۂ یوسف ع ۱۰۔ ۱۱۲۰ھ) اور بدنصیب باپ کو آگے کر بھیجدی۔

اورنگ زیب بادشاہ کے تولد کی تاریخ کلیم کاشانی نے آفتاب عالم تاب سے نکالی تھی

جب بادشاہ تخت سلطنت پر چالیس سال کی عمر میں بیٹھا تو تاریخ جلوس خود "آفتاب عالمتاب" نکالی اور جب نوے سال کے سن میں رہگرائے عالم بقا ہوا تو میر عبدالجلیل نے تاریخ رحلت "رفت آفتاب عالمتاب" نکالی۔ فئے بفتح فا معنی سایہ زوال آفتاب ہے

اشتباہ ۔ اشتباہ

ریزہائے نبات والی بارش کی رباعی

فرخ سیر آن شہنشہ بابرکات — چرخ از داد بسا او شدہ شیرین حرکات
درسنہ یکہزار صد عشرت مہد شش — بارید سحاب ریزہ قند و نبات

کی نسبت نواب حاجی سید جعفر علی خان "خلاصۃ المفتاح" میں لکھتے ہیں "تعجب است کہ درین مصرع تاریخ ہم باشد چرا کہ اعداد مصرع ۱۱۲۳ھ می شوند" نواب صاحب ایک کہنہ مشق تاریخ گو تھے اس لیے ان کی نگاہ زود رس اس مصرع کی معنوی خوبی اور تاریخی احتمال پر پہونچ گئی لیکن کوتاہ بین سیرت نویس اس امر سے قطع نظر نہیں کر سکتا کہ واقعہ عہد فرخ سیر کا ہے جو خود ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا تھا اس لیے اس کا زمانہ ۱۱۲۵ھ یا ۱۱۲۶ھ ہونا چاہیے۔

قصیدہ فتح آگرہ

نکوسیر بن محمد اکبر بن عالمگیر قلعہ آگرہ میں محبوس تھا ۱۱۳۱ھ ۱۷۱۹ء میں جھنی خان قلعہ دار اور ہزاری متوسلین و دیگر واقعہ طلبان نے اسکو قلعہ سے نکال کر تخت پر بٹھا دیا تھا۔ امیر الامرا حسین علی خان دہلی سے لشکر جرار لے کر آگرہ پہونچا اور تین ماہ سے زائد محاصرہ کر کے رمضان میں قلعہ کو فتح کیا۔ میر عبدالجلیل نے اس پر یہ قصیدہ[36] لکھا۔ نواب پانچ ہزار روپیہ اور خلعت و اسپ اس کے صلہ میں باصرار دیتا رہا لیکن میر عبدالجلیل نے صلہ لینا کسی طرح گوارا نہ کیا۔

مژدہ اے ہندوستاں کہ در عالم — نقد شد نسیۂ بہار ارم

[36] نواب سید صدیق حسن خان نے بھی اس قصیدہ کا ذکر اپنے تذکرہ شمع انجمن مطبوعہ ۱۲۹۳ھ میں کیا ہے۔

نونهال طرب ببار آمد   گل فشان گشت خاطر خرم

دل خوشی نشاط را بخشید   هر گل و سبزه و بهار قسم

باغ از بس شگفتگی پر کرد   ساغر گل ز بادهٔ شبنم

ابر دامن کشان خرامان ست   برق رقصان و رعد گرم نغم

نوبهار از برای رسم نثار   هر طرف از شگوفه ریخت درم

که امیر سر آمد امرا   کرد تسخیر قلعهٔ اعظم

این ظفر از سواب عظمی است   بر زبان واجب است شکر نعم

پسر کیسر آنکه در افواه   یافت نیکو سیر بنام علم

بود در حصن آگره محبوس   تیغ مفهوم ممتنع لقب ادهم

داشت حصنی در کنج عافیتی   خانهٔ آسوده تر ز جمشید حرم

ناگهان نفس شوم راهش زد   خفیه آمیخت در طمعاش تم

دید اسباب نیکی آماده   اشتهادمات و قلعه پر زر دم

زر بسیار و ذخیرهٔ او باش   اکبر آباد و قلعه محکم

ابروی فتنه زد و نمود کمان   زاوی آشوب گشت فهم و درهم

از پدر واگشت ارشد پی زان   فتنه انگیخت در کمال عظم

کرد پرویز نی ز چتر به سر   بخت بر فرق خود غبار الم

چون برید این خبر به دهلی برد   مشعله زد خشم داور عالم

خسرو دین پناه شاه جهان   آب و رنگ بهار فضل و کرم

آن ابوالمجد والعلا ذوالجود   مسند آرای چار بالش جم

بنده اش کیقباد و کیکاوس   نوکرش گیو و بیژن و رستم

بخشی الملک را اجازت داد   تا کشد لشکر ظفر پیکر هم

آن امیر جهان عمدهٔ امرا — چون حسین علی شهیر به شیم
قرة العین حیدر کرار — نخبهٔ اشجع بنی آدم
خلف الصدق موتمن الاقبال — پیش او شیر شرزه کم ز غنم
جود او شهرهٔ دیار عرب — تیغ او ضابط بلاد عجم
ناز دارد نسبتش شمول نسب — بالد از همتش علو همم
می کند با جباه دل ریش — لطف او آنچه می کند مرهم
غوطه در جود او زند دریا — قطره را از دست او خورد شبنم
هست مقیاس جود او به سحاب — مثل مقیاس فربهی به ورم
در فن صرف همتش نبود — ذکری از لا و از لن و از لم
در صف جنگ با سر اعدا — چون الف گشته تیغ او از هم
دشنه و نیزه اش بجان عدو — می کند کار عقرب و ارقم
تیغ او شد به فرق اهل فرق — همچو حرفی که می شود مدغم
در دل خصم او در آید رمح — چون در آید الف به نون قلم
با کمندش سر عدوی او — مثل دلوی است با رسن توأم
ظفر از فوج او شود پیدا — فتح با تیغ او بود توأم
کرد نهضت به دولت از دهلی — و مثل حق همعنان ظفر همدم
لشکری در حساب بیش از حصر — دلو از صد هزار الف درهم
همه زور آوران فیل شکوه — که به شیر ژیان زنند لگم

۱۳۸ موتمن الاقبال بمعنی [illegible] پسر زید شیخ کا لقب ہے جو امیر الامرا حسین [illegible] خان کا [illegible] اور میر سید اسمٰعیل [illegible] (دا رح) دونوں کے عہد اعلیٰ تھے [illegible] کرنے والا۔ اقبال [illegible] شمس [illegible] آپ شعر کا [illegible] اکثر کیا کرتے تھے [illegible] مشہور ہیں۔

گرد اسپان فوج نصرت موج — دامن افشان برین بلند خیم

آمد و قلعه را محاصره کرد — همچو انگشت و حلقهٔ خاتم

شرح اسباب قلعه گیری رخت — شرمهٔ عجز در گلوے قلم

چون نهنگان به دور گرد لبے — توپ ها گرد قلعه‌ها جمع بهم

خصم را سوخت توپ شیر دهان — کس ندیده است شیر آتش دم

اژدها کے ست توپ غازی خان — که سر نهاده ان نمود لقم

چه توپ و نه توپ قلعه کشا — اسم او بر تلاشش دست علم

تا برآید به قلعهٔ نصرت — سینه گردید فوج را اسلم

هر طرف شد مرتب از ساباط[۵۳] — دخمهٔ بهر دشمنان دژم

زان طرف هم مخالف سرکش — کوششے داشت در ثبات قدم

دست و پا زد درون قلعه بسے — چون جنینے که واجهد به شکم

کرد اسقاط این جنین آخر — صدمهٔ توپ هاے مستحکم

کار بر اهل حصن شد دشوار — مرگ مقطوع و زندگی مبهم

قلعه شد بر حیات اعدا — از مصیبت چو حلقهٔ ماتم

شد برون آمدن چنان دشوار — که سخن از زبان اهل بکم

اندرون هم ره رسد شد بند — چون نفوذ صدا گوش اصم

از سر عجز خواستند امان — با لب خشک و دیدهٔ پر نم

از ترحم به جان امان بخشید — وقت قدرت خوش است ترک نقم

فتح قلعه بزور تیغ نمود — این چنین می کنند اهل همم

شد سپه طالعے ز قلعه برون — همچو از لفظ دائره آدم[۵۴]

۵۳ ساباط: پاٹا ہوا سقف جو دو دیواروں کے اوپر ہو اور نیچے ہو کر راہ چلتی ہو۔ یہی کا پوسا مراد ہے کلمہ انگریزی میں کاری ذرد ہے۔

۵۴ اس شعر میں اشارہ ادہم کے مشہور مصرعے کی طرف ہے کشید تنگ چنانش آن دہن بہ کنار کہ دور

این معمّٰی کشود فطرت او — ورنہ این عقدہ بود جذر اصم[۵۴]
شاد گشتند دوستان یکسر — عام شد عیش در صنوف امم
شرح حال منافقان گویم — کہ بر آن چون شدند نقد امم عقیم[۵۵]
سرخی انفعال روئے سیاہ — خوش خضابے است از حنا و کتم[۵۶]
نحمد اللہ واہب الآلاء — حمدنا مستظہر بنا النعم
کن کتھن کی سکت کہاں پاؤں — رسنان سے نئے جو اپنا حسم

دائرہ در مرکزش گرفت قرار یعنی دائرہ کا دور دال اور ہا ہیں اور اس کا مرکز ا میم اور ف ام ہے۔ جب دال اور ہا ادام کے اندر قرار پا جائیں تو ادہم ہو جائے گا۔ ادہم لغت میں سیاہ کو کہتے ہیں تو اس سے سیاہ طالع کا نکلنا گویا ادہم کا دائرہ سے نکلنا ہے تنگ ہونے کی رعایت سے تعلیم اور دائرہ میں تشبیہ لطیف پیدا ہو گئی ہے۔

۵۴ لغت میں جذر اصل کو کہتے ہیں۔ اہل حساب کی اصطلاح میں وہ عدد ہے جس کو اپنے دل میں مان کر ضرب دیا جائے ایسے عدد کو جذر کہتے ہیں اور اس کے حاصل ضرب کو مجذور۔ اصم لغوا نہایت بہرا یا بالکل بہرا سخت مصمت جس عدد کا جذر عدد صحیح نہ ہو وہ فن حساب کی اصطلاح میں اصم کہلاتا ہے مثلاً گیارہ اس کے مقابل کو منطق کہتے ہیں مثلاً نو عدد منطق کا جذر بسہولت تین جانا جاتا ہے چنانچہ نو کا جذر تین۔ عدد اصم کا جذر نہایت دشوار ہے عدد صحیح نہیں ہو سکتا مگر تقریباً بنا لیا جاتا ہے اسی لئے کسی نے اپنی مناجات میں کہا ہے
سُبحٰن من لا یعرف الجذر الاصم الا ہو

علم معقول میں جذر الاصم ایک مشہور مغالطہ ہے جس کا واضع ابن کمونہ بغدادی تھا۔ علامہ تفتازانی شرح مقاصد میں فرماتے ہیں وَهٰذِهِ مُغَالَطَةٌ تَحَيَّرَتْ فِيهَا عُقُولُ الْعُقَلَاءِ وَفُحُولُ الْأَذْكِيَاءِ وَيُسَمّٰى أَصْلُهَا بِمُغَالَطَةِ الْجَذْرِ الْأَصَمِّ علامہ ممدوح شرح مقاصد میں بعد تحریر جواب کے لکھتے ہیں لٰكِنَّ الصَّوَابَ عِنْدِي فِي هٰذِهِ الْقَضِيَّةِ تَرْكُ الْجَوَابِ وَالْاِعْتِرَافُ بِالْعَجْزِ عَنِ الْإِشْكَالِ۔

میر باقر داماد نے بھی اسی بحث کو افق المبین میں لکھا ہے اس کا اختصار یہ ہے کَمْ زَلَّتْ فِيهِ أَقْدَامُ الرَّائِينَ وَأَقْرَبُهُمْ إِلَى الصَّوَابِ وَإِصَابَةِ الْحَقِّ مَنِ اعْتَرَفَ مِنْهُمْ بِالْعَجْزِ۔ ظاہر تعریض سے میر باقر کی مراد علامہ تفتازانی معلوم ہوتے ہیں۔

پس شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اشکال و عدم انحلال میں یہ عقدہ (جذر اصم) کے مثل ہو رہا ہے خواہ علم حساب کا ہو خواہ علم معقول کا۔ تو شعر مستحکم اور سنگین ہونے کے اعتبار سے لفظ اصم (جس کے معنی سنگ سخت مصمت کے ہیں)

رمضان ارچہ بود بدلی بخشی فتح — کلید بود آن بناب الکی پرم
از پے ہم دو عید گشت پدید — معنی فطر جلوہ کرد اسم
ہر طرف مجلس طرب چیدند — آن یکے از شعر و دیگرے ز حکم
وان دگر از ترانہ رنگین — چنگ و طنبور کردہ با ہم ضم
نغمہ گویان فارسی زنشاط — کوک کردند زیر را با بم
نغمہ سنجان ہند سر کردند — [illegible] سپتک بم
نغمہ تا چاک دل رفو سازد — زہرہ از چنگ دارد ابریشم
زین ترنم جہان طرب آباد — زانکہ در چرخ ہر شش بود ترنم
[illegible] — انوری گشت پیش شان ابکم
[illegible] — [illegible]
[illegible] — گل [illegible] برق قلم
[illegible] — [illegible]

نہایت مناسب واقع ہوا ہے [illegible]

[illegible] حضرت [illegible] رسول اللہ صلعم [illegible] حضرت [illegible] عثمان کی [illegible] وفات پائی [illegible] کا اشارہ ہے [illegible]

[illegible] رمضان میں فتح ہوا تھا اس لیے دو عید یں بہم پیش آئیں پہلی عید فتح جس کو عید مجازی کہنا چاہیے — دوسری عید رمضان جو عید حقیقی ہے — اسی طرح لفظ فطر بھی معنی [illegible] میں جلوہ گر نظر آتا ہے یعنی روزہ کا کھولنا اور معنی مجازی میں [illegible] یعنی فتح — یہ بھی دروازہ کا کھولنا ہے۔

[illegible] ہندوستان کے اہل موسیقی نے آواز کے سات مرتبے قرار دئے ہیں جو سپتک کہلاتے ہیں [illegible] سات [illegible] آواز ہر مرتبہ کے لیے ایک نام مقرر کر رکھا ہے اور ہر نام کے [illegible] سے ایک [illegible] سرگم بنایا ہے اس شعر میں [illegible] مراد انہیں مراتب سات سے ہے

شعر گر فضل من نه پوشیدے — می بسدم در فن سخن قدم
گر بپرسی ز جامعیت من — میر خسرو دهد جواب نعم
کرد عبدالجلیل در تاریخ — "قلعهٔ آگره گرفت" رقم [۱۱۳۰ھ]
بر دعا بهتر است ختم سخن — که بہ آمین کنند پاک معلم ۱؎
چار چیزش نشاط افزا باد — تا بود سبزه در چمن خرم
دست زر پاش و تیغ اعدا کش — عمر ممدود و دولت ادوم

امواج الخیال

یہ مثنوی آپ نے اپنے وطن بلگرام کی تعریف میں عنفوان جوانی میں لکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں میر صاحب کے کلام مؤخر کے مقابلہ میں کمزور ہے۔ اس میں ایک طولانی باب موسیقی ہندی کے نام سے ہے جس میں تمام قواعد و اصول و فروع اس فن لطیف کے بیان کر دیے ہیں۔ یہ مثنوی طبع نہیں ہوئی اور کمیاب ہے ؎

آب و گل من که فیض عام است — از خطهٔ پاک بلگرام است
سبحان الله چه بلگرامے! — کوثر مے و آفتاب جامے
خاکش گل نوبهار عشق است — آبش مے بے خمار عشق است
از عشق سرشته ایزد پاک — از روز ازل خمیر این خاک
هر لاله که زین دیار روید — تخمه دل داغدار روید
هر گل که دمیده است زین خاک — خونین جگرے است پیرهن چاک
نرگس نه بود بصحن گلزار — منصور بر آمده است بر دار
گل با سنبل بهم دران خاک — آمیخته سلسلے نیست اک

۱؎ مُعلَم بالضم جس پر نشان کر دیا گیا ہو

خورشید ازان بهار نیرنگ   پژمرده گلی است باخته رنگ
سنبل به چمن بود بصد ناز   زنگی بچهٔ کمند انداز
از فیض هوای آن گلستان   سرسبز شود نفس چون ریحان
ز آتشکده سبزه می زند جوش   همچون خط یار از بناگوش
تا شد چمنش به دیده محسوس   شد پردهٔ چشم بال طاوس
تابش نه که عیش بارست   چون گرمی عشق سازگارست
گرمی آنجاست مایهٔ زیست   گویی که حرارت غریزیست
سرما چو در آن مقام آید   عنقای هوا بدام آید
هر دود که از جگر کند گل   افسرده شود چو شاخ سنبل
چون موسم برشگال آید   حسنش بحد کمال آید
جولان سحاب شوخ وطناز   چون خیل پری بود به پرواز
درویش هوا بسی نفس سوخت   تا خرقهٔ رقعه رقعه دوخت
در نشئهٔ ذکر جهر شد مست   تسبیح هزار دانه در دست
شاهنشهٔ یکه تاز برسات   ساغرکش نشئهٔ مباهات
نقاره نواز حشمت خویش   مشکین علم سحاب در پیش
از برق نموده تیغ خون ریز   وز ابر سیه سپر دلآویز
ترکش ز تقاطر بهارین   وز قوس قزح کمان نگین
تا گردی زمین به دست آرد   بر فوج خزان شکست آرد
باریدن ریزه ریزه باران   کرده ورق نشاط افشان
نقشی است ازین بهار مرغوب   ظل ممدود و ماء مسکوب
هر سو صنمی کرشمه پرداز   از نوک نگه جگر رفو ساز

تا پاے گشان کمند کاکل | سرمست نگاہ پر تغافل
تا در تتق حیا نشستہ | حق از مژہ بر نگاہ بستہ
صفہاے مژہ بہ ترکتازی | مشغول نبرد نیزہ بازی
قدّے و نہال جلوہ نوخیز | حُسنے و بہار غمزہ گل ریز
از چین جبین ناز تخمیر | در پاے نگاہ بستہ زنجیر
از وا شدن گل تبسم | در خون شفق طپیدہ انجم
از سینہ شان کہ خوش بہارست | پیشانی صبح داغدارست

فقراے دار السلام بلگرام کی مدح مین لکھتے ہین ؎

از فرقہ طالبان مولے | رنگینی بزم وصف اولے
وحدت نگہان کثرت آثار | از بادہ نفی غیر سرشار
اطوار وجود دیدہ یکرنگ | حیرت بنگاہ کردہ ہم سنگ
مینا شکنان بزم ہستی | مدہوش شراب حق پرستی
دل کردہ ز بہر یار خود فرش | اَلرَّحمٰنُ اسْتَوٰی عَلَی العَرْشِ
طے ساختہ وادی شریعت | جا کردہ بہ منزل حقیقت
وا کردہ نظر بہ حسن جاوید | از دیدہ سرمہ ساے توحید
سرگرم طواف کعبہ دل | قربانی نفس کردہ بسمل
تا یافتہ گنج کنت کنزا | دادہ دل و دین زکوٰۃ ازکے

فضلاے شہر کی توصیف مین فرماتے ہین ؎

دقت منشان نکتہ پرداز | در ہر سر کوچہ اش سخن ساز
بشگافتہ ہر یکے بہ تحقیق | از دقت نغز مغز تدقیق

ف۴۷ اَلرَّحمٰنُ عَلَی العَرشِ استَوٰی ۔ رحمٰن عرش پر براج رہا ہے (جزء ۱۶ سورہ طٰہٰ ع ۱۔۱۰) استواء اللہ علی العرش کا مسئلہ

برابروے خود نمودہ واجب — تنقیح اصول ابن حاجب
بر چشم شمردہ فرض چون دین — تلویح رموز حکمت العین
ابروے بیان شان رفیع است — مفتاح معانی بدیع است
ہر بحث کہ دل کند بصد غور — در حیز حل کشند فی الفور
از منطق شان خطا نفورست — تصدیق بہ حکم شان ضرورست
ہر فرد یگانۂ اماثل — شیرازۂ نسخۂ فضائل
دانائے حقیقت کیانی — اشراقی حکمت یمانی

مثنوی کدخدائی ارشاد خان

ارشاد خان نواب امین الدولہ سنبھلی وقائع خوان حضور فردوس آرامگاہ محمد شاہ کا بیٹا تھا۔ امین الدولہ کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میر صاحب کو جو اختصاص نواب سے بلحاظ تعلقات و خدمت ہونا چاہیئے تھا ظاہر ہے حق یہ ہے کہ میر صاحب نے حق محبت اور حق شاعری دونوں یہاں ادا کر دیئے ہیں۔ یہ مثنوی کمیاب ہے اسکے بعض اجزا میر غلام علی آزاد کے پاس تھے جو خزانۂ عامرہ سے نقل کیے جاتے ہیں۔

پان کی صفت میں بطریق ایہام ؎

بس سبزی است برگ پان نکوفال — زبان من بود در وصف آن لال

حمام کی تعریف میں ؎

عطا بخشی این حمام کن گوش — کنہ مرد برہنہ را گہر پوش
ببین در بیت رنگینش بہ انصاف — کہ دارد معنی بستہ و صاف

و اعتقاد مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں ہمیشہ سے مختلف فیہ چلا آتا ہے بعض اسکی تاویل کرتے اور استیلا یا قہر سے مراد لیتے ہیں بعض اسکو بلفظہا مانتے اور تسلیم کرتے ہیں پیروان مذاہب ائمہ کا عمل یہی ہے حضرت امام مالک کا قول مخصوصاً اس بارہ میں یاد رکھنے کے قابل ہے "الاستواء معقول والکیف مجہول والایمان بہ واجب والسؤال عنہ بدعۃ"

دل سنگین پر سوراخ اعدا / بجائے سنگ پا مستعمل آنجا
بہم فوارہ و حوض اندر شادان / برقص دانہ مروارید رقصان

(دانہ مروارید ایک نوع کا ناچ ہے جو ولایت کی لولیان ناچتی تھین) یہ اشعار بھی ملاحظہ ہون ع

بدولت پیش آوردند فیلے / چہ فیلے در تجمل بے بدیلے
لباس زر بر آن از بس رسا بود / سراپا در نظر کوہ طلا بود
عماری را بہ پشت او شکوہے / طلائی گنبدے بالائے کوہے
سوار فیل آن والا مکان شد / بہر جانب دو دستش زر فشان شد
کف نواب زر می ریخت پائین / دعا میرفت بالا با صد آئین
بگرد فیل جمعیت بہ انبوہ / چو شیران یلہ در دامن کوہ
ز فیلان علم پیش سواری / خرامان پے بہ پے ابر بہاری
بہ پشت فیل مرد نیزہ بردار / سماک رامح از گردون نمودار
صف فیلان پس لشکر بہ انبوہ / کہ پشت فوج را نہا بود بر کوہ

آتشبازی کی توصیف مین ع

ہوائی بسکہ زد از ہر طرف جوش / ہوا شد در عروسی بادلہ پوش
ولے تا چشم شب را روشنائی / ہوائی شد عجب میل طلائی
بیان چنبر و چرخی کنم چند / درین گرداب زرین شد نگہ بند
ز جنگ آتشین فیلان بہ تحریر / رقم بر یکدگر پیچید چو زنجیر
چنان گردید یک دیگر ستیزہ / کہ اجزائے بدن شد ریزہ ریزہ
بیک سو طرفہ دیوان ترش رو / مہیا بہر ہیجا چین بہ ابرو
نگاہ خشم از چشم آفت زہر / نہان در دیدہ شان گردش دہر
درین دیوان سرکش چون نظر کرد / رخ دیو سفید از سہم شد زرد

چنان دجّال زین دیوان رمیده   که در پس کوچهٔ محشر خزیده
بهم افروخت هر یک زآتش کین   تعجب بین بهم رجم شیاطین

دُلہن کی صفت مین سے

تتق از حجلهٔ زیبا گشادند   عروس شرمگین را جلوه دادند
چو صبح پاک دامن پاک تخمیر   حیا چون سرمه در چشمش وطن گیر
خموشی گوهر دُرج دهن بود   چو غنچه مجتمع هر عضو تن بود
چو داماد آن عروس شرمگین دید   بهندستان نگارستان چین دید
درِ گنجینهٔ اعزاز بکشاد   ز والا گوهری دل رونما داد
چو وقت آمد که آسایش نماید   درے از خرّمی برخود کشاید
بخلوت خانهٔ باهم درون شد   مپرس از حالت آنجا که چون شد
بعید است از بلاغت در نکوئی   که حرف پرده را بے پرده گوئی
خدا گفته است در قرآن نظر کن   بجائے جامعوهن باشروهن
همین باشد سخن از حسن تمهید   میان هر دو صحبت گوک گردید

[گوک بضم کاف کپڑے کے دو ٹکڑون کو باہم بخیہ سے سرسری پیوند کر دینا تاکہ سینے مین کم و زیادہ نہ ہونے پاسے اور سازون کو ہم آہنگ اور آوازون کو موافق بنا دینا "صحبت گوک گردید" یعنی موافق ہوئی چونکہ بخیہ بھی سوئی کے ڈالنے سے ہوتا ہے - اسلئے لفظ گوک یہان نہایت مناسب و برمحل واقع ہوا ہے -]

مثنوی طوئے محمد فرخ سیر بادشاہ

میر عبد الجلیل کی تمام مثنویات بلکہ تصنیفات مین یہ مثنوی سب سے بڑی اور ایک پوری کتاب ہے۔ منشی نولکشور کے مطبع لکھنؤ مین رجب سنہ ۱۲۹۹ھ یعنی جون سنہ ۱۸۸۲ع مین ۷۸ صفحات پر دو ستونی

سید عبدالجلیل بلگرامی" کے نام سے چھپی ہو اور بہ آسانی دستیاب ہوسکتی ہے۔ اگرچہ اُسکی کتابت و تصحیح کماینبغی نہین ہوئی تاہم اس مین اتنے اغلاط نظر نہین آتے جتنے اُس وقت کی اور مطبوعہ کتابون مین پائے جاتے ہین۔ حاشیہ پر حل لغات و مشکلات بخوبی ملکہ بافراط کر دیا گیا ہے جو کہین کہین غیر متعلق و بے محل معلوم ہوتا ہے خط معمولی ملکہ اچھا ہے۔ کاغذ بادامی بیشتی دبیا پرشاد معائن مدارس بدایون اس کی طبع و اشاعت کے محرک تھے

فرخ سیر بادشاہ کی شادی راجہ اجیت سنگھ راٹھور (پسر مہاراجہ جسونت سنگھ) مرزبان جودھ پور مارواڑ کی بیٹی کے ساتھ ۲۲ ذیحجہ ۱۱۲۷ھ (۸ دسمبر ۱۷۱۵ع) روز پنجشنبہ کو ہوئی تھی یہی آخری راجپوتنی تھی جو مغلی حرم سرا مین آئی۔ یہ قرابت جیسی عظیم الشان تھی ویسی ہی تزک و احتشام سے تقریب بھی انجام دی گئی۔ صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ " وزیر حسین علیخان نے اسباب شادی دختر کا حسب رسوم ہنود سرانجام کیا۔ اس شان و شوکت سے شادی ہوئی کہ ہند اور دکن مین کسی راجہ اور بادشاہ کے عہد مین نہ ہوئی تھی"

حاشیہ فرخ سیر کے ازدواج و اعقاب کے متعلق تفصیل کے ساتھ لکھنا تو اُسکے تاریخ نویس کا کام ہے لیکن سلسلہ تحریر مین اتنا بتا دینا ضروری سمجھتا ہون کہ فرخ سیر کی پہلی بیگم " فخر النسا" صبیہ سعادت خان تھی جس کے بطن سے تین بچے ہوئے تھے یعنی (۱) محمد فرخندہ سیر جہانگیر شاہ (۲) جہان مراد شاہ، صغر سنی مین والدین کو داغ مفارقت دے گئے (۳) بادشاہ بیگم جس کا عقد محمد شاہ سے ۹ صفر ۱۱۳۴ھ شنبہ کی رات مین ہوا اور ملکۃ الزمانی کے لقب سے شہرت پائی۔ فرخ سیر کے محل مین ایک پہاڑی راجہ کی لڑکی بھی تھی اُس سے نکاح ہونا پایا نہین جاتا وہ ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ع) مین محل سرای شاہی مین داخل ہوئی تھی۔ اُسکی نودہ پودہ بھی نہین بڑھی

ایک اور بات بھی میری نظر سے گذری ہے جس کو سپرد قلم کرتا ہون " شکار پور ضلع بلند شہر مین قصبہ کے شمال ایک نہایت قابل لحاظ عمارت " بارہ کھمبا" (دوازدہ ستون) کے نام سے مشہور ہے ستون سنگ سرخ کے ہین اور بیحد ضخیم اور بھاری ہین حتی کہ عامۃ الناس مین یہ خبر شائع و ذائع ہو کہ اسکی تعمیر غیر انسانی ذرائع سے ہوئی تھی۔ انگریز محققین لکھتے ہین کہ فی الواقع یہ ایک ناتکمل مقبرہ ہے جس کو ۱۷۱۹ع (۱۱۳۲ھ) کے قریب شہنشاہ فرخ سیر کے داماد سید فضل اللہ نے تعمیر کرانا شروع کیا تھا"

سرکاری گزیٹیر کے لکھنے والے اسکی صحت و تحقیق کے ذمہ دار ہین۔ مجھے اسکے باور کرنے مین تامل ہے فرخ سیر نے اپریل ۱۷۱۹ع (۱۱۳۱ھ) مین تینتیس سال کی عمر مین جان بحق تسلیم کی ۱۷۱۶ع مین اسکی عمر تیس سال کی رہی ہوگی فضل اللہ کی شادی کب ہوئی؟ شاہزادی کا نام کیا تھا۔؟ کس کے بطن سے تھی

شب پنجشنبہ ۲۲ ذی الحجہ ۱۱۲۶ھ کو بادشاہ حسن علی خان کے محل پر (نواب شایستہ خان کی حویلی یا بارہ دری میں) مع امرا و ارکان سلطنت کے آیا عقد نکاح پڑھایا"

تاریخ مارواڑ مصنفہ منشی مرادی داس میں دیا جاتا ہے کہ امیر الامرا سید حسین علی خان ابتدائی معاملات دختر اجیت سنگھ طے کر کے دکن کی جانب روانہ ہو گیا اور حسب قرارداد شہنشاہ کا ماموں شایستہ خان ۱۱ جمادی الاول ۱۱۲۶ھ (۶ مئی ۱۷۱۵ء) کو دہلی سے جودھپور اس لڑکی کے لانے کیلئے بھیجا گیا وہ ۵ شعبان ۱۱۲۶ھ (۵ ستمبر ۱۷۱۵ء) کو دارالسلطنت واپس پہونچا اور ۲۹ رمضان کو شادی ہوئی"

مجھے اس تاریخ کے صحیح ماننے میں تامل ہے۔ یہ مہینہ اور تاریخ ایسی اہم بالشان تقریب کے لئے مناسب نہیں ہوتا۔ یہ ممکن ہے کہ نکاح (اگر ہوا ہو تو) آنے کے ساتھ ہی اس تاریخ پر ہو گیا ہو اور مراسم شادی اور جشن شاہانہ ذی الحجہ میں انجام دئے گئے ہوں (جیسا کہ ریمان مترجم سیر المتاخرین لکھتا ہے) لیکن مثنوی سال و ماہ و یوم یا کسی واقعہ کا تعین کرنے سے قاصر ہے۔ وہ الفاظ و لغات اور مصطلحات کا ایسا گورکھ دھندا ہے جس سے کوئی بات نکالنا دشوار ہے۔ سخن شناس دقیقہ رس لطف سخن پا سکتے ہیں سامان جشن طرب کی رنگین بیانی کے سوا مثنوی نکاح یا کسی اور رسم شرعی ادا کرنے کا پتہ نہیں دیتی۔ میر عبدالجلیل نے اس لڑکی کو رانی کہکر یاد کیا ہے سیر المتاخرین میں بھی رانی لکھا ہے مورخین اسکا نام

برس کی عمر خسر بننے کیلئے کچھ نامناسب نہ تھی ... کا مقبرہ ہونا رہا تھا۔ یہ سب باتیں محتاج جواب اور قابل تحقیق ہیں۔

فٹ نوٹ ۱۹ سیر المتاخرین بارہویں صدی ہجری کی ہندوستان کے عہد اسلامی کی تاریخ ہے میر غلام حسین خان ولد میر ہدایت حسین خان طباطبائی حسنی کی تالیف ہے ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۷ء) سے لیکر ۱۱۹۵ھ (۱۷۸۱ء) تک کے حالات تحقیق و صحت کے ساتھ اس میں قلمبند کئے ہیں۔

اسکا ترجمہ اردو مرآۃ السلاطین کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ انگریزی ترجمہ ایک ہندی نژاد فرانسیسی ایم ریمان M. Raymond نے ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۹ء) میں کیا تھا جس نے مشرف بہ اسلام ہو کر حاجی مصطفیٰ نام اختیار کیا اور اسی نام سے شہرت پائی۔ دوسرا ترجمہ ۱۸۳۲ء میں لندن میں کرنل جان بگس Colonel John Biggs نے شائع کیا۔

میر غلام حسین خان میر غلام علی آزاد کا معاصر تھا۔ واقعات کے لکھنے میں ایجاز و اختصار سے کام لیتا ہے اور اپنی تحقیق و تلاش کے ماننے دوسرے کو نہیں مانتا۔

نوٹ ۵ صاحب مفتاح التواریخ نے مصرع سال ۱۰۲۸ھ (یکہزار و بست و ہشت) لکھا ہے اگر اس کو کتابت کی غلطی اور یہ سال کو ۱۱۲۸ مان لیا جاوے تو بھی خلاف قرینہ ہے کہ محرم کے مہینہ میں یہ جشن اندر درج منایا گیا ہو۔ میر غلام علی ... اور سید آزاد ... اس جشن طوے کا زمانہ ۱۱۲۶ھ لکھتے ہیں۔ اسکی تائید میر حسن، ایجاد تخلص، معالی خان خطاب مؤلف فرخ سیر نامہ کے نظم تاریخ سے ہوتی ہے۔

بائی اندر کنور بتاتے ہین۔ بدنصیب بائی کی مدّت عیش واطمینان نہایت تنگ تھی خود فرخ سیر کو فراغ وعافیت نصیب نہ رہی شادی کے ساڑھے تین سال بعد کچھ دن سخت اذیت کیساتھ اسیری مین کاٹکر اُس نے جان دی۔ فرخ سیر کی اس رانی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ راٹھور راجہ جسکی آمد ورفت بلکہ ایک حد تک بود وباش دہلی مین رہتی تھی اور جو آخر کار بعض مجبوریون یا مصالح سے داماد کے خلاف سازشون اور منصوبون مین سادات بارہہ کے شریک ہوگیا تھا لڑکی کو واپس لے گیا اور مراسم ضروریہ انجام دیکر اُسکو اپنے دہرم اور خاندان مین ملالیا جو دہپور چلے جانیکے بعد پتہ نہین ہے کہ رانی کا انجام کیا ہوا دوسری شادی ہوئی تھی یا نہین۔ اُسنے کب کہان اور کس عمر مین وفات پائی۔ یہ سب اُمور معرض خفا مین ہین۔ صاحب تواریخ مارواڑ نے بھی اس بارہ مین کچھ نہین لکھا صاحب سیر نے بھی اسی قدر لکھا کہ فرخ سیر کی وفات کے بعد اُسکے تمام اہالی وموالی کی جاگیرین ضبط کرلی گئین صرف رانی کی جاگیر اجیت سنگھ کی دلجوئی کے خیال سے بحال رہی۔

زباغ مہاراجہ جسونت سنگھ ۱۱۲۷ھ بشگوئے دولت بیا مد گلے

۱۵۲ رانی سنسکرت کا لفظ ہے اسکے معنی ملکہ کے ہین یعنی جو کسی راجہ یا بادشاہ کی زوجہ ہو۔ اس کا اطلاق شاہزادی پر بھی ہوتا ہے یہ امر قابل تحریر ہے کہ راجپوت شاہزادے جو مسلمان ہوجاتے تھے ایسے پُرانے ہندوانہ رسم ورواج پر قائم رہتے تھے حتی کہ اپنے ہی خاندان والون کے ساتھ کھاتے پیتے تھے۔ اپنے ہی خاندان مین شادی بیاہ کرتے اور اپنی بیویون کو خطاب بھی ہندوئن کے طریقہ پر دیتے تھے بہرحال رانی خالص ہندوانہ خطاب ہے

۱۵۳ موسیو رایمان ترجمہ سیر المتاخرین کے ذیل مین لکھتا ہے کہ راجہ اجیت سنگھ نے جو عوام الناس کی طعن وملامت تشنیع سے بہت بھاگتا تھا بارہا کوشش کی کہ اپنی خدمت صوبہ داری گجرات پر چلا جاسکے مگر اجازت نہین ملی اور چار وناچار شہر مین رہنا پڑا۔ اس جاہ طلب غیرت مند راجپوت نے اپنے داماد کے خلاف معاملات مین جو حصہ لیا تھا۔ اُسکو لوگ نہایت متنفر تھے اور آواز سے کہتے تھے۔

رایمان قسطنطنیہ کی پیدائش تھا۔ دس سال مکہ معظمہ مین رہا تھا۔ ہندوستان مین تربیت پائی تھی۔ سیر المتاخرین کے سوا تاریخ کشمیر وغیرہ متعدد کتابون کا ترجمہ کیا تھا۔ اس کو اپنا نئی خصائل کا اقتضا کہئے یا فطرت انسانی کا جذبہ کہ اُسنے راجہ کے ان اعمال کو نہایت کراہت وقباحت سے دیکھا اور تلخی سے یاد کیا ہے

اصل مثنوی مین بارہ سو چار [۱۲۰۴] شعر ہین اور خاتمہ مین بیان ہی اتفاقات سے مثنوی فرخ سیر کے روبرو پیش نہ ہوسکی تھی اس لیے اس خاتمہ مین ناظم نے اس واقعہ اور اپنے مافی الضمیر کو ظاہر کردیا ہے اور جو غیر واقع وناواجب شاعرانہ ستایش لوگون کی مثنوی مین لکھ گیا تھی اُس سے گریز واستغفار کیا ہے اور بارگاہ الٰہی مین آمرزش و مغفرت کی دعا کی ہے۔ فرخ سیر کی رحلت پر میر عبدالجلیل نے بددل ہوکر اس مثنوی کو الگ ڈال دیا تھا۔ وہ کہتے ہین کہ ؎

چہ گویم دل ازین بیداد چون شد ‏ ‏ ‏ ‏ برنگ غنچہ نشگفتہ خون شد
بہ دل دارم قرار عہد دیگر ‏ ‏ ‏ ‏ کہ این اوراق را سوزم سراسر

جلانے کی نوبت نہین آئی تھی کہ میر صاحب نے کچھ سوچ سمجھ کر رہنے دیا اور ؎

بساط عزم خود را در نوردید ‏ ‏ ‏ ‏ لفافۂ خود و القاب سخن دید

وہ اس کو صاف نہین کرنا چاہتے تھے حتی کہ وفات پائی۔ انکے انتقال کے بعد میر غلام علی آزاد نے اس مسودہ کو صاف و بیاض کیا اور حتی الوسع مشکل ابیات کو حل کرکے حواشی لکھے۔

یہ مثنوی بڑی ہے اور اس سے انتخاب کرنا مشکل۔ اس مین بہت سے لطائف و ظرائف مندرج ہین خصوصاً اُس مقام پر جہان ہندی راگون کے نام اور اُن کی کیفیت فارسی کے قالب مین ڈھالی گئی ہے۔ شاعر کے تصرف اور قدرت کلام و کمال کو دیکھ کر عقل سرگشتہ وحیران ہوجاتی ہے نہ صرف نغمہ اور سنگیت بلکہ اکثر علوم متعارفہ و فنون متداولہ اس شناور بحر سخن کے سامنے سیل دریا کی طرح بہتے نظر آتے ہین۔ مگر بدنصیب و بدمذاق نگارندۂ اوراق جو ان عجائب و غرائب سے خود افادہ نہین کرسکتا ان کو نقل کرکے قارئین تذکرہ کو بھی بے لطف و بدحظ کرنا نہین چاہتا۔ جہانتک کہ آمد کا تعلق ہے اکثر اشعار سلیس اور برجستہ ہین تمکنت و احتشام شاہانہ کے ساتھ ساتھ اپنی شوکت و شان کو بھی ہاتھ سے جانے نہین دیتے لیکن اسکے بعد صرف آورد اور عالمانہ مغلق ترکیبات و محاورات و اصطلاحات کی نمایش ہے۔ ایسی تخیل بندیون اور ادا شناسیون سے لطف اٹھانیوالے اس صدی مین ناپید ہین۔ ؎

مجکو جو اشعار پسند آئے ہین اُن مین سے بعض کو پیش کرتا ہون۔

تمہید مین فرماتے ہین ؎

نوید ملوے شاہ ہفت کشور ... جہان را نوبہارے بخشد دیگر
شہنشاہ سریر سرفرازی ... خدیو عصر فرخ شاہ غازی
معین الدین محمد شاہ جمجاہ ... شہ گیتی ستان فرخ سیر شاہ
طراز نوبہار پادشاہی ... وجودش مظہر ظل الٰہی
شہنشاہ کرم گستر گہر بخش ... بعاجز پرورے ہمپا بحر و بر بخش
جبلی خصلت این شاہ غازی ... عدالت پروری عاجز نوازی
رئیس راجہائے عمدۂ ہند ... کہ ملکش می کشد تا کشور سند
رشید دودمان نسل راٹھور ... کہ ممتاز است از اقران درین دور
مہاراجا اجیت الفاظ نامش ... بلفظ سنگہ می گردد تمامش
بگیتی مرزبان مارواڑ است ... کہ نوک نیزۂ او مار وار است
در آغاز جلوس شاہ والا ... نمود گونہ سرزد ز راجا
پئے تادیب او فوجی روان شد ... سم اسپان زمین انجم نشان شد
چو راجا لشکر نصرت اثر دید ... بساط ملک خود را بے سپر دید
بارسال جگر پرکالہ خویش ... توسل جست با شاہ ظفر کیش
پری پیکر بتے عصمت نقابے ... سپہر عفت را آفتابے
ز عصمت در حیا پیچیدہ خود را ... چو بودہ برگ گل فدیہ خود را
بدرگاہ جہانبانی روان کرد ... بصد عجز و ادب عرض امان کرد
شہنشہ خواند مضمون مبارک ... اجبر للمشرک ان ہو استجارک
تقبل کرد و راجہ را امان داد ... تو گوئی مردہ را بار جان داد

ازان پس از پے تشریف راجا　　　بہ مہمان خانہ دادآن شمع را جا
بہ ایمان آن صنم را آشنا کرد　　　گرہ از رشتہ زنار وا کرد
قرین شد از شہ نصرت مواطن　　　بہ حسن ظاہر او نور باطن
پس آنگہ شد پئے شان عروسی　　　بہ حکم شاہ سامان عروسی

اس کے بعد آرائش ساچق۔ وصف حنابندی۔ نور پاشی چراغان۔ پوشاک وجواہر تخت رواں، نقارخانہ۔ آتش بازی اور بہت سے مختلف عنوانون کے تحت مین میر نے داد سخن دی ہو۔ مگران تکلفات کا بیان کرنا تکلف سے خالی نہین۔

ناچ شروع ہو کر ختم ہوگیا۔ بزم افروزی رقص کنچنیان، کی تصویر کھینچنے اور اُن کے کمال کی داد دینے، اُن کی دلربائیون کا انداز دکہانے کیلئے زاہد خشک شاعر کا قلم عالم تصور اور عالم تخیل کی ایک محفل عیش وطرب مین گام زن رہا اُسنے بہت کچھ لکھا اور خوب لکھا ہو۔ گلگون قبا رنگین ادا، شاہدان دہلی وجودہ پورسے تقوی شکن انداز اور حیا سوز کرشمہ و ناز دکھائے ہین۔ مگر خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا۔ پوری داد سخن نہ دینے کا الزام مین اپنے سر لیتا ہون میر کی روح پاک اور یاد نیک سے مجھے شرم آتی ہو لیکن اظہار حقیقت سے مجبور ہون کہ مین اُنکی توصیفی تحریر تصویر کشی مین اصلی رنگ و روغن کی جھلک نہین پاتا۔ بحالیکہ ظہوری ترشیزی کے وصف رقاصان کے ان پانچ سادہ شعرون مین مستی اور نشاط کا ایک پورا عالم محسوس کر رہا ہون

بیا مطرب با پردہ ساز کن　　　طرب می رود بانگ آواز کن
غم و غصہ چون تارک بدسگال　　　ز رقص سہی قامتان پائمال
ز ہر سو دلے مبتلا می کنند　　　بخاطر فریبی جفا می کنند
کمرہا چو در پیچ و تاب آورند　　　چہ دلہا کہ در اضطراب آورند
بافشاندن دست مالند گوش　　　بہ برچیدن پائے دُزدند ہوش

ظہوری مختصر سی بزم طرب مین اپنی جادو نوائی سے سننے والون کو مسحور کر جاتا اور اُسکے حریم صبر

وقرار پر بجلیان گرا دیتا ہے۔ میر اپنے اظہار کمال، خیال بندی اور صورت کشی یا قلم کے ترکتاز کے لئے پانی پت کا میدان بھی تنگ پاتے، رعد کی طرح گرجتے اور صواعق برق کی طرح چمکتے ہین۔ بالآخر قوس قزح بنکر رہجاتے ہین۔

ظہوری کی بحر بھی جُدا ہے۔ بین دونون کا مقابلہ اور اُن کے انداز کلام کا موازنہ نہین کرنا چاہتا تھا شعر یاد آگئے تو لکھ دئے ہین۔ میر کے اسی رنگ کے چند مزہ دار شعر جن مین اُنھین خیالات کو موزون کیا ہے اب نقل کرتا ہون ؎

بہر عضوی طرب مستانہ رقصد ۔۔۔ چو جوش مے کہ در میخانہ رقصد
ز بستن جستن شان می جہد دل ۔۔۔ غم از پاکوبِ شان در رقص بسمل
بپا بر چیدن سرِ ناز پرور ۔۔۔ گزارد بے قراری پا بر اخگر
کمر در پیچ و تاب رقص بے تاب ۔۔۔ چو موئے کوفتہ در جوش گرداب
خرام عشوہ ہای شوخ و طناز ۔۔۔ چو موج مے بصید دل سبکتاز
چو شوخ چین آئینہ رقصد ۔۔۔ نگہ در چشم و دل در سینہ رقصد
ادائی گردش چشم فسون ساز ۔۔۔ بچرخ آوردہ دلہائے نظر باز

شرکائے صحبت گشت و گلگشت بزم عشرت سے سیر ہوگئے ہونگے اسلئے اب میر کی سنجیدہ ظرافت یا "ہنگامہ سازی ہزلان" سے اُن کی ضیافت طبع کردینا ناگزیر ہے ؎

ز ہزالان گروہے گرم بازی ۔۔۔ برقص طرفہ در دستان طرازی
عمامہ کردہ کج بر نوک ابرو ۔۔۔ زدہ پس خم چو ماہ نو بزانو
ز رقص شان کہ دارد از طرب بہر ۔۔۔ بہر سو ولولہ افتادہ در شہر
بجدا زبسکہ در ہزل اند ہر یک ۔۔۔ نماید صورت شان ہزل بیباک
برنگ کبک گہ قہقہہ بخندند ۔۔۔ ز قلقلہائے مینا شیشہ بندند
ز بزم افروزی شان گشت بیتاب ۔۔۔ بہار فرفرہ لبستان قلاب

؎ فرفرہ: چمڑے کی پھرکی۔

مُقلّد مشگان محفل طُوے — بانواعِ ظرافت قافیہ گوے
بہم کردند کوک از نغمہ و ساز — یکے تازہ یکے ناز و یکے باز
عمامہ بر سُرین شلوار بر سر — بیانگہ مقدم شد مؤخر

بادشاہ کے مشکوے عروسی میں پہونچنے اور وہاں کی رُوداد سے یون پردہ اٹھایا جاتا ہے ؎

شہنشہ در حرم تشریف فرمود — حرم از مقدمش شد عشرت آمود
پرستاران بگرد شاہ یکجا — زدہ حلقہ چو دُر در ہالۂ ماہ
ز عصمت ہر یکے را غازہ بر رو — ز عفّت مشک آگین چین گیسو
سخن چون در گلستان حرم شد — ادب اینجا عنان گیر قلم شد
کہ تفصیل سخن اینجا محال است — قلم نامحرم رودادِ حال است
خموشی از ادب بہتر ز گفتن — کہ این جا غنچگی بہ از شگفتن
کہ نشنیدند دیدند آئین مجلس از — بجز گوشش گل و چشم نرگس
رسوم مصحف و آئینہ بینی — بود معمول در حجلہ نشینی
رُخ شہ مصحف آیات نور است — دلش آئینۂ روے سرور است
دگر ہم ہر چہ رسم کدخدائیست — کہ آن شایان شان پادشائیست
بجا آورد شاہ ہفت کشور — بہار تہنیت شد جلوہ گستر

عروس، دولت خانہ شاہی میں اس شان سے لائی جاتی ہے ؎

شہنشہ شد روان با شوکت و شان — گہر باریدہ چون ابر نیسان
عقب تخت شہ چنڈول[۵۵۴] رانی — نگارین محمل بلقیس ثانی

---

۵۵۴ چنڈول - ہندی لفظ ہے حرفِ اوّل کے زبر و زیر دونوں طرح سے مستعمل ہے۔ جنگلی زیادہ تر چنڈول کہلاتا ہے جو پالکی
عربی فارسی مین مخفّف پالکی و ہر چہ رائج ہے یہ ایک بڑی ڈولی ہوتی ہے جس کے دونوں طرف چوبین پایانس لگائے جاتے ہیں

نہان در عروج عالی سپہرے | ببرج اعتلا رخشندہ مہرے
چو شد دولت سرائے شاہ پیدا | کہ دولت بر جمال اوست شیدا
فرود آمد بشان و شوکت و جاہ | برنگ آیۂ رحمت شہنشاہ

ولیمہ کا انتظام و اہتمام مطبخ ہمایون سے کیا جاتا ہے ؎

چو در زیر سپہر آبنوسی | ولیمہ سنت آمد در عروسی
بحکم شاہ پشیلانی کشیدند | چہ پشیلانی فراوانی کشیدند
چو لذت داد دل را شعلہ آتش | بقاول را مرحبا طباخ را شاباش

میر صاحب مثنوی کو اس دعا پر ختم کرتے ہین ؎

بیا عبد الجلیل بلگرامی | سخن را بر دعا بہتر تمامی
دعای شاہ دین پرور ادا کن | اجابت می شود ممنون دعا کن
ہمیشہ تا بود در ہفت کشور | عروس آمادۂ آغوش شوہر
عروس سلطنت با رونق و جاہ | بود دائم در آغوش شہنشاہ
کند از عیش و عشرت شادمانی | چو بلقیس و سلیمان کامرانی
بشاہنشاہ جہاں بادا گہر ریز | مبارکباد این طرفہ دلاویز
شہنشہ با عدالت کامران باد | جہان تا ہست دائم در جہان باد
بود تاریخ طوے شادمانی | نشاط اندوز وصل شادمانی

زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ دعا نامقبول ہوتی ہے۔ مداح و ممدوح از وجہ بگوئیم دونون ناکام اور مطرود رہ جاتے ہین۔ میر کی صلہ گیا اور مثنوی جب سامع شہنشاہی تک نہین پہونچنے پائی تو کار رائگان

اور کیونکر نہ پچھتاتے کہ ایسا [illegible] کیسی وقت اور اسراف طبع کے لیے صلہ کی امید سے کہہ اور سنا [illegible]

میر حسن دہلوی مثنوی بدر منیر میں فرماتے ہین ؎

چلے لے کے خدمت میں حسن رقم کا کار | کیا او [illegible] [illegible]

عالمِ بالا کی بارگاہ تک اُن کی دُعا کے پہونچنے اور اُنکے التفات و توجہ کی توقع کون کرسکتا تھا؟

اس میں شُبہ نہیں کہ "تجزیہ" کے زیرِ عنوان اور "خاتمہ" میں میر نے بے مثل لکھا ہے۔ اپنے واقعات و مکنونات خاطر کو نہایت سادگی اور سچائی اور دردمندی کے ساتھ ادا کردیا ہو۔ تجزیہ میں اپنی نسبت جو کچھ وہ لکھتے ہیں اُس کے وہ ضرور مستحق اور شایان ہیں۔

پروفیسر سید مسعود حسن صاحب کی ملوکات جمیلہ میں اس مثنوی کا بھی ایک نفیس قلمی نسخہ موجود ہے بروز چہار شنبہ ۱۱۷۱ھ میں بتاریخ ۱۶ رمضان المبارک (۲۴ مئی ۱۷۵۸ء) مولوی طالب حق نے اس کو بمقام لکھنؤ، لالہ رام نرائن کے دروازہ پر ختم کیا تھا۔ یہ بزرگ بیونڈی (ضلع کانپور) کے باشندے، زمینداری پیشہ، اصحابِ علم و اربابِ ادب خاندان سے تھے۔ خود مولوی صاحب اور ان کے والد مولوی محمد جان نثار نے متعدد تالیفات یادگار چھوڑی تھیں اور بہت سی مفید کتابیں نقل و کتابت فرمائی تھیں۔

بذلہ سنجی و ہزل سرائی

آغازِ شباب اور غالباً قیامِ آگرہ کے زمانہ میں ہزل گوئی بھی کی تھی۔ ایسے اشعار کا کہنا جو اقتضائے عمر و ولولۂ ذوق سے رہا ہو خواہ استجماعِ فنون کی نظر سے، بہرکیف اس رنگ میں بھی میر صاحب نے اُس دور کے مذاقِ طبائع کے اعتبار سے بعض نہایت لطیف اشعار کہہ ڈالے ہیں۔ اُن کا ترجیع بند مشہور ہے۔ مطلع یہ ہے ؎

منم آں بانکۂ دلبرِ داچل کز من فتاد در جہاں کھل بل

ترجیع بند کے آخر میں تخلص "اٹل[۵۵]" لکھا ہو۔ ممکن ہو کہ تحسین و تزئینِ شعر کی ضرورت یا قوافی کی کمیابی و ندرت کی وجہ سے اختیار کیا گیا ہو۔ یہ شعر بھی اُسی ترجیع بند کا ہے ؎

---

۵۵ میر جعفر زٹلی کے چھوٹے بھائی میر صفدر کا تخلص بھی اٹل تھا۔ عہد اورنگ زیب میں تھے۔ اٹل کی نظم و نثر کا نمونہ سوانح میر جعفر زٹلی (موسوم بہ زٹل نامہ جعفری مطبوعہ وکٹوریہ پریس لاہور ۱۹۱۰ء) میں ملے گا۔

شعر بارہ ہزاریان[56] دیدی ‌‌ ‌‌ کفشہ بلگرام را عشق است

بروایت آزاد یاران حرفت پیشہ نے اس شعر کو بدل کر کچھ کا کچھ بنا دیا تھا۔

یہ اشعار بھی آپ ہی کے نتائج طبع سے ہیں ؎

عدو گر ہمہ تن ز فولاد گردد ‌‌ ‌‌ ز سر تا قدم ہیچ زنجیر اگردد
بکلن گیتی[57] برق بے دھڑکہ پکڑد ‌‌ ‌‌ بجز حکم اللہ سپھے نہ اکرد

بعض تذکرہ نویسوں نے ہزل و ظرافت کو میر صاحب کے علو شان و زاہد مزاجی سے بعید سمجھ کر اس ترجیع بند اور اسی جنس کے دیگر اشعار کو اور شاعروں سے منسوب کیا ہے۔ چنانچہ نواب محمد مصطفٰے خان شیفتہ بھی اسی غلط فہمی کا شکار ہوئے اور اپنے مشہور تذکرۃ الشعراء موسوم بہ "گلشن بیخار"[57] میں لکھتے ہیں:

"اثل تخلص، سید عبد الجلیل نام، از سادات گرامی قدر شاہجہان آباد دہلی بودہ است۔ شاگرد معنوی جعفر زٹلی، و استاد در الظاہر ندیدہ۔ از وست ؎

زلف ہے چہرہ پہ یا جنجال ہے ‌‌ ‌‌ جنبش ابرو ہے یا بھونچال ہے"

نیز منشی گوکل پرشاد متخلص بہ رسا، اپنے انتخاب اشعار سراپا، موسوم بہ "ارمغان گوکل پرشاد"[58] کی فہرست شعرا میں ایک صاحب کا تذکرہ کرتے ہیں۔

"اثل"، میر عبد الجلیل دہلوی تخلص سے ظاہر ہے کہ کس مذاق کے انسان تھے۔ اس پر تماشا یہ کہ حضرت جعفر زٹلی کے شاگرد تھے۔ ان کے کلام میں یہی ایک شعر تین چار تذکروں میں درج پایا جاتا ہے۔ وہ شعر بہ ذیل "شانہ کشی عروس مضامین زلف"، صفحہ ۱۱ پر نقل کیا ہے ؎

زلف ہے چہرے پہ یا جنجال ہے ‌‌ ‌‌ جنبش ابرو ہے یا بھونچال ہے

---

[56] بارہ ہزار بلگرام کا ایک محلہ ہے۔ ‌‌ ‌‌ [57] مطبوعہ مطبع منشی نول کشور صفحہ ۱۶

[58] ارمغان گوکل پرشاد ۱۲۹۵ھ مطبوعہ مطبع مطلع نور منشی بہاری لال واقع کانپور ۱۸۸۲ء (۱۲۹۹ھ) صفحہ

میر عبد الجلیل بلگرامی کے اس قسم کے کلام کی نسبت میر غلام علی سرو آزاد مین یقین دلاتی ہین
کہ "بلا ریب زادہ فکر ایشان است"

شیفتہ اور اُن کے بعض متقدمین ، معاصرین یا متبعین نے میر عبد الجلیل کو دہلوی لکھا ہی اور رسا
وغیرہ دیگر تذکرہ نویسان متاخرین نے اُنھین سے نقل کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہی کہ میر عبد الجلیل بلگرامی کے
سوا اور کوئی صاحب شعرائے ظریف مزاج سے دہلی مین اس نام کے نہین گذرے ہین - ان کا قیام
بہ سلسلۂ ملازمت و رسائی دربار شاہی در فروغ و قدر افزائی امرائے عالی جاہ ایک مدت تک دار السلطنت
مین رہا تھا اس لیے ممکن ہی کہ وہ بھی دہلوی کہلائے یا مان لیے گئے ہون لیکن اس مین بھی شک نہین
کہ پرانے تذکرہ نگار اپنی تحریرات مین اتنی احتیاط نہین برتتے تھے جتنی کسی ذمہ دار لکھنے والے کو
لازم تھی - وہ لفاظی و انشا پردازی ، مبالغہ و ثنا خوانی مین اس درجہ محو و مستغرق ہو جاتے تھے کہ صحت
روایت اور تحقیق و تنقید سے دور پڑ جاتے تھے -

میرے خیال مین میر صاحب کے معتقدین و دلہ ربایان کو اس بارہ مین کسی گریز یا معذرت کی
ضرورت نہین ہی بعض مشاہیر شعرا اور اہل علم مین بھی ہاجی و ہرزہ سرا گذرے ہین - اس مین ہندوستان[۵۹]

---

۵۹ میر عبد الجلیل کے حقیقی خالہ زاد بھائی سید قریش بلگرامی ، عجیب تخلص کرتے تھے منقبت اہل بیت مین ان کا
کلام مشہور ہی - اس سے کبھی فرصت پاتے یا کوئی صحبت ساز گار ہو جاتی ، تو دل بہلانے کیلیے کچھ ہزل بھی کہہ ڈالتے تھے - فارسی
و ہندی آمیز اشعار زیادہ لکھتے - اُن کا ایک شعر یادگار رہیگا - اندھے کا اگر گرز لم بہمند ؛ شلیہ ہفت آسمان ٹپ جائے
اتفاق وقت ہے کہ یہی مضمون صادق بھی آیا قضائے الٰہی نے کار فرمائی کی - احمد آباد گجرات مین سنہ ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) مین
گھوڑے پر لیے سوار ہوے کہ گر دیکھی نہ آتی تھی - ملیٹ کر آتا اور کنارہ بھی نہ چلا وفاقہ قضی الدہن کا ابد واقع
ایک اور صاحب ، صاحب فراز تخلص ، میر امام علی نام ، سادات صفویہ بلگرام سے نہایت فحش اور ہزل
کہنے والے تھے سنہ ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۳ء) مین وفات پائی - ان کو ناظر صاحب نے اپنی تاریخ مین ہجو گو اور مسخرہ
کے نام سے یاد کیا ہے -

Maunder's Biographical Treasury.

۵۹ یا ایران کی تخصیص و قید نہین ۔ اگر میر نے اپنی قوت سخن فہمی اور بذلہ گوئی کو خواہ عنفوان جوانی دجوانی کہ یادت بخیر !!) خواہ کہولت و پیرانہ سالی مین نمایان کیا ہو تو بھی اس سے ان کی شان کمال پر حرف نہین آسکتا، وہ بالغ قلم جو اداخر عمر اور کہن سالگی مین ہنگامہ سازی ہزالان "کے عنوان سے ان کے کارنامے بیان کرنے اور اُن کی گرم بازاری دکہانے کی قدرت رکھتا ہو، جو اُسکے ادائے کمال اور جوہر فن کی نسبت یہ کہہ رہا ہو کہ ؎

به نظم آرند در هر صنع مهمل | بمفتاح طرب فصل مطول
مدار الدهر ترديج المباهي | مشار الشهر تشريح الملاهي

اُسکے لیئے چند سادہ و عامیانہ اشعار کا موزون کردینا کیا دشوار ہوگا۔ عرب کے مشہور شاعر و فلسفی جاحظ کا قول ہے کہ "مضمون بازاریون تک کو سوجھتے ہین جو کچھ فرق اور امتیاز ہے لطف ادا و بندش کا ہے۔"

میر صاحب کی تمام تصانیف اور تحریرات مین ایک فقرہ یا شعر بھی ہجو یہ نہین ملے گا۔ وہ اس سے نہایت احتیاط و اجتناب کرتے تھے۔ کسی کی بدگوئی یا کلمات رکیک و اہانت سے زبان قلم کو آشنا نہ کرتے۔

---

۶۰ ملا نورالدین محمد ترخان نوری۔ قاسم کاہی۔ عبید زاکانی۔ خاقانی شروانی۔ ابو العلی گنجوی۔ رشید وطواط۔ شفائی اصفہانی وغیرہ بلند پایہ کے نامور حکیم و عالم، ناثر و ناظم گذرے ہیں۔ ان کے دیوانوں کا جائزہ لیا جائے تو حد سے زیادہ ہزل کا پلہ بھاری ملے گا۔

ہندی شاعری

پورب خصوصاً اودھ کی رسیلی سرزمین کو اہلِ روایت طلسم زارالفت بتاتے اور اس کے سینہ پر عشق و محبت کے بڑے بڑے کارنامے منقوش پاتے ہیں اسی موسیقی نواز و جنوں آفریں مٹی سے میر عبدالجلیل کا خمیر تھا۔ حسن اتفاق سے جس دور اور جس طبقہ میں انھوں نے آنکھیں کھولی تھیں اسکے روح و رواں (۱) سید نظام الدین المتخلص بہ مدھنایک[۹۶۱] (۲) دیوان سید رحمت اللہ بزرگان بلگرام[۹۶۲] (۳) بلبھدر برہمن عمارہ بلگرام (۴) چنتامن[۹۶۴] (۵) مَتِ رام[۹۶۵] (۶) بھوکھن[۹۶۶] باشندگان کوڑا جہان آباد تھے جنکی ہندی شاعری اور بھاشا میں کمال کا شہرہ اطراف و نواحی میں پھیلا ہوا تھا اور جنکی صحبت سے میر نے فیض اُٹھایا تھا (۷) مُلّا محمود جونپوری[۹۶۷] اور (۸) شیخ شاہ محمد فرملی بلگرامی[۹۶۸] کی ہندی میں نکتہ سنجی اور جنوں نوازی کی یاد تازہ و باقی تھی۔

---

[۹۶۱] سنہ ۱۰۹۹ھ (سنہ ۱۶۸۸ء) میں وفات پائی۔ ناد چندر کا اور مدھنایک سنگار دو کتابوں کے مصنف تھے۔ سنسکرت و بھاشا بنارس میں پڑھی تھی۔ ہندی موسیقی کے علم ناد و تال اور سنگیت میں یکتا تھے۔ مہارت عظیم حاصل تھی۔ اس فن کے محققین بھی ان کے شاگرد ہونے پر مفتخر اور اُن کے کمال کے معترف ہیں۔ سندر نام ایک عورت پر عاشق ہوئے اور اُسی کے ہو رہے۔ نواب کمال الدین خاں رئیس شاہ آباد ان کا معتقد اور قدر شناس و خدمتگزار تھا۔ راگ میگھ میں ان کی کرامت زبان زد عوام و حسنید بر خواص تھی۔

[۹۶۲] جاجمئو و بیسواڑہ کے حاکم تھے۔ خیر اندیش خاں عالمگیری اور عبدالصمد خاں اور دیگر اُمرا کے یہاں اُنکی بڑی عزت تھی۔ جاگیر وافر رکھتے تھے۔ اہل فن و کمال کو بہت دیتے تھے۔ چنتامن صاحب کبت بچارہ سے انکا مناظرہ اور بالآخر اُس کا دیوان کے کمالات کا اعتراف کرنا صفحات تاریخ پر یادگار رہیگا۔ پورن رس انکا دیوان موجود ہے سنہ ۱۱۱۸ھ (سنہ ۱۷۰۶ء) میں رحلت فرمائی۔

[۹۶۳] بلگرام کے رئیس اور صاحب کمال تھے۔ نوَرس سنگار ایک کتاب شیخ الاسلام شیخ اڈہن بلگرامی کے نام پر لکھی اور اُس کا نام صوفی ست رکھا۔

[۹۶۴] چنتامن یا چنتامنی، ایک قنوجی برہمن رتناکر ترپاٹھی کا بیٹا، سنسکرت کا بڑا عالم اور ہندی

اسی خاک بلگرام سے شیخ عنایت اللہ کا پتلا بنا تھا جو اعجوبۂ زمانہ اور نادرۂ یگانہ تھے جملہ فنون السنۂ عربی و فارسی و ہندی میں انکو قدرت عظیم حاصل تھی۔ ایک شیخ ابوالوقت کے مرید و خلیفہ تھے تصفیۂ قلب و تزکیۂ باطن و تہذیب اخلاق انتہا تک پہونچا دی تھی۔ سنسکرت اور بھاشا اور موسیقی ہندی میں کمال رکھتے تھے باایں ہمہ زندگی کا کچھ عجیب و غریب طرز تھا۔ نہایت تڑکے صبح کو اٹھتے اور کچھ دیر تک نغمات ہندی سے شغل کرتے اسکے بعد تہیۂ نماز فجر فرماتے تھے۔ لباس فاخرہ پہنکر اور اسلحہ بدن پر سجاکر متوجہ نماز ہو جاتے اور ارکان نماز بخضوع و خشوع تمام ادا کرتے

مبارک علی جن کے دوہے چھوٹی چھوٹی بحروں کے اب تک مشہور و زبان زد ہیں اسی بلگرام کے باشندے تھے ۱۵۸۳ء میں اسی جگہ پیدا ہوئے تھے۔

میر عبدالجلیل کی فطری موزونی طبع جو عربی و فارسی میں کوس لمن الملکی بجارہی تھی ہندی میں بھی چمکتی

کا بڑا کوی (شاعر) تھا۔ شاہ شجاع بن شاہجہاں بادشاہ کی سرکار میں عزت و وقار سے بسر کرتا تھا۔ خود جہاں پناہ تک بھی رسائی تھی۔ اسکی متعدد تصانیف ہیں۔ ایک کبت بچار ہے۔ فن عروض میں چھند بچار خوب لکھی ہے۔
سال ولادت ۱۶۱۳ء (۱۶۷۲ بکرمی سمبت) اور وفات ۱۷۱۵ء ہے۔
یہ ان چاروں بھائیوں میں سب سے بڑا تھا۔ (جو حقیقی نہ تھے)

۵۶۵ متی رام اور بھوشن کی نسبت ماہرین فن لکھتے ہیں کہ اپنے بڑے بھائی چنتامنی اور چھوٹے بھائی نیل کنٹھ (جٹا شنکر) سے بھی زیادہ باکمال اور قادرالکلام تھے۔ متی رام ۱۶۸۲ء میں فوت ہوا۔
متی رام ابتداءً راجہ راؤ بھاؤ سنگھ (والی بوندی) کا درباری شاعر اور حاشیہ نشین بسبا طِ امارت تھا۔ اصل علم بدائع و معانی میں ایک کتاب للت للام لکھکر راجہ کو پیش کی تھی۔ اس میں حتی الوسع مثالیہ اشعار اپنے ہی طبعزاد درج کئے تھے اور زیادہ تر ایسے ہی اشعار تھے جن سے راجہ کی مدح و ثنا نکلتی تھی۔ اس کے تتبع و تقلید میں دیو دت نے ۱۷۰۰ء میں للت للا تحریر کی۔

بوندی سے تعلق قطع ہوا تو متی رام نے راجہ شمبھو ناتھ سلطانی سے توسل پیدا کیا۔ اس کی فرمایش سے کتاب چھند سار سنگرہ تصنیف کی جو فن عروض میں بڑی عزت و استناد کی نظر سے دیکھی جاتی ہے۔ رس راج خالص عاشقانہ شاعری ہے اور اسکی بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔ متی رام کی ست سئی بھی کافی شہرت رکھتی ہے۔

۵۶۶ بھوشن کو سناطر رزم و بزم دونوں کے بیان کرنے میں یکساں قدرت حاصل تھی۔ ہندوستان کے مختلف راجگان و روسا کے یہاں رہا تھا اسکی قدردانی خصوصیت کے ساتھ شیواجی مرہٹہ اور چھتر سال راجہ (بوندیل کھنڈ) نے کی اسنے

اور اپنا علم بلند کرنے لگی۔ دکھانے لگی کہ آہنگِ حجازی اور ترانۂ عراقی سے انکا نغمۂ ہندی دبکر نہیں رہ سکتا یعنی آفرینی و نازک خیالی میں سحر طرازان عجاز اور افسوں خوانان پارس سے جادو نوایان ہند کسی طرح کم نہیں ہوتے ان کا حسن "ناپیکا بھید" انہیں کی ایجاد اور تنہا انہیں کا حصہ اور انکی زندہ کرامت ہے۔ میر عبدالجلیل سے جب فرمایش کی جاتی تھی یا خود انکا دل چاہتا تھا تو بھاشا میں بھی کہہ دیتے تھے چنانچہ خود فرماتے ہیں ؎

شعر گر فضل من نہ پوشیدے | می شدم در فنِ سخن اقدم
گر بپرسی ز جامعیتِ من | میرِ خسرو دہد جواب نعم

بھی انکو اپنے فیض کلام سے غیر فانی بنا دیا اور بے مثل قصائد و محامد لکھے ہیں۔ شیواجی کے کارنامے شیوراج بھوشن میں نظم کئے ہیں۔ شیوا باونی، چھتر سال دشک بھی بڑے پایہ کی نظمیں ہیں بھوشن کی زبان بھاشا ہے مگر عربی فارسی کے الفاظ بھی موقع محل سے آجاتے ہیں۔

مصنف ہندی نورتن کا بیان ہے کہ بھوشن کی پیدایش ۱۶۳۵ء میں ہوئی تھی۔ انتقال ۱۷۱۵ء (سمبت ۱۷۷۲) میں ہوا۔ بعض تذکرہ نویس سال ولادت ۱۶۱۳ء (سمبت ۱۶۷۰) لکھتے ہیں۔

۶۷ میر غلام علی بلگرامی، سرو آزاد (تذکرہ دیوان سید رحمت اللہ) میں ان بھائیوں کا مسکن کوڑا جہان آباد لکھتے ہیں جو ضلع فتحپور میں ایک مشہور اور قدیم قصبہ ہے۔ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ باکمال ٹکمان پور یا ٹکوان پور کے رہنے والے تھے جو ضلع کانپور میں گھاٹم پور کے جنوب جمنا کنارے واقع ہے اور جو اس وقت ترپی وکرم پور کہلاتا تھا۔ ان دونوں مقامات کا فاصلہ چنداں زیادہ نہیں۔ ممکن ہے کہ اس وقت ٹکوان پور متعلق کوڑا جہان آباد کے رہا ہو یا باعتبار قرب و شہرت ایسا لکھا گیا ہو کیونکہ عہد اورنگ زیب میں گھاٹم پور متعلق حویلی سرکار کوڑہ کے تھا۔

۶۸ ملا محمود۔ فاروقی شیخ تھے۔ علمائے اشراقیین اور حکمائے مشائین کی بہترین یادگار اور یگانۂ روزگار تھے سترہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو کر تصنیفات شروع کر دیں۔ حکمت میں شمس بازغہ اور فن بلاغت میں فرائد تحریر کی تھی۔ مدۃ العمر کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے رجوع یا انکار کرنا پڑا ہو۔ جب کوئی سائل مسئلہ پوچھتا اگر دل حاضر ہوتا تو جواب دیدیتے تھے ورنہ کہدیتے کہ اس وقت خاطر متوجہ جواب نہیں شاہجہاں کو صدر ہندی کی جانب راغب کیا تھا لیکن وزرا نے مہم بلخ کے درپیش ہونیکی وجہ سے اس تجویز کو ملتوی کرادیا

اُس دَور کے بعض امرا کو بھی ہندی بھاکھا کی شاعری کے ساتھ التزام خاص تھا۔ میرزا فقیر اللہ مخاطب بہ سیف خاں بدخشی، صوبہ دار الہ آباد تھا۔ عہد عالمگیری میں صوبہ دار کشمیر بھی رہا تھا۔ سہرند سے ایک منزل پر سیف آباد اُسی کا آباد کیا ہوا ہے۔ سیف خاں جوہر قابل رکھتا تھا اور قابل دوست تھا۔ فنِ موسیقی و رقص ہندی میں راگ درپن فارسی زبان میں اُسکی تالیف ہے۔

امیر الامرا حسین علی خاں کے دربار میں میر عبد الجلیل جایا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ عالم شاعر کے کبتوں کا تذکرہ ہونے لگا تو نواب صاحب سُنکر نہایت محظوظ ہوئے اور میر سے فرمایا کہ عالم کے کبت ہمارے لئے فراہم کرا دیجئے۔ ان کے زمانہ کے شرفا میں شعر و شاعری کا عموماً چرچا رہتا تھا خواہ کسی زبان کی ہو۔ ہر

کچھ روز بعد ظاہر ہوا کہ جس زمین پر ملا محمود نے رصد لگانا تجویز کیا تھا اسی جگہ کو حکمائے پیشین میں سے کسی نے رصد کے لئے پسند و اختیار کیا تھا۔ امیر الامرا شائستہ خاں اور شاہ شجاع انکے شاگرد تھے۔ فنِ نایکا بھید میں بھی انکا ایک مختصر رسالہ فارسی زبان میں ہے اور نہایت مستند ہے۔ اس فن میں اہل ہند نے باعتبار ادا، و انداز، و درجات عمر، و مراتب اُلفت و بے اُلفتی وغیر ذالک معشوقہ کو کئی قسم میں تقسیم اور ہر ایک کے لئے ایک نام معین کیا ہے اور اسی مناسبت سے ہر قسم کے اشعار آبدار نظم کئے ہیں۔ ملا کا رسالہ فارسی میں ہے انکو مثال کے لئے فارسی اشعار (جو کہ عموماً امارد کے حلیہ و شان میں ہوتے ہیں) عورتوں کے متعلق نہیں ملے اس لئے رسالہ مثالیہ اشعار سے خالی و معریٰ رہ گیا۔ ملا نے ۱۰۶۲ھ (۱۶۵۲ء) میں انتقال کیا۔

۹۶۹ شیخ شاہ محمد اکبر بادشاہ کے عہد میں صاحب ثروت و اقتدار تھے۔ حصار دریری تپہ دار کی حکومت سپرد تھی دریری ایک محال یا پرگنہ صوبہ و سرکار ملتان میں تھا۔ محال چندوارہ سرکار جانپانیر صوبہ گجرات میں تھا۔ شکار کو گئے تھے کہ کسی گاؤں میں ایک صاحب جمال لڑکی کے تیر نگاہ کے شکار ہو گئے۔ وہ بھی بڑی شوخ اور حاضر جواب تھی۔ اُسکی ذہانت اور فی البدیہہ جوابات پر شیخ صاحب مفتوں ہو گئے اور اپنے گھوڑے پر سوار کر کے لے کر چلے گئے۔ گھر لاکر تربیت کی۔ نظم ہندی میں وہ شیخ سے بھی فائق اور رسائی اور لطافت ظرافت اور بدیہہ گوئی میں یکتا تھی۔ دونوں کی نکتہ سنجی اور پر لطف گفتگو (یدبیضا میں) دیکھکر ان کے قدرت کلام سے حیرت ہو جاتی ہے۔

۹۷۰ کبت یا سیکھ نظم کی ایک خاص صنعت ہے جسمیں دو مصرعے ہوتے ہیں۔ زبان برج بھاکھا ہوتی ہے جو متھرا اور بندرابن اور گوالیار اور قرب و جوار میں بولی جاتی ہے۔

۹۷۱ عالم، اصل میں برہمن تھا جو کسی مسلمان رنگریزن پر جو خود بھی شاعرہ تھی عاشق ہو کر مسلمان ہو گیا تھا

ہر لکھے پڑھے خاندان میں کچھ نہ کچھ اس کا ذخیرہ ملجاتا تھا۔ میر عبد الجلیل اور ان کے قرابت داروں کے گھر بھی اس سے خالی نہ تھے۔ نواب صاحب کے لئے میر کو یہ سوغات اپنے وطن سے منگانا پڑتی ایک موقع پر میر سید محمد کو لکھتے ہیں کہ "ہر قدر کبت شگفتہ عالم و سکھ نکھ ہر دو پیکے اند بیش از بنس مصر و دواکر و پسران گھسیٹے و دیگر مردم بہم رسد بخط ہندی نویسانیدہ یک جزء، دو جزء، ہر چہ میسر آید زود لیفہ سپتند و در خط ہندی تحریف کم است و ہندی را کہ بفارسی نویسند، در خواندن تحریف بسیار واقع می شود اما ہندی خوشخط باشد بخط رکیک نبود۔ دریں باب تاکید دانند"۔

یہ مصر و داکر، ہر بنس برہمن کے بیٹے اور بلگرام کے معزز اور خوشحال لوگوں میں تھے۔ سنسکرت و بھاشا میں ان کی قابلیت و جامعیت مسلم اور مشہور تھی۔ میر عبد الجلیل نے ان کو بار بار لکھکر دہلی بلایا اور سید حسین علی خاں امیر الامرا کے یہاں ملازم کرا دیا تھا۔ یہ نواب کے ندیم و مصاحب خاص تھے۔ میر کے مرثیہ میں ایک دوہہ انھوں نے لکھا اور بیان واقعہ عالم پر آشکار کر دیا تھا ؎

نہ ہوا تھے آو ہوئے گا ایسو کین سوشیل　　جیسو احمد نند جگ ہوے گیو میر جلیل

یہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ جب اس دوہہ کے اعداد کا شمار کیا گیا تو بلا تخرجہ و تعمیہ تاریخ نکل آئی، خیال رہے کہ ۲۳۔ ربیع الآخر ۱۱۳۸ھ کو میر عبد الجلیل نے وفات پائی تھی۔

اور اُس سے عقد کر لیا تھا۔ ایک لڑکا جہان نامی اس دور مسرت و عیش کا یادگار تھا۔ عالم نے اپنی محبوبہ منکوحہ کی وفات میں دردناک مرثیہ لکھا ہے۔ اس کی نسبت ہندی شعرا لکھتے ہیں کہ 'بِرہ میں ٹکسالی چھند ہے بشاہزادہ معظم شاہ کا ملتزم خدمت تھا اس کا کلام نہایت دلکش ہے۔
مسٹر بیل اورینٹل بیاگرفی کل ڈکشنری میں لکھتے ہیں کہ ہندوستان کے فن موسیقی میں شیخ عالم نے مادھو انل' یا 'مادھو نایک' نام ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ نام اُس ماہر فن موسیقی سے منسوب ہے جس نے اس کو سب سے پہلے ہندی میں لکھا تھا۔
۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں انتقال کیا۔
۵۲ سرو آزاد میں 'سکھ نکھ' ہر جگہ لکھا ہے۔ جو قوام فطرت انسانی اور ترکیب جسمانی کے لحاظ سے بالکل درست معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ اُس وقت شرفا میں اسی طرح مستعمل ہو۔ مگر آج کل عموماً ترتیب الفاظ بالعکس 'نکھ سکھ' بتائی جاتی ہے۔ جس سے ہندوستان کے عامۃ الناس 'نکھ سے سکھ تک' اور خواص 'نکھ سے سکھ تک' یعنی ناخن پا سے لیکر موئے سر تک مراد لیتے ہیں۔ 'نکھ' لغتہً و عرفاً ناخن اور 'سکھ' سر کی چوٹی کے بال کہلاتے ہیں۔

حال میں رسالہ زمانہ (کانپور) کے کسی مضمون نویس نے جہاں پدماوت کے تمام تراجم و اشاعت کا ذکر کیا تھا، وہاں یہ بھی لکھا تھا کہ "حسین الدین غزنوی نے فارسی میں ۱۶۶۱ء (۱۰۷۲ھ) میں اورنگ زیب عالمگیر کے نام پر "حسن و عشق" لکھکر اپنا زورِ قلم دکھایا تھا۔ بعد ازاں ضیاء الدین عبرت دہلوی اور اُن کے استاد عشرت نے فارسی سے اُردو میں نقل کیا۔ پھر میر عبدالجلیل نے بھی یہ طبع آزمائی کی اور اخیر میں کسی شخص ابراہیم نامی نے پشتو میں نقل کیا۔" میر عبدالجلیل کی طبع آزمائی کی نوعیت اس مقالہ نگار نے نہیں لکھی ہے۔ میر فارسی اور ہندی دونوں میں قدرت تام رکھتے تھے۔ نظم و نثر دونوں اُن کے قلم کے سامنے سر جھکائے ہوئی تھیں۔ لیکن اس سوال سے قطع نظر کرکے یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ میر عبدالجلیل کے تمام علمی کارناموں کا بیان میر غلام علی آزاد وغیرہ اُن کے خاص اعزہ نے جہاں کیا ہے وہاں اُنکی پدماوت کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ تذکرہ یدِ بیضا میر کی رحلت کے بعد قریب تر زمانہ میں لکھا گیا تھا اُسکی تالیف کا مقصدِ اصلی محض میر کے نام کا احیاء اور اُنکی علمی و ادبی خدمات کا ابقاء تھا۔ قرینِ قیاس نہیں ہے کہ آزاد کو ترجمہ پدماوت کا علم ہو۔ صاحب البیت ادریٰ بما فیہ۔ اور اگر تھا تو تذکرہ سے کیوں متروک ہوگیا۔ معہذا کسی اور معاصر یا قریب العہد مورخ نے بھی ذکر نہیں کیا ہے۔ دو سو برس کے بعد اگر کوئی اہلِ قلم اس واقعہ کو لکھتا ہے تو اُس کو اپنے ذرائعِ علم اور اُن کے اسناد کا حوالہ دینا چاہیے۔

میر کی منظومات میں سے "شکھ نکھ" بھیردیں کے وزن میں ہے۔ اس گلدستہ کے چند پھول پیش کئے جاتے ہیں۔

अलह नाम पोथी पर लिख पहिं भाय । الہ نام پوتھی پر لکھ اپنہ بھائی
ज्यों जड़ाय को टीको भाल सुहाय ॥ جیوں جڑائی کو ٹیکو بھال سُہائی

مجازاً حلیہ یا وہ کلام جس میں محبوب کے جملہ اعضا و جوارح کی ناخن پا سے لیکر موئے سر تک مختلف تشبیہات و تلمیحات کے ساتھ تعریف کی جائے۔
اسی کو فارسی زبان میں "سراپا" کہتے ہیں یعنی تمام و کمال کیونکہ اس میں تمام اندامہائے معشوق کا اول سے آخر تک وصف بیان کیا جاتا ہے۔

اللہ کا نام کتاب پر اس غرض سے لکھا جاتا ہے جیسے خوبصورت عورت کی جبین پر جھومر زیب دیتا ہے۔

کیس پاس کی پھانسی پھانسو لوگ   केश पाश की फाँसी फाँसो लोग ।
ایک شیام تم اوپر الک سنجوگ   एक श्याम तुम ऊपर अलक संजोग ॥

زلف کے دام میں لوگ پھنستے ہیں۔ ایک تم سانولے ہو اوپر سے زلفیں کالی ہیں۔

پھلواری گھونگھٹ کی باتیں جات   फुलवारी घूँघट कै जातैं जात ।
سمن باس بن چھائیں نہیں سہات   सुमन बास बिन छाहीं नहीं सुहात ॥

نقاب ڈال کر باغ میں اس لئے جاتے ہیں کہ بغیر سایہ کے خوشبو کا لطف نہیں ہوتا۔

واکپول نرمل تین درپن ہار   वाकपोल निर्मल तें दर्पन हार ।
پت انت جھوٹھے کے مکھ پر چھار   पत अंत झूँठे के मुख पर छार ॥

اس کے عارض شفاف سے آئینہ ہار مان گیا۔ جھوٹے کے منہ پر آخر خاک ڈالی جاتی ہے۔

وا تل دیکھ تریّن باڑھت جوت   वा तिल देखि तरैयन बाढ़त जोत ।
دنت چیکنوں دیکھے ہلست کوت   दंत चीकनो देखे हुलसत कोत ॥

اس کے خال کے دیکھنے سے تاروں کی روشنی افزوں ہوتی ہے (ہندوؤں میں رواج ہے کہ بزرگوں کی روح کو آرام دینے کی غرض سے تل اور پانی دیتے ہیں) اور دانتوں کی چمک سے کوت یعنی بتیسیں کھل جاتی ہیں۔

ناخن جھلک مہندی سنگ لیوت چھب چھین   नखन झलक मेंहदी सँगहीं छब छीन ।
چنّی لال تر جیسیں ڈاک نوین   चुनीलाल तर जैसे डाक नवीन ॥

ناخنوں پر مہندی کا رنگ یوں کھل رہا ہے گویا سرخ یاقوت کے نیچے ڈاک لگی ہے۔

بھاوتا ہے کر تر کو تکو نجات   भाव जानि के अब कों कहो न जात ।
کنول کلی لو مہندی کتا یہ بات   कँवल कली लौं मुँदी कहौं यह बात ॥

ناف کے مقام کا حال بیان میں نہیں آ سکتا۔ گویا کملوں (نیلوفر) کی کلی بند ہو گئی ہے

बेनी पीठ छोड़ि निरख भलो लौं कीन । — بینی پیٹھ ڈول نرکھ بھلو جو کین

लांबी लचकी बातन मन हरि लीन ॥ — لانبی لچکی باتن من ہر لین

معشوق کی چوٹی سے ادا اسکی پشت نے سُتھری ہو کر لمبی چوٹی باتوں سے دل لے لیا (پیٹھ چوڑی اور چوٹی لمبی)

जुगुल जंघ सों मो मन अटक्यो जाय । — جگل جنگھ سو مو من اٹکو جائے

अंत बाँधियत गहले कहीं न काय ॥ — انت باندھیت گہلے کہیں نہ کائے

دونوں ساقوں میں میرا دل اٹک گیا (مصرعۂ ثانی کو بعض سخن فہم مہمل بتاتے ہیں کم از کم صحیح پڑھا نہیں جاتا اور نہ کوئی معنی سمجھ میں آتے ہیں)

कँवल साँझ मूँदत नहिं कोष सिकोर । — کنول سانجھ موندت نہیں کوش سکور

वा चरनन को वन्दत अञ्जलि जोर ॥ — وا چرنن کو بندت انجل جور

کنول شام کو اپنا جسم سکوڑ کر بند نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر اسکے قدموں کی پرستش کرتا ہے

फुलवारी जग में सबै सींचत लै लै बास । — پھلواری جگ میں سبے سینچت لی لی باس

सूखे रूख पलास को रितु बसंत की आस ॥ — سوکھے رُوکھ پلاس کو رِت بسنت کی آس

لوگ خوشبو لیکر باغ کی آبپاشی کرتے ہیں۔ خشک ڈھاک کو صرف موسم بہار کی امید رہتی ہے

रजनी सजनी पीय सँग पावस रूप बिहात । — رجنی سجنی پیو سنگ پاوس روپ بہات

अब प्रीतम बिछुरे भई पौष पखे की भाँत ॥ — اب پریتم بچھڑے بھئی پاوس پکھ کی بھانت

یار کے ساتھ رات جلد گذر جاتی ہے ہجر میں وہی رات کاٹے نہیں کٹتی۔

सो नासा की डाह सों कीर लगी जिय चोंच । — تو ناسا کی ڈاہ کی کیر لگی جیو چونچ

माहुर खूँटो नित करे कहे देस है सोच ॥ — ماہر کھونٹو نت کرے کہے دیس ہے سوچ

تیری ناک کے حسد سے طوطا زخمی ہو گیا ہے اسکی چونچ علامت ظاہر کر رہی ہے کہ وہ ہمیشہ زہر گھونٹا کرتا ہے

پیاری تیرے چرن کی کہوں کہاں لو بھید ।
چھِن بچھرت جاکے پرے جھاواں چھاتی چھید ॥

...ारी तेरे चरन के कहू कहाँ लौ भेद ।
...न बिछुरत जाके परे झावाँ छाती छेद ॥

تمہارے پاؤں کا کیا بیان کروں جس کی ایک لمحہ کی جدائی سے جھانواں کے سینہ میں چھید ہو جاتے ہیں (جھانواں جس سے پاؤں صاف کیا جاتا ہے)

یہ اشعار سروآزاد سے لئے گئے ہیں - ان کے فارسی جامہ کو ہٹا کر بھاشا کے اصلی قالب میں دکھانیکے لئے مجھے دشواری اٹھانا پڑی ہے جن ماہرین نے مدد فرمائی انکا منت گزار ہوں میر غلام علی نے کچھ ایسے شعر بھی نقل کئے ہیں جو نستعلیق خط میں ہونیکی وجہ سے صحیح نہیں پڑھے جاتے اور وزن و معنی سے بیگانہ نظر آتے ہیں

لکھوکپوت واکریواں اکتھ ابھرام ہوئی اتیت کرڈاری سیری اسیام
سنگھ ناتھ جبو موری دہوں کیا کھوئی کری لاک جہاں تجھ پر یوہت تہاں ہوئی

کم نصیب محرر سطور سے جو ایسے لطیف فن سے بھی بے بہرہ ہے قدیم بھاشا کے متعدد و قدرشناس حضرات نے میر جلیل کی ہندی شاعری کی تحسین و ستایش کی ہے اہل ذوق کی زبان پر انکا کلام ابتک باقی ہے اسکی قبولیت عام کی شہادت یہ کیا کم ہے کہ صوبہ متوسط میں جسکو ہندی بھاشا کے ادب و شعر کا گہوارہ کہنا چاہیئے کسی وقت اسکے بعض اجزا مدارس سرکاری کی نصاب میں داخل تھے (پاٹھ پستک چوتھی مؤلفہ مسٹر ہری گوپال پادھیا بی-اے- جو ۱۸۸۴ء سے ۱۸۹۰ء تک جاری رہی) شیو سنگھ سروج وغیرہ بعض مطبوعہ کتابوں میں بھی اسکے منتخبات موجود ہیں اس دور کے لحاظ سے انکا معیار بہت بلند پایا جاتا ہے اور ان میں حق شناسی و خداپرستی کا حقیقی جلوہ دکھایا گیا ہے

میر جلیل کی کویتا - بروے چھند

صورت آئے گئی تمھری اس جیے جان
سوامی مور بڑ سمرت جیے ہر کہان
سبہینہ النگ تیں من ہٹ تمھری اور
ارج کری سن لیجئے تن کر کور ۔۱
تنک دیا کے چتیئے مور بچاؤ
جل اوپر چیونٹی کو تنکئی ناؤ
بلگرام کر باسی میر جلیل
تمھری شرن گہ گاڑھے سے ندھ شیل ۔۲

मीर जलील की कविता—बरवै छन्द

सुरति आय गई तुम्हरी अस जिय जान ।
स्वामि मोर बड़ समरथ जिय हरखान ॥
सबहिं अलँगतें मन हठि तुमरी ओर ।
अरज करहिं सुन लीजहि तनि करि कोर ॥ १
तनिक कृपा के चितये मोर बचाव ।
जल ऊपर चींटी को तिनुकइ नाव ॥
बिलगराम कर बासी मीर जलील ।
तुम्हरी शरण गहि गाढ़े से निधिशील ॥ २

ظرافت و حاضر جوابی

میر عبدالجلیل سے کسی بے تکلف ہندو دوست نے کہا "آپ صاحبوں کا قول ہے کہ لَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ کِتَابٍ مُّبِیْنٍ ○ (تر و خشک کتاب واضح میں لکھے ہوئے ہیں۔ جزء ۷ سورۃ الانعام ع ۷۔ پ ۱۳) بھلا یہ تو فرمائیے کہ اس میں کانَ کا بھی کچھ ذکر ہے؟" [کانَ بفتح آخر۔ ہنود کے ایک بڑے اوتار اور معظم مقتدا کا نام ہے] میر صاحب نے فرمایا کہ "ہاں ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ وَکَانَ مِنَ الْکَافِرِیْنَ ○ [اور نا فرمان بن بیٹھا۔ جزء اول سورۂ بقرہ۔ ع ۴۔ ۷]

سبحۃ المرجان میں میر غلام علی آزاد نے اس واقعہ کو صنعت ابو قلمون کے ذیل میں تحریر کیا ہے بندۂ راقم کو اندیشہ ہے کہ اس زمانہ (بیسویں صدی مسیحی) کی رفتار اور انسانی طبائع کی افتاد دیکھ کر یہ سوال و جواب نا شائستہ اور قابل اعتراض نہ سمجھا جائے۔ اس لیئے یہ نظر انداز نہ کیجیئے گا کہ آج سے ڈھائی سو برس پہلے اہل ہند کا سچا اخلاق، باہمی ارتباط و اختلاط اس ڈھنگ کا نہ تھا۔ اُس وقت کے ہندو اور مسلمان کسی متعصبانہ رنگ میں رنگے ہوئے نہ تھے۔ نہ ایک دوسرے پر مذہبی طعن یا چوٹیں کرتے تھے۔ یہ اُن کے غایت خلوص اور بے تکلفی کا تقاضا تھا کہ جو کچھ زبان پر آجاتا تھا اُسکو سادگی سے کہہ ڈالتے تھے۔ دونوں میں سے کوئی برا نہیں مانتا تھا اور نہ بدنیتی (و بدمذاقی) پر محمول کرتا تھا۔

مجھے اپنے بارے میں کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔ میری حیثیت محض جامع احوال و اقوال کی ہے مستند کتابوں میں میر عبدالجلیل بلگرامی کی زندگی کے کسی پہلو کے متعلق کوئی بھی واقعہ اچھا یا برا جو کچھ نظر پڑجاتا ہے اُسکو نقل کر دیتا ہوں میں اپنی خدمت کی بجا آوری پر مامور اور اسلئے مجبور ہوں۔ قارئین معظم مجاز ہیں کہ میر عبدالجلیل اور اُن کے ہندو دوست کی نسبت جو رائے چاہیں قائم فرمائیں۔

معاصرین، انکی رائیں اور دلچسپ صحبتیں

بلگرام کی علمی مجلسوں کی روداد بیان کرنے کی اس مختصر تذکرہ میں گنجائش نہیں۔ وہاں علم بھی تھا فضل بھی، فقر بھی۔ اہل علم بھی تھے، صاحبان کمال بھی۔ میر عبدالجلیل کی بے تکلفانہ نشست و برخاست اور ہر وقت کا ساتھ انہیں ارباب کرامت و شفقت سے تھا۔ وہاں کی بزم سخن میں شمع کمال پر ہر طرف سے پروانے تصدق و نثار ہوتے رہتے تھے۔ جہت و صنف کی کوئی قید نہ تھی فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ (ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر بزرگی دی۔ جز ۳، سورۃ البقرۃ ع ۱-۳۳) میرا ایمان ہے لیکن میر سید مبارک محدث، میر طفیل محمد، سید اویس، میر نعمت اللہ سجادہ نشین شاہ طیب، ان کے صاحبزادے شاہ لسین (خلیفہ مخدوم محمد رکن الدین خیرآبادی)، سید عبدالنبی (خلیفہ میر سید محمد کالپوی) مولوی سید مرتضی، میر سید لطف اللہ المعروف بہ شاہ لدھا، میر عظمت اللہ بیخبر، سید نور اللہ، سید محمدی (معتقد علیہ شاہ عالم بادشاہ) اولیائے کامل میں سے کس کو ایک دوسرے پر ترجیح دی جائے۔ اس لئے ان عزیزان یگانہ کو چھوڑ کر ع بودہ ہمیشہ باہم پیشہ دشمن کے مقولہ پر اعتماد کرکے دوسرے رخ یعنی اغیار و بیگانہ کی طرف توجہ کروں گا ع

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ

(۱) سراج الدین علی خان آرزو اکبرآبادی جب ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں گوالیار سے دہلی آئے تو انکے اخراجات کے لئے سرکار بادشاہی اور دیگر امرا کے یہاں سے وظائف مقرر ہوگئے۔ اس وقت

بڑے نامور شاعر اور صاحب کمال اس صدی میں گذرے ہیں۔ ایک تذکرہ شعرائے فارسی و ہندستانی و دکنی کا مجمع النفائس نام نہایت مکمل مستند اور عمدہ انتخابات کلام کے ساتھ ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۱ء) میں لکھا تھا اس میں اساتذہ کو نہایت خلوص و خوبی سے دو جگہ یاد کیا ہے۔ خان آرزو اکبرآباد میں ۱۱۰۱ھ (۱۶۸۹ء) میں متولد ہوئے تھے ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ (۲۶ جنوری ۱۷۵۶ء) کو لکھنؤ میں وفات پائی۔ خان آرزو کی ملاقات شیخ

سے لیکر میر عبدالجلیل کی وفات ۱۱۳۸ھ (۱۷۲۵ء) تک دونوں کی بڑی پرلطف صحبت رہی دونوں ایک دوسرے کے کمال و کلام کی داد دیتے تھے۔ پھر آرزو اودھ چلے گئے۔ وہاں میر عبدالجلیل کے نواسے میر محمد یوسف بلگرامی سے تین بار ملاقات ہوئی۔ میر صاحب کے علاوہ شناسائی سے وہ دہلی میں بھی دوبارہ آرزو سے مل چکے تھے۔ آرزو فیض آباد میں اُن سے بڑی محبت و تکریم سے پیش آئے اور اپنے یہاں مہمان رکھا۔ میر غلام علی آزاد لکھتے ہیں کہ "سرو آزاد" لکھتے وقت آرزو سے میں نے اُنکا تذکرہ منگایا تو انھوں نے کمال اخلاق سے وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْہَا پر عمل فرماکر اپنے احوال و اشعار لکھ بھیجے۔ اور یہ بھی اضافہ کیا کہ "فقیر بخدمت میر عبدالجلیل مرحوم بلگرامی مکرر مستفید شدہ و صحبت شعر اتفاق افتاد۔ حالا بادۂ ارتباط دو آتشہ شد و گل دوستی رنگ گشت"

(۲) خواجہ عبدالباسط دہلوی سے "کتاب بہجۃ الابرار" منگائی اور خواجہ صاحب کی کرامت کا ذکر "حسن طلب" ۵۲ کے عنوان سے ہو چکا ہے۔

(۳) سید علی معصوم مدنی مصنف "انوار الربیع فی انواع البدیع" سے اورنگ آباد دکن میں ملاقات کا اتفاق ہوا تھا۔ اُن کا قول تھا واللہ ما رأیت ھذا السید بالھند نظیرا لہا الفائق

علی حزیں سے دہلی میں ۱۱۴۶ھ (۱۷۳۴ء) میں ہوئی تھی۔ شیخ تازہ وارد تھے۔ خان نے ان کی غلطیاں پکڑیں اور تنبیہ الغافلین لکھ ڈالی۔ اسکے سوا بہت عطیۂ کبریٰ، سراج اللغات، چراغ ہدایت، غرائب اللغات وغیرہ بہت سی مستند مجموعہ کتابیں لکھی ہیں۔

۵۲ جزو خامس۔ سورۃ النساء ع ۱۱۔ "اور جب دعا دے تم کو کوئی دعا تو تم بھی دعا دو اس سے بہتر کے ساتھ" اس آیت کے ذیل میں افادہ و افاضۂ عام کے لئے ایک بات قابل تحریر ہے کہ امام بخاری الادب المفرد میں لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد ہے کہ ہر شخص کے سلام کا جواب اسی طرح دینا چاہئے جس طرح وہ تم کو سلام کرتا ہے خواہ وہ شخص یہودی ہو یا عیسائی یا آتش پرست۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے کہ وَاِذَا حُیِّیْتُمْ بِتَحِیَّۃٍ فَحَیُّوْا بِاَحْسَنَ مِنْہَا اَوْ رُدُّوْہَا یعنی جب کوئی شخص تم کو سلام کرے تو اس سے زیادہ اچھے طور پر جواب دو ورنہ اسی کے طور پر تو ضرور دو یا یہ کہ حضرت عبداللہ کا دوسرا ایک قول بھی ذیل میں منقول ہے لو قال لی فرعون بارک اللہ فیک قلت وفیک اگر مجھ کو فرعون بھی کہے کہ خدا تجھکو برکت دے تب بھی میں اسکو کہونگا کہ تجھکو بھی (خدا برکت دے)

فی خصائل الادب غصنا نضیرا۔ ایک دوسرے موقع پر فرمایا تھا کہ "من در تمام عمر خود جامع غرائب علوم مثل میر عبدالجلیل نہ دیدم"۔

(۴) مرزا محمد علی خاں متین کشمیری نے بھی اپنے تذکرہ حیات الشعرا[۵۷۵] میں میر عبدالجلیل کا ذکر کیا ہے۔ اسوقت ان کا تخلص "میر جلیل" تھا۔

متین نے ایک روایت میر عبدالجلیل کی طرف منسوب کرکے لکھی ہے جسکی میر غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں تغلیط کرتے اور لکھتے ہیں کہ میر محمد زماں راسخ (پدر میر معصوم وحدان تخلص مخاطب بہ عالی نسب خاں) نے یہ شعر کہا تھا ؎

دلبرے یافتم و گوشۂ خلوت رفتم　　　　رفتم شمع بہ اندازۂ کاشانۂ خویش

اسپر بعض طباع شعرا نے ایراد کیا۔ میر راسخ آزردہ ہوکر محمد اعظم شاہ کے لشکر سے چلے آئے اور یہی شعر انکی نوکری اور رہنت صدری منصب چھوڑنے کا باعث ہوا۔ آزاد نے یہ واقعہ شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری سے سنا تھا اور شاہ صاحب نے آقا رضائی المتخلص بہ مشہور لاہوری کی زبان سے

(۵) میر محمد مراد متخلص بہ لائق جونپوری عنفوان جوانی میں مرزا صائب[۵۷۶] کی ملاقات کے شوق میں

---

۵۷۵ اس تذکرہ میں خلد منزل بہادر شاہ کے عہد سے لیکر فردوس آرامگاہ محمد شاہ کے زمانہ تک کے شعرا کے حالات ہیں

۵۷۶ مرزا محمد علی صائب تبریزی کے باپ عباس آباد اصفہان کے رہنے والے تھے۔ مرزا نے اصفہان میں نشوونما پائی تھی حرمین محترمین و دیگر مقامات متبرکہ کی زیارت کرکے وطن واپس چلے آئے تھے۔ بڑے درویش اور عالی منش انسان کامل تھے۔ باوجود سنی مذہب ہونے کے اہل ایران میں مقبول و عزیز رہے۔ کمال احترام و وقار سے بسر کی۔

جہانگیر کے آخر عہد مگر اپنے شباب میں تاجرانہ ہندوستان آئے۔ ظفر خاں ناظم کابل سے بڑے مراسم ہوگئے۔ جو خود امیر کبیر تھا۔ شاہجہاں کے زمانہ میں وہ ہندوستان آیا تو مرزا کو ساتھ لایا۔ مرزا کے پدر گرامی قدر بھی ان کو وطن واپس لے جانے کے لئے ہندوستان آئے۔ یہاں پدر کی ہجراں کیش یعقوب کی آنکھوں نے دور افتادہ یوسف کے دیدار سے روشنی پائی۔ تاہم کچھ تو ظفر خاں کے خلوص وارتباط اور کچھ شوق گلگشت کشمیر نے مجبور کیا۔ کشمیر سے مرزا کو اصفہان جانے کی اجازت ملی۔ بادشاہ ایران شاہ عباس صفوی نے قدردانی کی ملک الشعرا بنایا۔ ہندوستان کی یاد وطن میں بھی باقی رہی جن امرا سے یہاں رسم و راہ ہوگئی تھی ان سے سلسلہ رسل و رسائل قائم رکھا اور جو کچھ مقدر تھا

ہندوستان سے اصفہان کو پا پیادہ گئے۔ ایک زمانہ تک اُنکی خدمت میں رہے اور خوب مستفید ہو کر آئے تھے۔ اس خیال سے کہ لائق نے محض اُن سے ملنے کے لئے اسقدر تکلیف و تعب سفر برداشت کیا تھا مرزا صاحب بھی بڑی مدارات و دلجوئی سے پیش آئے۔ اپنی مجلس میں جگہ دی تھی۔ ان کے اشعار کو بھی بہت پسند کرتے اور تحسین فرماتے۔ میر مراد اورنگ زیب عالمگیر کی پیشگاہ سے مدت تک دار السلطنت لاہور کی سوانح نگاری پر سرفراز رہے تھے۔ میر عبدالجلیل سے بیحد ربط و رسم رکھتے تھے، انہیں کے اشارہ سے اپنا خمسہ نظم کیا تھا۔ مخزن اسرار کے مقابلہ میں جو مثنوی لکھی ہے اُسکے خاتمہ میں میر صاحب کا اور انکی تکلیف دہی کا ذکر کرتے اور ان الفاظ و اشعار میں انکی ستایش فرماتے ہیں ؎

راقم این نامۂ معنی سواد — محو سخن بندہ محمد مراد
بود شبے انجمن آرائے فکر — داشت سرے گرم ز سودائے فکر
یافتہ از قید تعلق خلاص — خامہ بکف منتظر فیض خاص
چہرہ طراز گل افسانۂ — دام نہ معنی بیگانۂ
پنجۂ اندیشۂ اعجاز فن — شانہ کش زلف بتان سخن
قطرۂ از ابر سخن ریختے — موج گہر از دلم انگیختے
خستہ دلم در ہوس مرہمے — جان گرو آرزوئے ہمدمے
از در م القصہ در آمد درون — اہل سخن را بسخن رہنمون
نشئۂ سر جوش خمستان ہوش — از پئے تحقیق سخن چشم و گوش

نقد و جنس نذر و نیاز پہونچتی رہی۔

غزلیں بالکل نئے طرز کی لکھتے تھے۔ کلام میں اخلاقی رنگ غالب تھا۔ تشبیہات کے بادشاہ تھے۔ مرزا شاعری کے ایک جداگانہ طریقہ کے موجد مانے اور بتائے جاتے ہیں۔ اساتذۂ فن سخن میں انکا شمار دفتر اول ہوتا ہے۔

ان کا دیوان اسی ہزار شعر کا ہے اور ہر صنف کلام پر مشتمل ہے۔

سنہ ۱۰۸۰ھ (۱۶۶۹ء) میں وفات پائی اصفہان مدفن ہے۔

صورت از دگشتہ بمعنی دلیل　　سید علامہ عبد الجلیل
کردہ بموزونیٔ طبع سلیم　　طالب خویشم چو کلام کلیم
می دہد از لفظ بمعنی پیام　　زود تر از نکہت گل با مشام
می برد از طرز بمطلب سراغ　　گرم تر از نشۂ مے با دماغ
دید کہ فکر سخنم پیشہ است　　دل گرو صورت اندیشہ است
گفت سخن سادہ و پُرکار بہ　　تاب کش سبحہ و زُنّار بہ
بس بود از بہر سخنور گوا　　معنی بیگانہ لفظ آشنا
گفتن او فکر مرا تازہ کرد　　روی سخن را بہ نفس غازہ کرد
شد زپری خانۂ دل جلوہ گر　　خیل معانی زپئے یک دگر
جرعہ کش بزم اویسی شدم　　پنجہ در خمسہ نویسی شدم
خامہ بہ تحریر گرو ساختم　　نقش دلآویز بہ پرداختم
از مدد باطنیٔ گنجوی　　طرز سخن یافت ز فکرم نوی

لائق ایک موقع پر میر عبد الجلیل سے فرماتے تھے کہ ایک روز مرزا صائب کی خدمت میں حاضر تھا فرمانے لگے کہ ''اب میری عمر ستر سال کی ہوئی تو قدرے چاشنی سخن پیدا ہوئی ہے لیکن بے سود۔ کوچ کا وقت آچکا۔'' مرزا کے علاوہ جو صلہ اور مراتب کمال کے بارہ میں لائق بہت سی باتیں نقل کیا کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ میں نے مرزا صائب کو شعر کہتے وقت کبھی تامل و غور کرتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ ایک روز مرزا اپنے چمن کی روشوں پر متفکرانہ ٹہل رہے تھے۔ میں نے التماس کیا کہ آج تو چہرۂ انور سے کچھ تفکر ظاہر ہو رہا ہے۔ مرزا نے تبسم فرمایا اور کہا کہ اسوقت فردوسی کا یہ شعر یاد آگیا تھا ؎

بفرمود تا رخش را زین کنند　　دم اندر دم نائے زرین کنند

شفائی نے اس کے جواب میں کہا ہے ؎

بفرمود تا زین بہ ابرش نہند　　چہ زین، ہیمہ بالائے آتش نہند

دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس پر طبع آزمائی کردں۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت اسکی فکر میرے ذمہ چھوڑ دیں۔ مرزا نے براہ مہربانی منظور کیا۔ میں نے تمام شب غور کیا۔ ایک شعر موزوں ہوگیا۔ صبح کو حاضر ہوکر عرض کیا۔ مرزا صاحب نے بہت تحسین و آفریں فرمائی ؎

بغرمود تا زیں براد ہم نہند   بہ پشتِ صبا مسندِ جم نہند

(۶) ناظم خاں فارغانی تمی نے میر کی مدح میں کہا ہے ؎

چو توئے بجاست شاہے بہ قلمرو معانی   بہ تو ہیچ کس نماند تو بہ ہیچ کس نمانی

(۷) شیخ ناصر علی سرہندی سے میر صاحب کی ملاقات اورنگ آباد دکن میں ہوئی تھی۔ میر صاحب خود آزاد سے کہتے تھے کہ "خوب پر لطف صحبت رہی۔ اور لوگوں کو ممانعت کردی گئی تھی۔ اول وقت سے آدھی رات تک برابر جلسہ قائم رہا۔ ناصر علی نے اس زمانہ میں ایک قصیدہ لامیہ تازہ کہا تھا۔ تشبیب موسم گرما کی توصیف میں تھی اور گریز نعت سرور انبیا علیہ التحیۃ والثنا پر۔ مطلع یہ تھا ؎

گداخت بسکہ ہوائے تموز مغز خیال   شرر ز سنگ برآید بصورت تبخال

سارا قصیدہ پڑھکر سنایا اور پوچھا "کوئی شعر پسند آیا؟" میں نے کہا کہ "تمام قصیدہ خوب ہے"۔ پھر کہلا۔ بے جا کہا کہ "اگر کوئی شعر پسند آگیا ہو تو نشان دیجئے"۔ میں نے کہا کہ "ایک شعر!" اس کلمہ کو سنکر شیخ کے چہرے پر تغیر ظاہر ہونے لگا۔ مینے دیکھ لیا۔ کہا کہ "سب جواہر ریزے ہیں اور قیمت وجوہریت کی مرتبہ میں سب مساوی لیکن کبھی ایسا بھی ہوجاتا ہے کہ کسی ایک کی آبداری دوسروں سے ممتاز ہو جاتی ہے۔" یہ بات سنکر انکا رنگ اصلی حال پر آگیا اور پوچھا کہ آخر کون سا شعر اچھا معلوم ہوا ہے۔ میں نے کہا کہ ؎

زبسکہ نم بہ زمیں نارسیدہ می سوزد   چو شمع بر سرِ شاخ است ریشہائے نہال

ناصر علی نے تحسین کی اور تسلیم کیا کہ "فی الواقع میں بھی اسی شعر کو اور سب شعروں سے ممتاز سمجھتا ہوں"۔ میر عبدالجلیل یہ بھی فرماتے تھے کہ میں نے ناصر علی کے دو شعروں میں دخل دیا تھا۔ ایک شعر آزاد کو یاد نہیں رہا۔ دوسرا یہ شعر ہے جو عالمگیر کی مدحیہ مثنوی میں کہا تھا ؎

محی الدین محمد زیب اورنگ   فضائے شش جہت ازو شوخیش تنگ

میر عبد الجلیل کا اعتراض تھا کہ بادشاہ کا لقب محی الدین ہے۔ باب افعال سے یا پر تشدید نہیں ہے۔ ناصر علی نے اعتراف کیا۔

اسی مثنوی میں ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں لکھا تھا ؎

بفکر لامکاں سیر ستش ہم آہنگ — فضائے نہ فلک بر شوخیش تنگ

میر صاحب نے فرمایا کہ بادشاہ کی اور اسکے گھوڑے کی تعریف ایک پرداز پر واقع ہوئی ہے اور بادشاہ کی نسبت شوخی ملائمت نہیں رکھتی۔ ناصر علی نے اس شعر کو نکال ڈالا اکثر نسخوں میں یہ شعر پایا نہیں جاتا ہے۔ ایک قدیم نسخہ میں البتہ بعینہٖ باقی رہ گیا ہے۔ بعض نسخوں میں مصرع یوں بدلدیا ہی ؎

شہنشاہِ جہانِ ہوش و فرہنگ — مُحِی الدّین محمد زیب اورنگ

خیال رہے کہ ناصر علی بڑی شہرت وشان اور قدرت و کمال کا شاعر گذرا ہے جو اپنے خیال میں صائب کو بھی کچھ نہ سمجھتا اور اکثر اشعار میں اُسکے ساتھ معارضہ کا داعیہ رکھتا تھا اُسکے معاصر بھی اُسکے کمال کو مانتے اور قدر کرتے تھے۔ محمد افضل سرخوش اُس کی نسبت کلمات الشعرا میں لکھتا ہے ؎

در ملکِ سخن بود جہانگیر علی — در مشرب دل ولی علی پیر علی
با شعر علی نمی رسد شعرِ کسے — زانساں کہ خطِ کس بہ خطِ میر علی

(۸) مرزا[۱] خافضع جو مرزا صائب کی صحبت سے مستفیض ہو چکے تھے میر عبد الجلیل سے بڑی قدر و عزت سے ملتے تھے۔ دونوں کی صحبتیں شاعرانہ نکات اور روایات کی بہترین یادگار تھیں۔ خافضع کہتے ہیں کہ یہ دو مصرع مدت سے میرے گوشزد ہو رہے تھے (۱) از شیشۂ بے مے مے بے شیشہ طلب کن

[۱] اہل لغت کی تحقیق یہ ہے کہ میرزا پہلے فردوسی کے ساتھ بیشتر شاہزادوں کے القاب کے لئے مخصوص تھا۔ کچھ زمانہ سے عام طور پر سردارزادگان کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے۔ ایران میں اس کا اطلاق سادات پر ہوتا ہے۔ غالباً اصل میں امیرزا یعنی امیرزادہ تھا۔ کثرت استعمال سے الف اول حذف ہو گیا۔ عارف تحقیق کے ساتھ مرزا بھی بولا جاتا ہے حاجی مصطفےٰ معروف بہ راے مان (سنہ ۱۸۰۰ء میں) لکھتا ہے۔ مرزا کے معنی شریف زادے کے ہیں مگر ہندوستان اور ایران دونوں ملکوں میں اس سے مراد ایسا شریف آدمی سے لیجاتی ہے جو لکھ پڑھ سکتا ہو یہ ایک ایسا وصف ہے جو مسلمانوں میں کم مگر ہندوؤں میں زیادہ پایا جاتا تھا نام سے پہلے اگر یہ لفظ لگایا جائے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ البتہ نام کے بعد آئے تو ہمیشہ اُس سے مقصود شاہی خاندان کا کوئی رکن یا شاہزادہ ہوگا۔

(۴) دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن۔ ایک روز میں نے مرزا صاحب کے روبرو عرض کیا۔ مرزا نے پہلے مصرعہ کے لئے فی البدیہہ فرمایا ع حق را ز دل خالی از اندیشہ طلب کن۔ دوسرے کے ساتھ یہ مصرعہ لگایا۔ بقدر ہر سکوں راحت بود بنگر مراتب ہا[۵۷۸] - خاضع نے یہ واقعہ میر عبدالجلیل سے نقل کیا تھا اور میر صاحب سے سنکر میر عظمت اللہ نے اپنے "سفینۂ بے خبر" میں درج کیا ہے۔

(۹) میر محمد ہاشم تخلص بہ جرأت مخاطب بہ موسوی خاں پہلے دہارواڑ[۵۷۹] کے قلعہ دار تھے۔ پھر امیر الامرا سید حسین علی خاں کے ہمرکاب ہندوستان چلے آئے تھے اور یہاں کے اکثر صاحبانِ کمال مثل مرزا بیدل[۵۸۰]

---

۵۷۸ بقدر ہر سکون راحت بود بنگر تفاوت را مشہور و زبانزد عالم ہے۔ مگر میر غلام علی نے سرو آزاد میں "مراتب ہا" نقل کیا ہے۔

۵۷۹ دہارواڑ، صوبہ بمبئی میں ایک قصبہ کا نام ہے۔ ضلع اور تعلقہ دہارواڑ اسی کے نام سے موسوم ہے تفصیل و تاریخ چنداں دلچسپ نہیں۔

۵۸۰ مرزا عبدالقادر برلاس بیدل تخلص عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان کے فارسی گو شعرا میں ممتاز اور عدیم النظیر مانے گئے ہیں۔ بہت سے اہل سخن نے انکے اتباع و تقلید کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔ زیادہ عمر انکی ابیں بسر ہوئی۔ آغاز شباب میں شاہزادہ محمد اعظم خلف عالمگیر کی نوکری کی منصب عالی پایا۔ کسی واقف الحال نے مرزا کی سخن سنجی کی تعریف شاہزادے سے کی۔ فرمایا "ہماری شان میں قصیدہ لکھیں ہم بقدر استعداد قدر دانی کرینگے" مرزا نے سنا تو قطعاً انکار کیا۔ اسی وقت نوکری چھوڑ کر شاہجہاں آباد چلے آئے۔ بقیہ عمر یہیں ختم کر دی۔ با ایں ہمہ استغنا و بے نیازی شان کمال یہ تھی کہ اواخر عہد عالمگیر سے لیکر اوائل جلوس محمد شاہ تک تمام ارکان سلطنت ان کی خدمتگزاری و آستان بوسی کو اپنا افتخار سمجھتے اور مراتب نیاز مندی بجا لاتے تھے قلیج خاں آصف جاہ کو انکی شاگردی پر ناز تھا۔ دکن گئے تو بڑی محبت و اعزاز سے لکھکر مرزا کو بلایا۔ جواب ملا ؎

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جائے خویش   من بستہ ام حنائے قناعت بہ پائے خویش

نواب شکر اللہ خاں مع تمام خاندان کے انکا بڑا معتقد اور قدر شناس تھا۔ امیر الامرا حسین علی خاں سے ربط و رسم خاص تھا لیکن فرخ سیر کے قتل پر جو ہمی دبے لفظی پیدا ہوئی اسکا اظہار مرزا نے اپنی تاریخ سادات ذی مکرامی گرز میں کر دیا۔ مرزا بڑے بلند پایہ سخن سنج تھے۔ تمامی اصناف سخن، غزل، مثنوی، رباعی، قصیدہ، ہر صنف میں انکا کلام موجود ہے۔ نثر بھی ایک طرز خاص سے نہایت لطیف لکھتے تھے۔ مزاج اور کلام دونوں پر فقر و تصوف کا رنگ غالب تھا

وغیرہ کی صحبت سے مستفیض ہوئے تھے، میر عبدالجلیل کی نسبت فرماتے تھے۔

"ہمیشہ در دکن از زبان امیر الامراء اوصاف کمال میر عبدالجلیل سامعہ افروز بود۔ چوں ملاقات واقع شد عجب نسخہ جامعے یافتم"۔

(۱۰) مولوی[۵۵] جیون، شیخ احمد امیٹھوی نے جب اُن تاریخوں کو دیکھا جو میر نے امیر الامراء کے فرزند کی ولادت کی کہی تھیں تو بہت پسند کیا۔ اُس وقت بہت سے آدمی اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے سب کے سامنے فرمایا "مارا بوجود شما فخر است کہ در زمانۂ ما ہم چو شما مستعدے موجود است"۔ میر عبدالجلیل اپنے بیٹے کو اسی صحبت اور اسی قدرشناسی کی نسبت لکھتے ہیں کہ "آں قدر مہربانی کردند کہ خجالت کشیدیم"

(۱۱) مرزا یار علی بیگ کی قدرشناسی اور عزت افزائی کا تذکرہ پیشتر ہو چکا ہے۔ اعادہ کی ضرورت نہیں۔

(۱۲) شعر و سخن کی ایک پر لطف مجلس میں کسی شخص نے مرزا بیدل کا یہ مصرع پڑھا

روز سوار شب کند اسپ چراغ پا

اور بالاعلان کہا کہ اس پر پیش مصرع کون لگا سکتا ہے، میر عبدالجلیل نے فی البدیہہ انشا کیا ؎

غرّہ مشو کہ ابلق ایّام رام تست | روز سوار شب کند اسپ چراغ پا

اُس شخص نے بے اختیار تحسین و آفریں کی اور کہا کہ حقیقتاً آپ کا مصرعہ مرزا کے پیش مصرع سے بہت بڑھ گیا ہے مرزا نے یوں کہا تھا ؎

باطبع سرکش ایں ہمہ رنج وفا مبر | روز سوار شب کند اسپ چراغ پا

ایک لاکھ شعر کا کلیات اور بہت سی تصانیف "محیط اعظم، چار عنصر، انشائے بیدل، رقعات بیدل، نکات بیدل یادگار چھوڑی ہیں بحر کامل، بحر متدارک، بحر سلوی، بحر خفیف مثمن زیادہ مرغوب تھیں۔ ۳۰ صفر ۱۱۳۳ھ (۲۴ نومبر ۱۷۲۰ء) کو دہلی میں وفات پائی اپنے ہی گھر کے صحن میں دفن ہوئے۔

[۵۵] حاجی ملا جیون صدیقی شیخ امیٹھی (ملک اودھ) کے رہنے والے تھے۔ وہیں پیدا ہوئے اور درس و تعلیم پائی مساعدت طالع نے بادشاہ عالمگیر تک پہونچایا۔ بادشاہ نے آپکی خدمت میں شاگردی کی۔ نہایت سادہ وضع اور تکلفات رسمی سے بیگانہ تھے۔ بادشاہ کو انکے ساتھ حسن ظن تھا۔ اعزاز و احترام بجا لاتا تھا۔ باپ کی اسی سنت پر شاہ عالم بہادر شاہ نے بھی عمل رکھا اور لوازم تکریم فوق الحد بجا لاتا رہا۔ ملا کا حافظہ نہایت قوی و بلند تھا۔ کتب درسیہ کی عبارات صفحہ صفحہ اور ورق ورق زبانی پڑھتے چلے جاتے تھے ایک ہی بار سنکر طولانی قصیدہ یاد ہو جاتا اور یاد رہتا تھا۔ ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں دہلی میں وفات پائی نعش امیٹھی

(۱۳) خود ان کے استاذ نامور شیخ غلام نقشبند ہمیشہ میر عبدالجلیل کی تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔ شیخ نے ایک بار ایک دائرہ تاریخی اپنا طبعزاد میر کے پاس بھیجا لیکن اسکی وضع زائچہ کا طریقہ قلمبند نہیں فرمایا تھا۔ میر نے اپنی قوت فکر سے دائرہ کی ماہیت و کنہ دریافت کر لی اور ایک دوسرا دائرہ اس سے بھی زیادہ لطیف و نادر اپنی طرف سے تیار کر کے شیخ کی خدمت میں بھیجا۔ شیخ نے اسکے جواب میں یہ خط اپنے قلم خاص سے لکھا تھا

"میر والا مدارج انسانی مجمع فیوضات ربانی سلامت۔ گرامی نامہ محلت شمامہ مشتمل بر رسیدن بلگرام تفویض خدمت بخشی گری و وقائع نگاری گجرات رسید، مسرت فراواں بخشید، الحمدللہ کہ بر وفق خواہش دوستاں با جمعیت ایں طرف تشریف آوردند۔ فقیر را بخلوص صمیم دانستہ از یاد و دعا غافل نبودانند حق سبحانہ ہمیشہ در ترقی جمعیت نشاتین دارد۔ دیگر رسالہ اعجاز طراز دائرہ رسید، زبان از مدحت آں قاصر است حقا کہ ذات سامی آیات دریں زمانہ بے بدیل است۔ اللہ تعالیٰ ایں افادہ مستدام دارد۔ زہے فطرت صافی و ذہن ثاقب کہ سر مخفی معلوم نمودہ دائرہ از خود وضع نمودند۔ غرض کہ کمال سامی از تحریر بیرون است، دیگر از اشتیاق گرامی صحبت چہ بر گزارد۔ اللہ تعالیٰ بوجہ احسن میسر آرد۔ والسلام۔"

(۱۴) حافظ ضیاء اللہ عالم کامل اور حافظ و قاری کلام مجید کے تھے۔ نظم و نثر عربی و فارسی پر قدرت تامہ رکھتے تھے۔ ان کے دو خط اوپر نقل ہو چکے ہیں۔ حضرت میر سید محمد قدس سرہ صاحب سجادہ کالپی کے شاگردان و مستفیدان سے تھے۔ ان کے کمال عقیدت اور رسوخ ارادت کے ثبوت میں ان کا یہ والہانہ شعر پیش کیا جاتا ہے۔

کالپی مکہ، بلگرام یمن ۔۔۔ اے تو احمد، منم اویس قرن

شعبان سنہ ۱۱۰۲ھ (اپریل سنہ ۱۶۹۱ء) میں وفات پائی تو انکے نشارات دو دفتر میں ترتیب دیئے گئے اور ان کے سعید فرزندوں کی استدعا سے میر عبدالجلیل نے ان پر دیباچہ لکھا۔

(مصنفات لکھنؤ) اکر دفن کی گئی، جو پنہدی بھی کہلاتے تھے۔ تفسیر احمدی، قرآن پاک کی تفسیر خوب لکھی ہے شیخ احمد نام تھا۔

(۱۵) اہل فقر و فضل میں سے سید قاسم اسرار بلگرامی سے میر عبد الجلیل کو بہت عقیدت تھی۔ اُن کے دیوان کو بہت عزیز رکھتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ "سید قاسم اسرار، صاحب سخن بود۔ گویا پرتو سید قاسم[۵۴] انوار بر ساحت احوالش تافتہ قاسم اسرار گردیدہ"۔ اسی طرح ان کی نسبت ان کے پیر و مرشد سید تاج الدین حجرہ نشین فرماتے تھے کہ "قاسم اسرار مرآۃ این ملک است" مرشد کی رحلت کے بعد اُن کے ایما کے موافق سید قاسم شمس آباد[۵۵] (ضلع فرخ آباد) چلے آئے جس جائے بلند کا پتہ دیا تھا وہاں اقامت گزیں ہوئے۔ دو تین مہینے بھی نہ گزرے ہونگے کہ کسی دولت مند کا اُدھر سے گزر ہوا۔ اُس نے عالی ہمتی سے مسجد و خانقاہ و چاہ و روضہ و باغ وہاں بنوا دیا اور رقم خرچ مقرر کر دی۔

(۱۶) سید محمد اشرف معروف بہ سید[۵۶] درگاہی مشہور عالم و صوفی تھے۔ ان کا طریقہ بالکل سلف

---

۵۴ قاسم انوار، سید معین الدین علی کا لقب تھا۔ شیخ صدر الدین موسیٰ اردبیلی کے سلسلہ میں تھے۔ تبریز میں پیدا ہوئے۔ آذربیجان اپنے وطن اصلی سے جیلان، وہاں سے ہرات چلے آئے۔ علوم ظاہری و مدارج معنوی کی تکمیل یہیں فرمائی۔ رؤسا و اشراف کی ایک بڑی جماعت مرید و معتقد تھی۔ لوگوں کی سعایت و بدگوئی سے ۸۲۹ھ (سنہ ۱۴۲۶ء) میں شاہرخ مرزا نے ان کے اخراج کا حکم دیا۔ تعمیل بر کنار، یہ بھی کسی کی مجال نہ تھی کہ یہ حکم آپ تک پہونچا دے۔ شاہزادہ بایسنغر بحیلۂ زیارت حاضر ہوا۔ اثنائے گفتگو میں آپ کا یہ مطلع پڑھا ؎

اے عاشقاں! اے عاشقاں!! ہنگام آشنہ گر جہاں — مرغ دلم طیراں کند بالائے ہفتم آسماں

پھر اسی سلسلۂ کلام میں محل مناسب سے آپ کو آپ کا ارشاد یاد دلایا ؎

قاسم سخن کوتاہ کن، برخیز و عزم راہ کن — شکر بر طوطی فگن، مردار پیش کرگساں

سید صاحب دعا و تحسین فرماتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ پہلے سمرقند گئے پھر شہر جام، جو متصل ہرات ہے، چلے آئے۔ بقیہ عمر یہیں طے کی۔ اسی شہر کے محلہ خرجرد میں ۸۳۷ھ (سنہ ۱۴۳۳ء) میں رحلت فرمائی۔ بعض مورخین مثل صاحب تاریخ حبیب السیر آپ کا ۸۳۶ھ (سنہ ۱۴۳۲ء) میں خراسان میں وفات پانا لکھتے ہیں۔ مثنوی انیس العاشقین آپ کی تصنیف ہے۔

۵۵ شمس آباد (اب ضلع فرخ آباد میں) ایک قدیم و مشہور قصبہ، دریائے گنگ کی پرانی اور بلند بہاڑیوں پر واقع ہے۔ طول البلد ۲۷ درجہ ۳۲ دقیقہ شمالاً اور عرض البلد ۷۹ درجہ ۲۰ دقیقہ شرقاً ہوگا۔ فتح گڑھ (ضلع کے صدر مقام) سے اس کا فاصلہ اٹھارہ میل سمت شمال و مغرب ہے۔ ۳۲ محلے ہیں۔ مردم شماری سنہ ۱۹۰۱ء میں ۷۵۲۳ تھی لیکن بیس برس کے زمانہ (سنہ ۱۹۲۱ء) میں ۵۹۹۶ رہ گئی۔ قصبہ روز بروز شکستہ حال و تباہ ہوتا جاتا ہے۔ پختہ مکانات اور شاندار عمارات اسکی گزشتہ عظمت و عروج کی دلیل ہیں۔ غیر آباد حصوں میں کاشت

صالحین کا تھا مآثر الکرام میں ان کا مفصل تذکرہ ہے۔ سید میر عبد الجلیل کے یاران خاص میں سے تھے اور کہا کرتے تھے کہ میری تحصیل علم کا باعث میر عبد الجلیل ہوئے تھے میں پابند و متاہل ہو چکا تھا کہ کسب علم کی ترغیب دی میں نے عذر کیا کہ اب مرحلہ شباب میں قدم رکھ چکا ہوں اس کا حاصل کچھ نظر نہیں آتا ہے۔ اصرار کیا اور فرمایا کہ ضرور بالضرور نفع ہوگا مختصرات کو خود پڑھایا۔ باقی کتابیں اور علوم دیگر علماء و اساتذہ سے پڑھیں۔

(۱۷) سید محمد باقر بلگرامی ۹۵ نے ابتداءً علوم متداولہ مقامی علماء و مشاہیر فضلاء سے حاصل کئے تھے۔ خود بڑے جید فاضل اور طباع تھے۔ فن لغت عربی میں لاانتہا خوض فرماتے آخر میں میر عبد الجلیل کی صحبت میں پہونچے اور خوب استفادہ کیا اور ہر فن میں دستگاہ کامل بہم پہونچائی۔ خط نہایت شیریں اور دل پسند ہو گیا تھا۔ بالکل میر کے خط کی روش اور شان تھی۔

ہونے لگی ہے۔ بلندی پر سے دیکھنے سے زراعت کے دلفریب قطعات اور لہلہاتے ہوئے کھیت اور سبزہ زار ہر طرف نظر آتے ہیں۔

پرانا شہر کھور ساڑھے تین میل کے فاصلہ پر گنگا کی پہاڑی پر آباد تھا۔ تیرہویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایک راٹھور راجہ نے جسکا نام زیادہ تر پرتھی پال بتایا جاتا ہے اور کبھی کبھی جے سنگھ دیو، اور جو مشہور و معروف جے چند راٹھور کی نسل سے تھا اسکی بنیاد ڈالی تھی۔ اُسوقت سے لیکر اکبر بادشاہ کے عہد تک دریا اسی پہاڑی کے نیچے بہتا رہا ہے ۶۲۵ھ (۱۲۲۸ء) کے قریب شمس الدین التمش جہاڑوں کا بیڑہ لیکر یہاں آیا اور بجبری حملہ کرکے راٹھوروں کو مغلوب کیا۔ موجودہ قصبہ سے دو میل پورب کو شمس آباد کی بنیاد ڈالی ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں شہنشاہ محمد تغلق بھی یہاں ہو کر گزرا تھا ۸۱۶ھ (۱۴۱۴ء) میں راٹھوروں کی تنبیہ و تادیب کے لئے شہنشاہ سید خضر خاں کو بھی آنا پڑا تھا۔ سلطنت شرقیہ جونپور کی تواریخ و واقعات میں بھی شمس آباد کا نام بارہا آیا ملک بہلول لودی بادشاہ دہلی کے ہاتھ سے جب اُس سلطنت کا قلع و قمع ہوا تو ۸۸۴ھ (۱۴۷۹ء) میں کھور کے خاندان کا بھی قطعی فیصلہ ہو گیا۔ ۹۰۱ و ۹۰۲ھ (۱۴۹۴ و ۱۴۹۵ء) میں سکندر لودی نے بھی کچھ زمانہ یہاں بسر کیا تھا۔ موضع سکندر پور اُسی قیام کی یادگار ہے۔ ۹۰۶ھ (۱۵۰۰ء) میں یہ قصبہ اور پرگنہ اُس نے عماد خاں و سلیمان خاں، افاغنہ فرمولی کو دیا تھا۔ بابر نے اوائل ایام ۹۳۵ھ (۱۵۲۸ء) میں اسکو راجہ چندر بھی کو دینا چاہا تھا مگر بعد ازاں (اُسی سال) بکرماجیت سسودیہ کے حوالہ کر دیا، جس نے رن تھم بھور سا حصین حصین دے کر (اُس کے عوض میں) شمس آباد لیا تھا اس سے کچھ روز پیشتر پٹھانوں نے

(۱۸) حاجی صفت اللہ خیرآبادی جو اجلۂ مشائخ وصنادید فضلاء سے تھے، ۱۲۳۲ھ (۱۸۲۶ء) میں وارد بلگرام ہوئے تو اپنے مرتبہ اور علو شان اور جماعت معتقدین ومسترشدین کی تعظیم وتکریم کا کچھ خیال نہ فرمایا بلکہ میر عبدالجلیل سے ملنے کے لئے خود انکے دیوان خانہ پر تشریف لائے! اور بہت سے خواہشمندوں کو اپنے جمال باکمال اور مقال فیض اشتمال سے مشرف فرما گئے۔

(۱۹) ارباب دولت وحشمت میں سے حاجی سید حسین صفاہانی متخلص بہ خالص و مخاطب بہ امتیاز خاں، دیوان صوبۂ عظیم آباد پٹنہ خاصکر قابل ذکر واعتنا رہے۔ جیسا کہ ایک موقع پر تحریر ہوچکا ہے شاہ عالم کے عہد میں اس نے اپنے وطن (ایران) کا عزم کیا۔ شہر بھکر میں پہونچا۔ میر عبدالجلیل سے ملاقات ہوئی خود بڑا سخن سنج وسخن فہم امیر تھا۔ میر سے بڑی پر لطف صحبتیں رہیں۔ امتیاز خاں اپنے ساتھ کثیر مال ومتاع اور لاکھوں روپیہ نقد اور جواہر بیش بہا وپارچہ لیکر جارہا تھا۔

شاہی گورنر ابوالمحمد نیزہ باز سے شمس آباد چھین لیا تھا اور ۹۴۳ھ (۱۵۳۶ء) میں ایک اور صوبہ دار حسین خاں ٹکریہ کو رخصت کر چکے تھے

کھور اور اسکے راجگان کے رفیع ومنیع وزر کا نام ونشان صرف ایک بلند ٹیلہ سے قائم ہے جو کوٹ کہلاتا ہے اراضی نشیبی کی سطح سے اسکا ارتفاع تیس فٹ ہوگا۔ پرانے شہر کے نام سے انتساب کرنیوالی، قنوجیہ برہمنوں کی ایک جماعت باقی ہے جو اپنے کو کھور کا پانڈے کہتے اور اس پر فخر کرتے ہیں۔

موجودہ قصبہ کی بنیاد ۹۵۷ھ (۱۵۰۹ء) میں مرزا طاہر نے ڈالی تھی۔ آئین اکبری میں اسکا تذکرہ بذیل سرکار قنوج ان الفاظ میں ہے "شمس آباد۔ قلعہ وار در کنار آب گنگ" اپنی پریشانی وسرگردانی کے ایام میں مشہور مورخ شیخ عبدالقادر بدایونی بھی کچھ روز یہاں پناہ گیر اقامت گزیں رہا ہے بدایوں کا عام راستہ اسوقت شمس آباد ہوکر تھا۔

آثار قدیمہ میں، قلعہ کے کھنڈرے یعنی کوٹ پر سب سے پرانی تعمیر جامع مسجد ہے۔ بالائے محراب ایک پتھر پر ابھرے ہوئے حروف میں یہ قطعہ تاریخ کندہ ہے ؎

دیں پرور محمد خان بلند ہمت ، محمد است گوہرے دولت باصولجان جہاں

وار دچو ذوق طاعت آں محسن زمانہ ، ترتیب داد مسجد از عون لطف یزداں

تاریخ آں رضائی جست از خرد۔ بگفتا ، شد خانۂ الٰہی تاریخ مسجد خاں

(۱۰۰۲ھ ۱۲۳۳ء)

اسی کے قریب سید سالم کا مزار ہے جو یہاں کے اکثر سادات قبائل کے مورث اعلیٰ ہیں۔ میر عزیز اللہ کی درگاہ پورب کوٹ پیشمال (زیر تعمیر) یہ شہر سے مرتاض اور خدارسیدہ بزرگ تھے۔ کھور کی شکست اور

میر صاحب کو اطلاع تھی کہ خدا یار خاں والی سندھ اس دولت و سامان کو بڑے حسد و حرص سے دیکھ رہا ہے۔ میر نے امتیاز خاں کو آگے بڑھنے سے روکا اور وہیں سے واپس جانیکا مشورہ دیا اور اصرار کیا لیکن وہ کب سننے والا تھا۔ جولانگاہِ قاتل کی طرف سر بکف روانہ ہوا۔ سیوستان پہونچا تو میر محمد اشرف (میر عبدالجلیل کے داماد) وہاں نائب خدمت تھے انھوں نے کمال گرمجوشی سے استقبال کیا اور اپنی حویلی میں فروکش کرایا۔ خدا یار خاں نے کسی تقریب یا حیلہ سے محمد اشرف کو خدا آباد بلا لیا اور اپنے آدمیوں کو بھیجکر امتیاز خاں کا کام تمام کرا دیا۔ میر نے آہ آہ۔ امتیاز خاں ۱۱۷۴ھ (۱۷۶۱ء) تاریخ نکالی۔ امتیاز خاں میر کے کمالات اور تبحر کا نہایت دلدادہ تھا اور بیحد توصیف کرتا اور معتقدانہ

شمس الدین کی فتح آپ ہی کی برکت و دعا سے منسوب کیجاتی ہے۔ جانب غرب جھونا کھار نالے پر نواب جعفری بیگم رئیسہ مرحومہ کا تعمیر کردہ پختہ پل ہے، جسکے قریب ایک ولی اللہ حسین شاہ زندہ دوست کا مقبرہ ہے جو ایک صاحب کمال درویش تھے۔

شمس آباد کی شہرت و ناموری حقیقتاً پون صدی سے یہاں کے نواب صاحبان کے دامن دولت سے وابستہ ہے۔ اپنے باپ اعتماد الدولہ ضیاء الملک نواب سید فضل علی خاں سہراب جنگ وزیر اودھ کی وفات کے بعد نواب جعفری بیگم صاحبہ اور انکے شوہر نامدار سید محمد علی خاں عرف نواب دولہ صاحب نے ۱۸۳۵ء میں یہاں قیام اختیار فرمایا تھا۔ بیگم صاحبہ کے اجداد سادات بارہہ سے تھے۔ باپ کی طرف سے یہ عشیرۂ عالیہ موسوی سید (امام ہفتم سید نا موسیٰ کاظم علیہ السلام کی نسل محترم)، شاہ صفی اردبیلی کی اولاد سے ہے جو ایران کے ملوک صفوی کے دادا تھے "این خانہ تمام آفتاب است" کا مصداق یہی دودمان محتشم ہے، جسکے ممتاز ارکان باہمہ ایالت و حکومت، امارت و دولت کریم الاخلاق، پیکر خلوص و وفا زیور علم و کمال سے آراستہ، نہایت روشن خیال سراپا تہذیب و شائستہ اولو العزم ہیں۔ قصبہ اور اسکے اطراف میں عظیم الشان مساجد اور امام باڑے، محلات، کوٹھیاں تعمیر کرائی ہیں اور ہر طرح کی ترقی و رونق دی ہے ؎

لله قوم اذا حلوا بمنزلة — حل الرضا و لسبل الجود ان ساروا

۵۵۴ ولادت ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۲ء) - وفات صفر ۱۱۶۵ھ (دسمبر ۱۷۵۱ء)

۵۵۵ ساٹھ برس کی عمر میں ۱۲۳۴ھ (۱۸۱۹ء) میں رحلت فرمائی

۵۵۶ ۱۲۵۸ھ (۱۸۴۲ء) میں انتقال کیا۔ سن مبارک اسی سال تھا۔

۵۵۷ خدا آباد۔ یہ ویران قصبۂ تعلقہ دادو ضلع لاڑکانہ ملک سندھ صوبہ بمبئی میں سیہوان سے سولہ میل بہ شمال و مشرق کے سمت ریل کی سڑک پر واقع ہے تھارنٹن صاحب نے اسکی نسبت ۱۸۴۴ء میں لکھا ہے

ملتا تھا۔ اپنے دیوان کا ایک انتخاب بھی پیش کیا تھا۔

(۲۰) مرزا احمد یار خاں برلاس متخلص بہ یکتا عالمگیر کے عہد میں صوبہ دار ٹھٹہ تھا [۵۵] اور بہت سے کمالات و فضائل کا جامع خط نہایت پاکیزہ و پختہ لکھتا۔ تصویر بکمال نفیس و تحفہ بناتا۔ ہر قسم کے شعر نہایت خوب کہتا۔ محمد عاقل خاں یکتا لاہوری کے ساتھ اُسکا مقابلہ اور اہل فن کا احمد یار کے حق میں فیصلہ مشہور ہے۔ سنہ ۱۱۱۹ھ (۱۷۰۷ء) میں وارد بھکر ہوا تو میر عبدالجلیل کی صحبت میں معتقدانہ حاضر رہا۔ اپنے قلم کا خط نسخ میں لکھا ہوا کلام اللہ کا ایک نسخہ بھی بطریق یادگار حوالہ کیا تھا۔ ۲۳۔ جمادی الاولیٰ ۱۱۴۷ھ مطابق ۱۲ ستمبر ۱۷۳۴ء کو قصبہ خوشاب اعمال لاہور میں وفات پائی۔

(۲۱) سید قریش بلگرامی متخلص بہ عجیب میر عبدالجلیل کے حقیقی خالہ زاد بھائی تھے۔ خوش خلق و

تیس سال سے کچھ زائد گزرا کہ وسعت اور آبادی میں حیدر آباد سندھ کا مقابلہ کرتا تھا۔ نہایت سر سبز و بارونق تھا مگر آج اس قصبہ میں ایک گھر بھی ایسا باقی نہیں ہے جو آباد ہو۔ یہ سندھ کے تال پوری امیروں کا نہایت دلپسند مسکن تھا۔ اُن سرداروں میں سے اکثر اب اُن مقبروں میں راحت گزیں ہیں جنکی سادہ اور ستھری تعمیر بنوانے والوں کے حُسن انتخاب اور سلامت ذوق کی یادگار ہے یہاں کے مخصوص اور دلچسپ مقامات میں سے فی الحال ایک پرانی مسجد باقی ہے جو ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) میں تعمیر ہوئی تھی اور جس پر نہایت خوشنما چینی کا کام ہے۔ دوسرا یار محمد کلہورہ کا مقبرہ ہے جو ایک میل کے فاصلہ پر ہوگا۔ اسکی تزئین بھی ویسی ہی رنگین پتھروں سے کی گئی ہے۔ مقبرہ تو ابھی اچھی خاصی حالت میں ہے لیکن مسجد کو بہت نقصان پہونچ چکا ہے اور ویران و شکستہ حال ہے۔ یہاں کی زبان سندھی ہے۔

شیخ حزیں اپنی روداد سفر میں لکھتے ہیں کہ نواحی تتہ (ٹھٹہ) سے خدا آباد تک ایک رودخانہ (نہر سا) بنا ہوا ہے اور مسافت بھی چند روز کی ہے۔ یہ بھی کشتی پر آئے تھے۔ سارا راستہ نہایت لطف و تفریح کیساتھ طے ہوا تھا لیکن خدا آباد پہونچکر سات مہینے پڑے رہے۔ گرمی کی شدت اور ہوا کی خرابی سے مختلف امراض صعب میں گرفتار ہوگئے تھے۔

واضح رہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی جماعت ڈائرکٹران کے حکم سے کپتان تھارنٹن نے یہ گزیٹر مرتب کیا تھا جو لندن میں ۱۸۴۴ء میں دو جلدوں میں شائع کیا گیا A Gazetteer by Cap. E. Thornton R.N.

[۵۵] ٹھٹہ (یا ٹاٹو جسکو باشندگان زیادہ تر ٹھٹہ ٹاٹو کہتے ہیں) ضلع کراچی ملک سندھ میں ایک قصبہ اور ایک تعلقہ کا صدر مقام رہ گیا ہے۔ دریائے سندھ یہاں سے سات میل پر ہوگا۔ عہد عالمگیر میں ٹھٹہ ایک زرخیز صوبہ تھا جسکے متعلق چار سرکاریں ستاون محال اور پانچ بندرگاہ تھے۔ اور ٹھٹہ یا دیبل شہر عظیم مانا گیا تھا۔ نمک و آہن کی معادن یہاں نہیں۔

یہ قصبہ مکلی Makli پہاڑیوں کے دامن میں واقع ہے کسوقت دریائے سندھ کا پانی اسکی ہر طرف موج زن تھا اب بھی جب طغیانی فرو ہوکر پانی نکل جاتا ہے تو جا بجا تالاب اور گڑھے بھرے رہ جاتے ہیں۔ آب و ہوا سخت تکلیف دہ اور سردی ناسازگار ہے۔ بخار شدید پھیلا رہتا ہے۔ ریل اسٹیشن سے تیرہ میل کا فاصلہ ہے سڑکیں

ظریف تھے۔ سلیقۂ نظم خوب حاصل تھا میر صاحب کی مدح میں کہتے ہیں ؎

گل ہماں بہ کہ ز گلزار پیمبر باشد ۔۔۔ مُل ہماں بہ کہ ز میخانۂ کوثر باشد
گوہر آں نیست کہ از نطفۂ نیساں زاید ۔۔۔ گوہر آں است کہ از معدن حیدر باشد
اے خوشا تازہ نہالے کہ بہ بستان شرف ۔۔۔ دست پرور دۂ زہرائے مطہر باشد
آنکہ از جبہۂ او نور سیادت پیداست ۔۔۔ عالم افروز تر از نیر اکبر باشد
در زمینے کہ بخند و گل خلق حسنش ۔۔۔ برکف خاک بخاصیت عنبر باشد
چشم بد دور ز سیمائے حسینی نسبی ۔۔۔ چمن آرائے جہاں ایں گل احمر باشد
مدح او را نتواں در قلم آورد عجیب ۔۔۔ زانکہ از حوصلۂ خامہ فزوں تر باشد

پختہ کر دی گئی ہیں۔

ٹھٹہ کی تاریخ نہایت دلچسپ و قدیم ہے۔ حالات زیادہ تر تاریخ[1] حاجی محمد قندھاری و خلاصۃ[2] الاحکام و محبت نامہ[3] میں ملتے ہیں۔ اوٹرم صاحب لکھتے ہیں کہ اسکی بنیاد سنہ ۱۴۴۵ء (سنہ ۸۴۹ھ) میں پڑی تھی۔ دیگر مورخین سنہ ۱۵۲۲ء (سنہ ۹۲۹ھ) بتاتے ہیں۔ اجماع روایات اسی قدر ہے کہ جام نظام الدین عرف جام نندا جو سما کے شاہی خاندان سے تھا اسکا بانی تھا۔ ٹھٹہ جب سما سلاطین کا دار السلطنۃ تھا تو یہاں کا فرمانروا جام کہلاتا تھا) پوسٹنس Postans راوی ہے کہ سنہ ۱۵۵۵ء (سنہ ۹۶۲ھ) میں رہ گو دست پرتگالی اجورہ داروں نے ٹھٹہ پر حملہ کیا اور غارت کر ڈالا تھا۔ سنہ ۱۵۹۲ء (سنہ ۱۰۰۱ھ) میں جب اکبر نے سندھ کو اپنے قلمرو میں داخل کیا تو اُسوقت یہاں کا والی مرزا جانی بیگ تھا۔ آزاد دہلوی دربار اکبری میں لکھتے ہیں کہ تیموری خاندان کے باغی شاہزادے مرزا کہلاتے تھے) بادشاہ نے ٹھٹہ بطور جاگیر اُسکو واگذار کر دیا۔ سنہ ۱۷۳۹ء (سنہ ۱۱۵۲ھ) میں نادرشاہ بادشاہ ایران کے حوالہ ہوا۔ پھر کلہوڑ خاندان میں آیا وہاں سے تال پور کے میر صاحبان کے یہاں پہونچا۔

الیگزینڈر ہیملٹن سنہ ۱۶۹۹ء (سنہ ۱۱۱۱ھ) میں یہاں سے گزرا تھا وہ اسکو ایک عظیم اور دولتمند شہر بتاتا ہے۔ لکھتا ہے کہ اُسکے پہونچنے سے کچھ پہلے ٹھٹہ میں اسی ہزار نفوس طاعون سے ہلاک ہو چکے تھے۔ ایک دوسرا یورپین سیاح پاٹنجر Pottinger لکھتا ہے کہ جب نادرشاہ اپنی فوج لیکر سنہ ۱۷۴۲ء (سنہ ۱۱۵۵ھ) میں یہاں داخل ہوا تھا تو چالیس ہزار پارچہ باف بیس ہزار صناع اور دستکار اور ساٹھ ہزار دیگر تاجر اور اہل حرفہ یہاں بستے تھے

ٹھٹہ کی آبادی اٹھارہویں صدی مسیحی میں بہت گھٹ گئی کپتان جے وڈ J. Wood نے جب سنہ ۱۸۳۷ء میں دیکھا ہے تو اُسکے تخمینہ میں دس ہزار سے زائد تھی۔

بحالت موجودہ ٹھٹہ کی مردم شماری ساڑھے آٹھ ہزار کے قریب ہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے سنہ ۱۷۵۸ء (سنہ ۱۱۷۱ھ) میں یہاں ایک کوٹھی کھولی تھی جو سنہ ۱۷۷۵ء (سنہ ۱۱۸۹ھ) میں بند کر دی۔ ریشم اور روئی کے منسوجات اور بعض دیگر مصنوعات اور غلہ کی تجارت اب بھی کسیقدر باقی ہے۔

اُمراو سلاطین

عہد اورنگ زیب عالمگیر سے لیکر عصر محمد شاہ بادشاہ تک تمام اُمرائے عظام میر عبدالجلیل کا بڑا اعزاز واحترام فرماتے اور صحبت والا کے تشنہ و متمنی رہتے۔ حسین علی امیر الامرا کو بالخصوص کمال اُلفت تھی۔ اپنی مجلس میں برملا کہا کرتے تھے کہ "میر عبدالجلیل دریں عصر نظیر ندارند" اور لوازم احترام فوق الحد بجالاتے تھے۔ میر صاحب نے بھی دل کھول کر اُنکی مدحت سرائی فرمائی ہے اور اُنکا نام دنیائے علم میں زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ میر صاحب کے قصائد و مراثی جو امیر الامرا کی شان میں ہیں، دونوں کے مراسم وارتباط اور مخلصانہ تعلقات کے شاہد ہیں۔

ایک موقع پر میر عبدالجلیل امیر خسرو سے اپنا نشابہ (مثنوی طوطے فرخ سیر بادشاہ کے فخریہ میں)

عہد اسلامی کی یادگار قلعہ کے اندر ایک مسجد جامع ہے جو شاہجہاں کے حکم سے ۱۰۵۴ھ (۱۶۴۴ء) میں تعمیر ہوئی تھی شاہجہاں جب اپنے باپ جہانگیر کے پاس سے بھاگ کر یہاں آیا تھا تو ٹھٹہ والوں نے اُسکی شایان شان عزت و توقیر کی تھی۔ وہ بے ہراس یہاں کی قدیم جامع مسجد میں نماز ادا کرنے جاتا تھا۔ اسی حسن سلوک کی یادگار میں تاج و تخت پانے کے بعد شاہجہاں نے یہ خوشنما اور نفیس مسجد تیار کرادی تھی۔ مسجد بہت مرمت طلب ہوگئی تھی مگر کچھ عرصہ ہوا کہ عوام کے چندے اور سرکاری امداد سے کافی درستی کرادی گئی ہے۔ شہر کے جنوب میں دیگر مسجد Dabyar Mosque بہت پرانی ۹۱۵ھ (۱۵۰۹ء) کی تعمیر ہے اس پر نہایت عمدہ چینی کا کام کیا ہوا ہے۔ ٹھٹہ کا قلعہ بعہد اورنگ زیب ۱۱۱۱ھ (۱۶۹۹ء) میں زیر اہتمام نواب حفیظ اللہ خاں تعمیر ہونا شروع ہوا تھا۔ تکمیل کی نوبت نہیں پہونچی۔ اب تو لوگوں نے بنیادیں تک کھود لیں اور اینٹ اور مصالح دوسری عمارات میں لگا دیا ہے۔

مسلمانوں کے زمانہ میں ٹھٹہ کا نام برہمن آباد تھا۔

کپتان ہملٹن (جسکا نام ابھی لے چکا ہوں) ایک نامور عالم سیاح اور تاجر تھا۔ وہ ہندوستان میں عہد اورنگ زیب میں آیا تھا۔ اس نے پچیس ۲۵ سال کے قریب اس ملک میں گزارے تھے۔ اپنا مکمل سفرنامہ تحریر کیا تھا۔ اُس میں شہر ٹھٹہ اور سورت کے حالات، مسلمانوں کی حکومت اور انکی مذہبی رواداری اور مختلف اقوام کے مراسم و دستورات کو بخوبی و بہ تفصیل لکھا ہے۔ وہ ایک موقع پر لکھتا ہے کہ سندہ کا شہر ٹہٹہ (ٹھٹہ) دریائے انڈس سے دو میل کے فاصلہ پر ہے نہروں اور موریوں کے ذریعہ سے دریا سے شہر و باغات میں آب رسانی کا انتظام کیا گیا ہے۔

شیخ علی حزیں بھی ۱۱۵۴ھ (۱۷۴۱ء) میں ٹھٹہ آئے تھے۔ دو ماہ قیام کیا تھا۔ اپنے سوانح حیات میں شہر کی بڑی تعریف کی ہے اور یہاں کے تاجروں کی کمال تحسین۔

ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں ؎

چناں کردم سخن در نغمہ انشاد
کہ روح میر خسرو گشت زو شاد

... ...

اگرچہ میر خسرو بود استاد
ندارد چرخ چوں او دیگرے یاد

بفکر دور دو بہ واز دارد
نبی نبود وسے اعجاز دارد

در انواع سخن کاندر جہان است
بقدرت خسرو صاحب قران است

وسے من ہم ازیں گلدستۂ نو
دریں عصرم بجائے میر خسرو

کمال از ہر نمط دل خواہ دارم
امید تربیت از شاہ دارم

... ...

صلہ گر داد خسرو را خضر خاں
بہ نظم مثنوی گنج فراواں

شہ ما چشمۂ آب حیات است
کہ صد چوں خضر خاں راز و برات است

واقعہ بھی یہی ہے کہ امیر کے ساتھ میر کا تشابہ جامعیت علم و عمل کی راہ سے تھا اور ارباب دول کی مصاحبت سے بھی۔ آغاز سے انجام تک امیر نے بادشاہان دہلی کے ساتھ بسر کی اور بقول اُن کے سات بادشاہوں کی خدمت کی تھی۔ طرفہ یہ ہے کہ میر بھی سلاطین تیموریہ (دہلی) میں سے سات بادشاہوں[۵۹]

[۵۹] موجودہ نصاب تعلیم کی بدولت، ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے حالات، واقعات اور کارنامے کسی تفصیل کے محتاج نہیں بالخصوص خاندان تیمور کے آخر زمانہ کی تاریخ تو کافی و وافی شہرت رکھتی ہے اس لئے زمانہ کا تعین کرنے اور اُس کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے مختصراً تحریر کیا جاتا ہے۔

نمبر	نام	ازبطن	ولادت	تخت نشینی	وفات و مدفن	لقب بعد وفات
۱	ابوالمظفر محی الدین محمد اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ بن شاہجہان بادشاہ	ارجمند بانو بیگم ملقب بہ ممتاز محل	۱۱ ذیقعدہ سنہ ۱۰۲۸ھ شب یکشنبہ مطابق ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۶۱۹ء قدیم	۹ رمضان سنہ ۱۰۶۸ھ کو عنانگیر سلطنت ہوا جلوس فرحیمہ غرہ ذیقعدہ سال مذکور مطابق ۲ اگست سنہ ۱۶۵۸ء کو ہوا	جمعہ ۲۸ ذیقعدہ سنہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۲۱ فروری سنہ ۱۷۰۶ء قدیم ۴ مارچ سنہ ۱۷۰۷ء جدید بمقام احمد نگر دکن مدفن قبہ شاہ زین الدین واقع خلد آباد اورنگ آباد	خلد مکان

کے لوازم خدمت بجالائے تھے یعنی (۱) عالمگیر اورنگ زیب (۲) شاہ عالم بہادر شاہ (۳) محمد معز الدین جہاندار

نمبر	نام	ازبطن	ولادت	تخت نشینی	وفات و مدفن	لقب بعد وفات
۲	قطب الدین محمد شاہ عالم بہادر شاہ (شاہزادہ محمد معظم) خلف دوم عالمگیر بادشاہ	نواب بائی (ہندو رانی)	۳۰ رجب ۱۰۵۳ھ مطابق ۱۴ اکتوبر ۱۶۴۳ء برہان پور دکن	دوشنبہ ۱۹ ربیع الاول ۱۱۱۹ھ مطابق ۷ جون ۱۷۰۷ء آگرہ شمار جلوس از ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ	دوشنبہ ۲۱ محرم ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۷ فروری ۱۷۱۲ء دہلی قطب صاحب	خلد منزل
۳	محمد معز الدین جہاندار شاہ فرزند بہادر شاہ (محمد معظم)	نظام بائی	۱۰ رمضان ۱۰۷۳ھ چہار شنبہ مطابق ۱۰ اپریل ۱۶۶۳ء دکن میں	آخر صفر یا ۱۴ ربیع الاول ۱۱۲۴ھ مطابق ۱۰ اپریل ۱۷۱۲ء سہ شنبہ لاہور شمار از ۱۸ محرم ۱۱۲۴ھ	۲۳ ذیحجہ ۱۱۲۴ھ کو یعنی آخر دسمبر ۱۷۱۲ء یا شروع جنوری ۱۷۱۳ء میں قتل ہوا	+
۴	معین الدین محمد فرخ سیر پسر عظیم الشان ابن شاہ عالم	صاحبہ نسواں	۱۸ رمضان ۱۰۹۸ھ مطابق ۱۸ جولائی ۱۶۸۷ء	۱۷ ذیقعدہ ۱۱۲۴ھ اکبرآباد جلوس جمعہ ۲۳ ذیحجہ ۱۱۲۴ھ مطابق ۹ جنوری ۱۷۱۳ء قلعہ دہلی	۱۸ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷ اپریل ۱۷۱۹ء یا ۹ رجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۶ مئی ۱۷۱۹ء کو قتل کیا گیا دہلی مقبرہ ہمایوں	شاہ شہید۔ ۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۷/۱۸ فروری ۱۷۱۹ء کو گرفتار و محبوس ہوا اسکے عہد میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو فرمان آزادی تجارت ملا تھا
۵	شمس الدین محمد ابو البرکات بادشاہ رفیع الدرجات پسر شاہزادہ رفیع الشان بن شاہ عالم	نور النسا	....	۱۸ ربیع الثانی ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۸ فروری ۱۷۱۹ء دہلی	۱۹ رجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۷۱۹ء دہلی، قطب صاحب	راجہ جیت سنگھ و رتن چند کے کہنے سے اور ہندوؤں کی اشتمالت کے لیے جزیہ اٹھا دیا تھا
۶	شمس الدین رفیع الدولہ محمد شاہ جہان ثانی برادر کلاں رفیع الدرجات	ایضاً	....	۱۹ یا ۲۰ رجب المرجب ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۸ مئی ۱۷۱۹ء	۷ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۶ ستمبر ۱۷۱۹ء دہلی قطب صاحب	x

شاہ۔ (۴) محمد فرخ سیر (۵) رفیع الدرجات (۶) شاہجہاں ثانی (۷) محمد شاہ۔ رفیع الدرجات اور شاہجہاں ثانی برائے چندے سریر آرائے فرمانروائی رہے تھے۔ غارت گر اجل نے اُنکو زیادہ فرصت و مہلت نہیں دی تھی۔ تاہم میر نے شاہجہاں ثانی کی شان میں اپنا زبردست قصیدۂ میمیہ لکھا تھا۔

جب میر عبدالجلیل محض طالب علم تھے اور اُن کو سید طفیل محمد کے ساتھ اکبر آباد جانے کا اتفاق ہوا تو نواب فضائل خاں کے یہاں بڑے بڑے علمی جلسے دیکھے۔ جماعت فضلاء کی اکثر نشست ہوتی۔ تفسیر و حدیث و کلام اللہ کا مذاکرہ ہوتا۔ ہر قسم کی چھیڑ چھاڑ رہتی۔ میر صاحب کو یہاں بھی بلند جگہ ملتی۔ وہ اپنی استعداد و قابلیت، یادداشت و جودت و ذہانت کی بدولت اکثر فائق و برتر رہتے۔

نواب آصف جاہ

نواب نظام الملک آصف جاہ طاب ثراہ کی نسبت میر غلام علی بلگرامی سرو آزاد میں لکھتے ہیں کہ

"بر واقفان اسرار سلطنت ہویدا است کہ در طبقۂ سلاطین تیموریہ و طبقات پیشیں امیرے بایں اقتدار چشم روزگار کم مشاہدہ کرد۔ قریب سی سال بایالت ممالک دکن پرداخت و قلمرو ے کہ زیر فرمان چندیں سلاطین ذوی الاقتدار بود تنہا در تصرف داشت و فتوحاتے کہ کارنامۂ روزگار باشد بجلوہ آمد۔ مستحقین را بخیرات و مبرّات فراواں نواخت۔ از دفتر صدارت تحقیق نمودہ شد کہ سہ لکھ روپیہ بدستخط او سوائے انعامات بادشاہی در صوبجات دکن بطریق یومیہ و روزینہ بارباب استحقاق می رسید وسوائے این قریب یک لکھ روپیہ بمردم رنج رود و غیرہم رعایت می فرمود"

۷۔ ابوالفتح ناصرالدین محمد شاہ بادشاہ معروف بہ سلطان روشن اختر پسر جہاں شاہ خجستہ اختر فرزند بہادر شاہ	نواب قدسیہ بیگم	۲۳/۲۴ ربیع الاول ۱۱۱۴ھ شب جمعہ مطابق ۷ اگست ۱۷۰۲ء نواحی غزنین	۱۵ ذوالقعدہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۲۹ ستمبر ۱۷۱۹ء اکبر آباد	۲۷ ربیع الثانی ۱۱۶۱ھ شب پنجشنبہ مطابق ۱۶ اپریل ۱۷۴۸ء	درگاہ نظام الدین اولیاء	فردوس آرامگاہ

سادات و علماء و مشائخ دیار عرب و ماوراءالنہر و خراسان و عراق عجم و ہندوستان آوازۂ قدردانی استماع یافتہ رو بہ دکن آوردند۔ و در خور قسمت حظے از احسان عام اندوختند۔"

نواب کے احوال ذاتی کے بیان سے پہلے اُن کے خاندان عالی اور آباء عظام اور بزرگان تمام کی نسبت گزارش کرنا ضروری ہے۔

صاحبقران ثانی (شاہ جہاں) کا وزیر اعظم سعد اللہ خاں، ان کا نانا (جد مادری) تھا۔ دادا کا نام عابد خاں تھا، پردادا شیخ عالم، اکابر رؤسا سمرقند اور شیخ شہاب الدین سُہروردی کی اولاد سے تھے۔

عابد خاں عہد شاہجہاں میں ہندوستان چلے آئے۔ یہاں ہوکر بادشاہ کی روشناسی اور شاہزادہ اورنگ زیب کی خدمت و ملازمت سے شرف و افتخار حاصل کیا۔ جب اورنگ زیب اور اُسکے بھائیوں سے محاربہ ہو رہا تھا یہ ملتزم رکاب تھے۔ اورنگ زیب، زیب دہ اورنگ ہوا تو ان کو چار ہزاری منصب عطا کیا۔ جلوس کے چوتھے سال میں صدارت کل کی خدمت پر ممتاز ہوئے۔ بعد ازاں پنج ہزاری منصب اور قلیچ خاں خطاب پایا۔ اعزاز و افتخار بڑھا۔ صدارت سے ایکبار علیحدہ ہوکر یہی عزت دوبارہ پائی۔ رعایا و برایا کو فور عدل و احسان سے شادکام و خوشدل بنادیا اور مہاد امن و امان بچھادیا۔ ؎

آرام یافت در کنف عدل وحش و طیر
و آسودہ گشت در حرم امن انس و جاں

قلعۂ گلکنڈہ (حیدرآباد) کے محاصرہ میں ۲۴ ربیع الاول ۱۰۹۸ھ (۲۸ جنوری ۱۶۸۷ء) کو توپ کا گولہ لگا۔ زخم کھایا اور جان عزیز اپنے شہریار اور اُسکی شہریاری پر نثار کردی۔

الولد سرٌ لابیہ۔ عابد خاں کے فرزند میر شہاب الدین نے بڑے بڑے مرتبے پائے۔ سات ہزاری منصب سات ہزار سوار، اور "غازی الدین خان بہادر فیروز جنگ" خطاب مرحمت ہوا۔ بیجاپور کی فتح میں اس شیر دل نے بڑی شجاعت اور مردانہ ہمت سے کام لیا تو "فرزند ارجمند" کا طرہ القاب سابق پر اضافہ ہوا۔ شاہ عالم کے عہد میں صوبہ داری گجرات پر مامور ہوئے اور اسی زمانہ حکمرانی گجرات ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں عالم آب و گل کو خیرباد کہا۔

نواب نظام الملک آصف جاہ نواب غازی الدین خاں کے خلف الرشید تھے۔ اصلی نام میر قمرالدین

اور سالِ ولادت سنہ ۱۰۸۲ھ (سنہ ۱۶۷۱ء) تھا۔ آغازِ شباب میں اس جوہرِ قابل پر خلد مکاں کی نظر پڑی
تو چار ہزاری منصب اور چین قلیچ خاں خطاب سے سرفراز فرمایا۔ واکنکیرہ کے قلعہ کی تسخیر میں کمال استقامت
وجوانمردی اور خوش نظمی دکھائی تو ہزاری اضافہ ہوکر پنج ہزاری منصب پر عروج پایا۔ خلد مکاں کی رحلت
پر شاہزادوں کے باہم تنازع دیکھا تو کمال حزم و احتیاط سے کام لیا اور کسی فریق کی جانب داری و
حمایت پسند نہ کی۔

شاہ عالم تخت نشین ہوا تو "خان دوراں بہادر" خطاب دیا اور صوبہ داری اودھ پر مع فوجداری
اودھ کے ممتاز کیا۔ اسوقت تک لکھنؤ کا فوجدار حضور عالی سے مقرر ہوکر آتا تھا۔ میر عبدالجلیل بلگرامی
نے اسی خطاب "خان دوراں بہادر" میں خطاب کی تاریخ پائی۔

نواب نظام الملک نے جب تھوڑے ہی دنوں میں امرائے جدید کا بازار گرم اور امرائے قدیم کا
کاسد دیکھا تو نوکری سے مستعفی ہوکر دارالخلافہ شاہجہاں آباد کو چلے آئے۔ درویشانہ لباس
پہن لیا اور خانہ نشین ہوگئے ؎

ازبال و پرِ غبارِ تمنا فشاندہ ایم … بر شاخِ گل گراں نبود آشیانِ ما

شاہ عالم کی رحلت پر جب محمد معزالدین نے چندروز کے لئے تاجِ تیموری پہنا تو عروسِ سلطنت
کے حبد بلند یا کمند مشکیں نے آصف جاہ کو گوشۂ عافیت سے باہر کھینچ لیا۔ اصل منصب و خطاب سابق
پر عنایت ہوا۔ ہندوستان کے فقرائے بے قید نواب پر طعنہ زن ہونے لگے کہ خرقۂ درویشی اتار کر لباسِ
دنیا اختیار کیا۔ اس جماعت کا طریقہ اگرچہ دریوزہ گری ہے لیکن ان حضرات کی وضع و غیرت بھی قابلِ
ستائش ہے کہ پھر اس وقت سے کبھی نواب نظام الملک کے روبرو دستِ سوال نہیں بڑھایا۔

جب محمد فرخ سیر تخت نشین ہوا تو "نظام الملک بہادر فتح جنگ" خطاب دیا۔ ہفت ہزاری منصب پر
ترقی دیکر انتظامِ دکن پر مامور کیا۔ فرخ سیر کے معزول ہونے پر اولاً حکومت مرادآباد بعد ازاں حکومت مالوہ
سپرد کی گئی۔ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۲۰ء) میں آصف جاہ دکن چلے آئے۔

دکن کے انتظام و تسلط میں سید دلاور خاں و سید عالم علی خاں وغیرہ سے سخت مقابلہ و مقاتلہ ہوا

نواب نے فتح پائی۔ اورنگ آباد میں داخل ہو گئے۔ امیر الامرا حسین علی خاں اپنے ایک عزیز اور ایک بھتیجے کے واقعات سنکر بیقرار ہو گئے۔ محمد شاہ کو ساتھ لیکر دکن جانے کا عزم کیا۔ لیکن تقدیر کا قلم سادات بارہہ کی دولت کے زوال کے لئے چل چکا تھا۔ اعتماد الدولہ محمد امین خاں کی تحریک سے میر حیدر کاشغری نے امیر الامرا کو خنجر سے ہلاک کر دیا۔ قطب الملک فوج لیکر مقابلہ کو بڑھا۔ لڑا اور گرفتار ہو گیا۔

محمد امین خاں (برادرزادہ نواب عابد خاں) کے انتقال پر نواب نظام الملک دکن سے دہلی چلے آئے اور خلعت وزارت پہنا۔ نواب نے عالمگیر کی آنکھیں دیکھی تھیں۔ اسکی آن بان اور شان حکومت پر فریفتہ تھے چاہا کہ اسکے آئین و قواعد کو جو ترک ہو گئے تھے تازہ کریں اور ازسرنو رواج دیں۔ خود غرض امرا نے اس کو اپنے مقاصد و اغراض کے منافی و مغائر سمجھا۔ بادشاہ کے مزاج کو نواب کی طرف سے گونہ منحرف کر دیا۔ اسی زمانہ (۱۱۳۵ھ یعنی ۱۷۲۳ء) میں حیدر قلی خاں ناظم گجرات نے بغاوت کی تو نواب اسکی تادیب کے لئے مامور ہو گئے۔ خود کام امیروں کو حضوری سے نواب کے ہٹانے کا موقع ملا۔ نواب اُدھر بڑھے تو حیدر قلی دیوانہ بن گیا۔ بات جہاں تھی وہیں رہی۔ نواب دہلی واپس چلے آئے۔ بجلدوی خدمت میں حکومت دکن و وزارت کے علاوہ صوبہ داری مالوہ و گجرات بھی مرحمت ہوئی۔ امرا کی سازش اور نفاق سے یہ بہت برداشتہ خاطر ہو رہے تھے۔ ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۴ء) میں جب نواب مبارز خاں جو سالہا سال سے ناظم حیدرآباد تھے معزول ہوئے تو نواب نظام الملک انکی جگہ تمام ممالک دکن کے حاکم مقرر ہوئے۔ نواب علی سبیل الاستعجال دکن کی سمت روانہ ہوئے۔ مبارز خاں نے مزاحمت کی مارا گیا اور ممالک[59] محروسہ نواب کے قبض و تصرف

نوٹ۵۹ حیدرآباد کی ریاست یا سلطنت انگریزی میں The Nizam's Dominions کہلاتی ہے۔ اس کا رقبہ بیاسی ہزار چھ سو اٹھانوے میل مربع ہے۔ رقبہ کے لحاظ سے اس کا قلمرو آئرلینڈ کے رقبہ سے ڈھائی گونہ (سے بھی) زائد اور انگلستان اور ویلس (دونوں) کے مجموعی رقبہ کے ڈیوڑھے سے زیادہ ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے علاء الدین خلجی نے ۶۹۳ھ (۱۲۹۴ء) میں دکن پر حملہ کیا۔ اُس وقت دیوگیری میں یادو نسل کا راجہ حکمران تھا۔ علاؤالدین نے اسکو مفتوح و مغلوب کیا۔ پھر دولت آباد پر مہم بھیجی بعد ازاں دارالملک محمد بن تغلق نے ان فتوحات کو اور بھی وسعت دیدی حتی کہ شمال سے جنوب تک کل دکن اسلام کے زیر نگیں ہو گیا۔
اس مردم خیز خطہ میں مسلمانوں کی متعدد سلطنتیں کسی وقت قائم تھیں۔

میں آ گئے۔ اب محمد شاہ بادشاہ نواب کی استمالت و دلداری اور بھی کرنے لگا ہمیشہ فرامین بھیجکر اظہار عنایات و نوازش کرتا۔ انعامات مخصوص مبذول ہوتے۔ اسی زمانے میں نواب نے آصف جاہ کے خطاب سے شہرت پائی۔ سنہ ۱۱۵۵ھ (سنہ ۱۷۴۲ء) میں بادشاہ نے بمبالغہ تمام نواب کو حضور میں

---

(۱) بہمنی جس کی بنیاد علاء الدین بہمن شاہ نے سنہ ۷۴۸ھ (سنہ ۱۳۴۷ء) میں ڈالی تھی سنہ ۹۳۴ھ (سنہ ۱۵۲۷ء) تک اس خاندان کے اٹھارہ بادشاہوں نے ایک سو چھیاسی سال (قمری یا ایک سو اسی سال شمسی سے زائد) فرمانروائی کی۔ دار السلطنت پہلے گلبرگہ تھا پھر بیدر ہوا۔ احمد آباد اسی خاندان کا آباد کیا ہوا ہے۔

(۲) عماد شاہی۔ ایلچ پور واقع برار دار الملک تھا۔ چار بادشاہوں نے سنہ ۸۹۰ھ (سنہ ۱۴۸۴ء) سے سنہ ۹۸۲ھ (سنہ ۱۵۷۴ء) تک سلطنت کی۔

(۳) عادل شاہی۔ دار السلطنت بیجاپور۔ دس بادشاہ۔ مدت دو سو دو سال۔ سنہ ۸۹۵ھ (سنہ ۱۴۹۰ء) سے سنہ ۱۰۹۷ھ (سنہ ۱۶۸۶ء) تک۔ اسکندر شاہ اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے سنہ ۱۰۹۷ھ میں قید کر لیا گیا تھا۔

(۴) نظام شاہی۔ احمد نگر۔ سنہ ۸۹۵ھ (سنہ ۱۴۹۰ء) سے سنہ ۱۰۴۳ھ (سنہ ۱۶۳۳ء) تک۔ مدت ایک سو سات سال۔ دس بادشاہ اس تخت پر بیٹھے۔ دولت آباد یا دیوگیر بھی مستقر سلطنت رہا تھا۔ اخیر فرمانروا بہادر بن ابراہیم شہنشاہ اکبر کے عہد میں گرفتار ہوا۔

(۵) برید شاہی۔ بیدر۔ سنہ ۸۹۷ھ (سنہ ۱۴۹۲ء) سے سنہ ۱۰۱۸ھ (سنہ ۱۶۰۹ء) تک۔

(۶) قطب شاہی۔ دار السلطنت گولکنڈہ تھا۔ دور حکومت سنہ ۹۱۸ھ (سنہ ۱۵۱۲ء) سے سنہ ۱۰۹۸ھ (سنہ ۱۶۸۷ء) تک رہا۔ سب سے اخیر بادشاہ ابوالحسن تانا شاہ نے سنہ ۱۰۹۸ھ میں بمقابلہ اورنگ زیب شکست پائی۔ اور گرفتار ہوا۔ حالت اسیری میں سنہ ۱۱۱۱ھ (سنہ ۱۶۹۹ء) میں فوت ہوا۔

دکن میں جب نواب آصف جاہ نے اپنی خود مختار سلطنت کی بنیاد ڈالی تو اولاً زیادہ وقت مرہٹوں کے استیصال میں صرف ہوا۔ پھر امرائے دربار نے حسد و رقابت کی وجہ سے سازش کرکے ایک نیا فتنہ برپا کیا۔ مبارز خاں صوبہ دار خاندیس کو مقابلہ و مجادلہ کی خفیہ تحریک کی۔ وہ شامت زدہ میدان میں آ گیا۔ شکر کھیلڈہ (فتح کھیلڈہ) واقع ضلع بلڈانہ ملک برار میں سنہ ۱۱۳۷ھ (سنہ ۱۷۲۴ء) میں معرکہ عظیم ہوا۔ مبارز خاں نے داد مبارزت دی مگر ملک اور جان دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ اسی لڑائی سے نواب کی آزادی و خود مختاری قائم و مسلم ہو گئی۔ اب نواب کے دائرہ حکومت میں برار بھی شامل اور سلطنت میں داخل ہو گیا۔ حیدر آباد دار الحکومت قرار پایا۔ انگریز مورخین لکھتے ہیں کہ انتقال کے وقت یعنی سنہ ۱۱۶۱ھ (سنہ ۱۷۴۸ء) میں وہ ایک سلطنت کے خود مختار و آزاد بادشاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ جن کی بادشاہی موجودہ ریاست بشمول صوبہ برار کے برابر وسعت و دوری میں تھی۔

سنہ ۱۲۰۵ھ (سنہ ۱۷۹۰ء) میں جب ٹیپو سلطان نے اپنی نصف جاگیر انگریزوں وغیرہ کے حوالہ کر دی تو نواب

طلب کیا۔ اپنے خلف الصدق نواب نظام الدولہ ناصر جنگ بہادر کو نیابت دکن پر مقرر کر کے خود بہ عجلت تمام دہلی کو روانہ ہوئے۔ بادشاہ کی ملازمت کا شرف حاصل کیا۔ نواب کی تشریف آوری کی تاریخ فضل علیخاں نے نظم کی ؎

صد شکر کہ ذات دیں پناہی آمد ۔۔۔ رونق دہ ملک بادشاہی آمد
تاریخ رسیدنش بگوشم ہاتف ۔۔۔ گفتا آیت رحمت الٰہی آمد

نواب نے کمال قدر دانی اور اپنی سخاوت جبلی سے ایک ہزار روپیہ نقد اور گھوڑا مع ساز نقرئی کے صلہ مرحمت فرمایا۔

دہلی میں دو ماہ قیام کرنے کے بعد بادشاہ نے نواب کو دکن کے مرہٹوں کی تنبیہ کے لئے رخصت کیا

بھی نظام کو رسدی حصہ ملا۔ لعبدازاں سنہ ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۹ء) میں سرینگاپٹم فتح ہوا اور ٹیپو سلطان نے شہادت پائی تو بروئے معاہدۂ میسور نظام کو علاقہ مفتوحہ میں معتد بہ حصہ ملا۔ چونکہ پیشوا اس عہد و قرار سے منکر و دست بردار ہو گیا اسلئے نظام کا حصہ اور بھی بڑھ گیا۔

ایک باقاعدہ اور منتظم سلطنت میں جتنے محکمے اور صیغے ہوتے اور ہو سکتے ہیں حیدرآباد میں سب موجود ہیں۔ علاقہ مال، پولیس، متفرقہ، فوج، منصب، خزانہ، ڈاک خانہ، ٹکسال، کرنسی، ریاست کی ریلوے، تعلیم، بندوبست، سروے (مساحت) صفائی (میونسپلٹی) تعمیرات و کارہائے رفاہ عام، صحت خلائق، رجسٹری وثائق وغیرہ۔ اور اعلیحضرت شہریار دکن ادام اللہ سلطنتہ ہر صیغہ و محکمہ پر بہ نفس نفیس توجہ اور التفات فرماتے ہیں۔

آثار قدیمہ و تاریخی سے کل ریاست مالا مال ہے۔ متفرق یادگاریں ہر طرف ادھر ادھر پھیلی ہوئی موجود ہیں۔ ان میں سے بہت زیادہ قابل لحاظ و ممنود غارہائے ایلورہ، اجنٹا، اورنگ آباد و عثمان آباد (دھرا سیو) ہیں۔ جو بودھوں اور جینیوں اور برہمنوں کے طرز تعمیر کے عمدہ نمونے ہیں۔ کثیر التعداد قلعوں میں سے گلکنڈہ، گلبرگہ، وارنگل، رائچور، مُدگل، پرینڈا اور نلدرگ بہت مشہور ہیں۔ ہندوؤں کے مناد ر اور معابد مختلف حیثیت، حالت اور قدامت کے، ریاست کے ہر ایک حصہ و سمت میں موجود اور بالکل محفوظ ہیں۔ مثلاً ہنم کنڈہ کا ہزار ستون والا مندر اور تُلجاپور اور امبا جوگئی کے مندر۔ ایک مندر مع اپنے ویران صحن کے قلعہ وارنگل کے اندر ہے۔ ان کے علاوہ بہت سے عمدہ اور نادر نمونے ہندوؤں کے مذہبی طرز تعمیر کے بھی ہیں۔

عہد اسلام کی قدیم اور بہترین عمارات یہ ہیں۔ گلبرگہ کے پرانے قلعہ کی مسجد اور مکہ مسجد، جامع مسجد، چار مینار، چار کمان، دار الشفا (بیمارستان) موسٰی ندی کا پرانا پل (یہ سب حیدرآباد میں ہیں) قطب شاہی خاندان کے بادشاہوں

نواب جلد جلد منزلیں طے کرتے ہوئے بھوپال پہونچے۔ دوسری طرف سے مرہٹوں کی فوج آئی مقابلے باہم ہوئے اور سخت ہوئے۔ نادرشاہ کے آنے کی خبر گرم تھی اسلئے نواب نے مصالحت منظور کرلی اور دہلی واپس چلے آئے۔ نادرشاہ آیا اور جو کچھ کرنیوالا تھا کر ڈالا۔ لیکن باایں ہمہ تمام امرا کی بہ نسبت نواب کے ساتھ بڑی رعایت مدارا کرتا تھا۔

پاس آداب بزرگاں ہے یہ ایں وضع جنوں   جب ملے ناصح جھکے ہم بندگی کے واسطے

اب امیر الامرا کا منصب بھی نواب کے دیگر مراتب کے ساتھ شامل کردیا گیا۔

۱۱۵۳ھ (۱۷۴۰ء) سے لیکر ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) تک نواب مبرور انتظامات ملک دکن و استیصال باغیان میں مصروف رہے۔ احمد خاں ابدالی کا کابل سے آنا سنا تو برہان پور آئے وہاں معلوم ہوا کہ احمد شاہ

کے مقبرے جو گلکنڈہ کے پاس ہیں۔ بہمنی اور بریدشاہی سلاطین کے مقابر جو شہر بیدر کے متصل ہیں۔ اورنگ آباد میں اورنگ زیب کی ملکہ رابعہ دورانی کا مقبرہ۔ ان کے سوا ہندوانہ اور اسلامی ساخت کی عمارات کے بہت سے نمونے ہیں جو اب شکستہ حالت میں ہیں۔ مثلاً محلات گلکنڈہ و بیدر و گلبرگہ و دولت آباد۔

زبانوں میں سے زیادہ تر اردو، مرہٹی، کناری، تلنگو اس ملک میں بولی جاتی ہیں۔

سب سے پہلے ۱۸۳۴ء میں انگریزی کی تعلیم حیدرآباد میں شروع ہوئی اور اب تو کثیر تعداد میں کالج اور مدرسے اور انگریزی خانقاہیں ریاست کے مختلف جوانب میں قائم و جاری ہیں۔ جامعہ عثمانیہ کل ہندوستان بلکہ اقلیم ایشیائی میں اپنے طرز اور جامعیت کی ایک ہی یونیورسٹی ہے۔

زراعت فلاحت اور نصب درختان نے اعلیٰ حضرت دام دوامہ کے عہد دولت مہد میں بہت ترقی کی اور عروج پایا ہے۔ امدادی بنکیں کھلی ہوئی ہیں۔ مزارعین کی اعانت و فلاح اور عطائے تقاویات کا مکمل انتظام ہے۔ حیدرآباد کے حکمرانوں اور انکے امرا و وزرا نے بڑے بڑے تالاب اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ جیسے حسین ساگر، ابراہیم پٹن، میر عالم، افضل ساگر، حمل پلی وغیرہ۔

دکن کے یابو اپنی جفاکشی اور قوت برداشت و تیز روی کے لئے مشہور ہیں۔ عرب اور آسٹریلین نسل کے گھوڑے باہر سے آتے ہیں انکی نسل کی افزائش یہاں بھی ہوتی ہے۔ گھوڑوں اور مواشی کی تجارت نہ صرف شہر و قصبات بلکہ دیہات میں بھی روبہ ترقی ہے۔

معدنیات کے لحاظ سے یہ ریاست نہایت زرخیز ہے۔ کوئلے کے معادن ورنگل میں اور سونے کی کان لنگسگور میں بہت وسیع ہیں۔ سنگارینی میں بھی کوئلہ کی کان ہے۔ لوہے اور تانبے کی کانیں بھی اس ریاست میں بکثرت ہیں

نے فتح پائی۔ احمد خاں ابدالی شکست کھا کر کابل واپس چلا گیا۔ اسی حالت میں نواب یہاں ایک مرض میں مبتلا ہوئے۔ ۴ جمادی الآخرہ سنہ ۱۱۶۱ھ (۲۲ مئی سنہ ۱۷۴۸ء) کو وقت عصر راہگرائے ملک جاوداں ہوئے۔

آزاد لکھتے ہیں کہ نعش اٹھانے کے وقت خلق سے اس قدر شور و غریو برپا ہوا کہ زمین و زماں لرزہ میں آگئے بڑے بڑے اولیاء کرام و صلحاء عظام اور امرائے با احتشام جنازۂ مبارک کو ایک میدان وسیع تک دوش بدوش لے گئے۔ وہاں نماز ادا کی پھر شاہ برہان الدین غریب قدس سرہٗ کے روضۂ مطہرہ میں لائے اور پایان مرقد شیخ نائل بہ قبلۂ راحت کدۂ ابدی میں پیکر عالی کو پہونچا دیا۔ "متوجہ بہشت" (سنہ ۱۱۶۱ھ) تاریخ رحلت ہے۔

مسلمان اور ہندو تذکرہ نگاران کو چھوڑ دیجئے انگریز مورخین بھی نواب کو بڑی عظمت و احترام سے یاد کرتے اور اُن کی شجاعت و بسالت اور حسن تدبیر و دانائی و فرزانگی کی نہایت تحسین و ستائش کرتے ہیں۔ ہندوستان کا امپریل گزیٹیر

(*a*) A Distinguished general of Aurangzeb

(*b*) Distinguished alike in war and political sagacity

لکھکر ان چند منتخب و ممتاز الفاظ میں آپ کا نام نامی لیتا اور اپنا فرض مردم شناسی ادا کرتا ہے۔

نواب کی طبیعت نہایت موزوں واقع ہوئی تھی۔ آپ کے نتائج طبع سے ایک دیوان ضخیم یادگار ہے سنہ ۱۱۳۴ھ (سنہ ۱۷۲۲ء) میں جبکہ نواب بہ تقریب وزارت دکن سے شاہجہاں آباد تشریف لائے

پیداوار معدنی میں بالخصوص ہیرا، سونا اور کوئلہ داخل ہیں۔

تجارت اور مصنوعات میں لٹھ، گوٹہ، لیس، اور بدری کی اشیاء ہیں۔ نہایت بیش قیمت چیزیں ہر قسم کی اور اعلیٰ درجہ کے قالین اور غالیچے یہاں تیار ہوتے ہیں۔

ڈاک کا محکمہ اور طریقہ اس ریاست میں اپنے قلمرو کے لئے خود اپنا قائم ہے اور ڈاک کے ٹکٹ بھی اپنے ہی جاری ہیں۔

اس سرکار ابد قرار کی فیاضیاں، عطیات، وظائف اور مدد معاش، اوقاف، جاگیر و مستعان پوری تفصیل اور مکمل بیان کی مستحق ہیں۔ مگر ان سطور و صفحات میں گنجائش کہاں۔

ریاست کا سکہ جو حالی سکہ کہلاتا ہے سنہ ۱۸۵۸ء سے جاری ہے۔ وقتاً فوقتاً اُسکی شان اور وضع میں اصلاح اور تزئین ہوئی جو یہ روپیہ اور عثمانی سکے مضروب و رائج ہوئے ہیں سکہ کے ایک رخ پر چار مینار کی شکل منقوش ہے۔

ہوئے تھے اور میر عبد الجلیل بھی مع اپنے دونوں نواسوں کے وہاں وارد تھے نواب نے اپنا ایک شعر مجمع شعرا میں پیش کیا اور غزل پوری کرنے کی خواہش کی ؎

امروز کہ آئینۂ گلزار بدست است | کے سوئے چمن می رود آن دست حنائی

اور اپنا یہ مصرع بھی پڑھا تاکہ کوئی صاحب پیش مصرع لگا سکیں تو لگا دیں ع

گل آئینہ از آب رخ او تازگی دارد

اس مصرع کا قافیہ صعوبت و دشواری سے خالی نہ تھا۔ نواب امین الدولہ وقائع خوان حضور معلی نے میر عبد الجلیل سے تحریک کی اور اسکی انجام دہی کے لیے تکلیف دی۔ میر نے اسی زمین میں پورا قصیدہ لکھ ڈالا۔ مطلع یہ ہے ؎

تا حسن ترا مشعل انوار بدست است | مہر ہمہ شب کاسہ گدا وار بدست است

اور جس مصرع کو پیش کیا تھا اس پر پیش مصرع بھی لگا دیا اور کچھ شعر اور لاحق کرکے غزل تمام کر دی۔ تین شعر نقل کیے جاتے ہیں ؎

رخ او از بہار حسن زیبا ماندگی دارد | گل آئینہ از آب رخ او تازگی دارد
زہم پاشید اوراق دل صد لخت نادیدم | کتاب حسنت از چین جبیں شیرازگی دارد
بفکر صاف نواب نظام الملک می نازم | کہ فطرت از خیال او بلند آوازگی دارد

نواب امین الدولہ نے وہ قصیدہ اور غزل نواب نظام الملک آصف جاہ کے روبرو پیش کی۔ بغایت محظوظ ہوئے اور ملاقات کے لیے تکلیف دی اور اصرار فرمایا۔ مجبورانہ میر صاحب نے ایک دوسرا قصیدہ مدحیہ تیار کیا اور ایک شب کو امین الدولہ کے ساتھ نواب کی مجلس میں پہونچے۔ نواب نے واذا اتاکم کریم قوم فاکرموہ پر عمل فرمایا اور اندازہ اور توقع سے زیادہ اعزاز و احترام کیا اور اپنے برابر بے فاصلہ جگہ دی۔ جب قصیدہ کی کیفیت معلوم ہوئی اور کاغذ پر نگاہ پڑی تو شمع قریب منگا کر پڑھنے کے لیے اشارہ کیا۔ ہر ایک شعر کو کمال اطمینان و جمعیت خاطر کے ساتھ آہستہ آہستہ سنتے اور سمجھتے رہے مضامین رنگین اور ترکیبات دلکش کی تحسین و آفرین کی۔ قصیدہ سننے کے بعد پانچ ہزار روپیہ اور خلعت وا

وجہ صلہ میں دینا چاہا۔ میر صاحب نے اپنے ضابطہ قدیم کے مطابق اسکو بھی قبول نہیں کیا۔

یہ قصیدہ بھی بڑے زور کا ہے اور محاسن و تکلفات شاعری سے مملو۔ اس میں عربی و فارسی و ترکی و ہندی چاروں زبانوں میں کمن سال و کہنہ مشق سخنور کی قوت تخیل و توصیف جلوہ افروز ہے اس لئے نقل کیا جاتا ہے ؎

بہار آمد و واکرد غنچہ بند قبا
گرہ ز خاطر بلبل کشود فیض صبا

ز بسکہ سبزہ و گل در چمن ہجوم آورد
نسیم کرد بصد حیلہ جائے خود را وا

گرفت قہوہ بکف در پیالۂ یاقوت
برائے شاہد نوروز لالۂ حمرا

بہ بیں بہ لالہ و تحریک غنچہ در ہر برگ
چو طوطئے کہ ز منقار واکند پرہا

شکنج طرۂ سنبل کمند صید نظر
نگاہ دیدۂ نرگس فسون ہوش ربا

دمید نغمہ ز منقار بلبل خوشگو
چو گلبنے کہ ازو بشگفد گل رعنا

فزود حسن چمن از سحاب گوہر بار
چنانچہ شان وزارت ز عمدۃ الوزرا

نظام ملت و ملک افتخار اہل کرم
قوام دین و دول آفتاب مجد و علا

بود بحسن وزارت بہ از نظام الملک
کہ نقش ثانی بہتر کشد نگار آرا

مشابہ کف او بحر چوں تواند شد
کہ نقص خزر بود مد بحر را بقفا

حباب نیست کہ بحر از تشبہ کف او
کلاہ فخر بینداخت از خوشی بہ ہوا

رسن ز موج زدہ بر میان بکف کشتی
کزو سوال کند چوں قلندر دریا

ز بیم کثرت جودش محیط نالہ کند
گواہ اوست برین بیم رعشۂ اعضا

گرفت خنصر یمنی خرد ز دانشش او
چنانکہ خلق ز جودش اصابع یسریٰ

رسیدہ است بجائے تقدس ذاتش
کہ چوں ملک بود از جنس انس مستغنا

چو او ندیدہ امیرے مہذب الاخلاق
بعینک مہ و مہر این سپہر پشت دوتا

مثال روح مصور بود بہ پاکی ذات
نشان عقل مجسم بود بہ فہم و ذکا

چکد ز سنبل و گل شیشه شیشه عنبر و عطر — چو گرم جوشی خلقش شود چمن پیرا

صفاے آئینه راے او بود چنداں — که می نماید از و آنچه رود هر فردا

کرم ز دست گهربار او بود ممنون — ظفر به تیغ چمن کار او بود شیدا

تعجب است ز شمشیر آتش افروزی — که جاے تیغ کف است و کف است بحر عطا

گره گره بود نیشترهٔ عدو شکنش — که بند گشته در رگ جا بجا دل اعدا

گه سبز دبود همچو ابر صاعقه بار — کماں چو قوس قزح تیر چوں شهاب رسا

هزار شکر که مسند وزارت یافت — هماں که یافت تن عاذرا ز دم عیسیٰ

برسم جشن طرب چید بزم رنگینے — که از تصور آں خامه گشت شاخ حنا

ترانه سنج ز هر غوله ساخت چو گانے — ربوده گوی دل سامعاں بحسن ادا

سپهر شد همه تن دیدهٔ تماشائی — پیے نظارهٔ این محفل نشاط افزا

بو قولبا و تو توک دن چو چوک توشوق حیدری — تو ادیحی تولود تو توک ایلدی نیشکر موندا

توشوق نسیم دن آچیلدی کوپ کل بندنک — چینور تقتلغ بولسون بلند قلدی نوا

محیط مدحت او را کرانه پیدا نیست — بزورق قلمی چوں تواں نمود شنا

شعار من نبود شعر لیس کنم زیں حرف — که اهل فضلم و خواہاست ز اهل فضل دعا

اَقُولُ وَفَّقَكَ اللّٰهُ دَائِمًا بِالْخَيْرِ — لِانْتِظَامِ[۹۱] اُمُورِ الْاَنَامِ فِي الدُّنْيَا

اَدَامَ قَدْرَكَ فِي الْجَاهِ مَا سَمَا الْاَفْلَاكُ — وَشَدَّ اَزْرَكَ بِالْعِزِّ مَا رَسَتْ رَضْوٰى

فَاَنْتَ خَيْرُ ظَهِيرٍ لِمَنْ رَمَاهُ الدَّهْرُ — وَاَنْتَ خَيْرُ نَصِيرٍ لِزُمْرَةِ الضُّعَفَا

قَدِ اسْتَجَابَ دُعَائِي اِلٰهُنَا الْمُتَعَالُ — بِمُرْسَلٍ عَرَبِيٍّ وَّآلِهِ النُّجَبَا

ز فضل گر گرزم تیغ و نیزه می گیرم — که بر جلادت من شاهد اند ایں دو گوا

ز ذو الفقار چو برهان قاطعے دارم — ببرد ز معرکه فیصل نمایم ایں دعوی

---

۹۱ انتظام را فتعال کا ہمزہ وصلی ہے۔ گرنا چاہیے تھا یہاں باقی رکھا گیا ہے۔ ضرورت شعری سے مجبوری ہے۔

قلم نوشت برائے وزارتش تاریخ
"وزیر کشورِ ہند آصف دوام البقا"
۱۱۶۶ — ۳۴

"ہزار و یکصد و سی و چہار نصّ نشاط"
۱۱۳۴ — ۳۴
دو گونہ جوہر تاریخ از د شود پیدا

نظمت فی العربی الفصیح تاریخًا
جَلِیٌّ وِزَارَتُہٗ سَاکِبُ الرَّبِیع لَنَا
۱۱۳۴

اسیں دے کے کہی ہندوی موں یوں سنبت[۱۷۹۲]
"رہے جگت موں اچل باس یہہ وزیر سدا"

خرد بجامۂ عبدالجلیل کرد ارشاد
کہ ختم کن بدعا ایں قصیدۂ غرا

ملائک از پئے آمین ایں دعا شدہ اند
برنگ نرگس و گل چشم و گوش فوق سما

ہمیشہ ہر دو زہم شاد و کامران باشند
دے از وزارت واز دے وزارتِ اعلیٰ

نواب آصف جاہ جیسے خود سخن سنج اور سخن فہم امیر تھے ویسے ہی قدر شناس اہل کمال بھی تھے۔ مرزا بیدل سے تلمذ تھا شاکر تخلص فرماتے۔ مرزا صاحب جب ان کے یہاں جاتے تھے تو نواب اُن کی بڑی تعظیم و تکریم فرماتے۔ استقبال و مشایعت کرتے اور اپنی مسند پر بٹھاتے تھے۔ مرزا کے نشاآت میں کئی رقعے چین قلیچ خاں کے نام ہیں جو نواب کا پرانا خطاب تھا۔

۱۷۹۲ سمبت، ہندی میں سال کو کہتے ہیں۔ راجہ وکرماجیت کا سمبت تقریباً پونے ستاون (۵۶ ۳/۴) برس قبل حضرت مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ میرے حساب سے اُس وقت ہندی سمبت ۱۷۸۰ رہا ہوگا۔

سادات بارہہ

خلد مکاں عالمگیر نے اپنی وصایا میں شاہزادۂ عالیجاہ محمد معظم (بہادر شاہ) کو تحریر کیا تھا:-

"نہم آنکہ با سادات لازم کہ آں سعادت نشان بموجب آیۂ کریمہ قُل لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا ٱلْمَوَدَّةَ فِى ٱلْقُرْبَىٰ محبت ایں جماعہ کہ اجر نبوت است ہرگز مقصر نباید بود کہ ثمر خیر دنیا و عاقبت است لیکن با سادات بارہہ کمال احتیاط باید نمود و در محبت ظاہری و باطنی قصور نباید کرد و بحسب ظاہر مرتبہ اینہا را نباید افزود کہ شریک غالب بلکہ شریک ظالم۔ بلکہ اگر اندک استرخائے عنان شود ندامت فائدہ ندارد۔ مصرع۔ دریغ سود ندارد چو رفت کار از دست"

"نویں یہ کہ اُس سعادت مند فرزند کے لئے لازم ہے کہ سادات کے ساتھ محبت رکھنے میں ہرگز کوتاہی نہ کریں جو آیۂ قرآنی کے بموجب رسالت کا اجر قرار پائی ہے [(اے پیغمبران لوگوں سے) کہہ دیجئے کہ میں تم لوگوں سے اِس (تبلیغ رسالت) پر کوئی مزدوری تو مانگتا نہیں مگر رشتے ناطے کی محبت (تو قائم رکھو) (جزیرہ ۲۵۔ سورۃ الشوریٰ ع۔۳-۴م)] کیونکہ اس سے دنیا اور آخرت کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ لیکن سادات بارہہ کے ساتھ نہایت احتیاط رکھنا چاہئیے، اور ظاہری و باطنی محبت میں کمی نہ کرنا چاہئیے البتہ اُن کا ظاہری مرتبہ نہ بڑھانا چاہئیے کیونکہ یہ لوگ شریک غالب بلکہ شریک ظالم ہوتے ہیں اور اگر ان کی باگ ذرا بھی ڈھیلی کردی تو پھر پشیمانی سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔"

سادات صحیح النسب کے بارہ گاؤں دریائے گنگ و جمن کے مابین ضلع مظفر نگر میں مدتہائے دراز سے مشہور و معروف ہیں۔ اکبر کے عہد میں یہ قطعہ سرکار سہارنپور میں داخل تھا۔ یہاں کے سادات شجاعت و بہادری میں ہمیشہ ممتاز و نامور رہے ہیں۔ ان کے اسلاف کی نسبت کہا گیا ہے کہ سنہ ۷۵۱ھ (سنہ ۱۳۵۰ء) کے قریب یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ اُس وقت دہلی میں سادات کا خاندان فرمانروا تھا۔ اُس خاندان نے سرپرستی فرمائی تو ان غریب الدیار سیدوں نے اپنے جوہر دکھائے اور اعزاز و عروج

خوب بڑھا۔ سنہ ۸۱۸ھ (سنہ ۱۴۱۵ء) میں سلطان خضر خاں نے سہارنپور کی حکومت و نگرانی سید سلیم کے سپرد کی۔ دہی اُس وقت اس خاندان کے مقدم و پیشوا تھے۔ اُس کے بعد ان سادات کا اثر دربار اور اہلِ دربار پر برابر بڑھتا رہا۔

اس دلاور طبقہ نے بڑے بڑے کارہائے نمایاں کئے ہیں۔ چنانچہ سید محمود بارہہ جو سکندر شاہ سوری کے ساتھ قلعہ مان کوٹ میں محصور تھا مجبور ہو کر اکبری فوج سے آکر ملا اور اُس کی ملازمت اختیار کی چار ہزاری منصب تک پہونچا۔ سید ہاشم اس کے بیٹے نے بھی باپ کے برابر رتبہ پایا۔ اور سرکاری خدمت میں جان دی۔ سید احمد، سید راجو، سید عبدالمطلب اور سید عبداللہ خاں (اول) کے کارنامے عہد اکبری کے ہمیشہ بہار چمن سمجھے جاتے ہیں۔ عبداللہ خاں کو بادشاہ نے داؤد خاں باغی بنگالہ کے استیصال کے لئے بھیجا تھا۔ سید محمود کو مع افواج شاہی کے پٹن میں مرزایان و شیر خاں فولادی نے گھیر لیا۔ عبدالمطلب خاں عین وقت پر مدد کو پہونچا اور بادشاہی شان و شوکت کو قائم و برقرار رکھا۔ رانائے میواڑ کے مقابلہ میں (اُسی اکبری عہد میں) سادات بارہہ نے بڑی مردانگی و بہادری سے کام لیا تھا اور کمال ثابت قدمی سے لڑے تھے۔ سادات بارہہ کے بہت سے نام آئین اکبری میں بزرگان جاوید دولت کے ذیل میں ملتے ہیں۔ سنہ ۱۰۱۸ھ (سنہ ۱۶۰۹ء) میں جہانگیر نے سید سیف خاں بارہہ کو شاہزادہ پرویز کا اتالیق مقرر کر کے لشکر جرار کے ساتھ خانخاناں کی مدد کے لئے دکن کی مہم پر بھیجا تھا۔ مرزا عزیز کوکلتاش کا یہ قول بالکل سچا تھا کہ "سادات بارہہ دولت اکبری پر فدا ہیں۔"

اکبر اور اُس کے عالی حوصلہ اخلاف کے زمانہ میں اس خاندان نے بڑے بڑے عہدے اور منصب اور وسیع جایدادیں اور جاگیریں پائی تھیں اگر ایک طرف منتظمین و مدبرین سلطنت کی حیثیت سے سارے شاہی قلمرو میں ان کی شہرت و نیکنامی کا سکہ چل رہا تھا تو دوسری طرف فوجی بہادر اور دلیر سپاہیوں کے طور پر دریائے سندھ سے نربدا تک ہندوستان ان کے گھوڑوں کا جولانگاہ بنا ہوا تھا۔ انھیں کی قوت و بسالت کا نتیجہ تھا کہ بہادر شاہ اول نے سنہ ۱۱۱۹ھ (سنہ ۱۷۰۷ء) میں آگرہ فتح کیا اور تاج و تخت کا مالک ہوا۔

اسی تذکرہ کے صفحات سے واضح ہوگا کہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۲ء) کے انقلابات اور فرخ سیر کی تخت نشینی میں بھی سادات بارہہ کا ہاتھ کام کر رہا تھا جس کے صلہ و جلدو دے خدمت میں سید عبداللہ خاں (دوم) وزیر مطلق اور سید حسین علی خاں سپہ سالار اعظم (کمانڈر ان چیف) بنا دیے گئے تھے۔ مگر اس کے بعد ہی زوال شروع ہوگیا اور سادات بارہہ کی قوت اور جمعیت ان کے مخالف و معاند وزیر قمر الدین خاں کی تدابیر اور دراندازیوں سے منتشر و پراگندہ ہوگئی حتیٰ کہ ۱۱۵۰ھ (۱۷۳۷ء) میں اس خاندان کا تعلق دہلی اور سلطنت سے بالکل قطع ہوگیا۔

سادات بارہہ سے تعلقات

میر عبدالجلیل کے تعلقات و روابط سادات بارہہ سے نہایت صادق و راسخ تھے۔ ان دونوں بھائیوں کے ساتھ جس شان واخلاص و عقیدت کے ساتھ انھوں نے نباہی اور جو اختصاص و احترام انھوں نے مبذول رکھا صفحات تاریخ پر یادگار و مرتسم رہے گا۔ تفصیل اوراق آئندہ میں ملے گی۔ ایک وجہ موافقت یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ سادات بارہہ کا نسب اوپر جاکر سید ابوالفرح واسطی سے ملتا ہے جو سید محمد صغرے بلگرامی کے بھی مورث تھے۔ گویا سادات بلگرام اور سادات بارہہ ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ضلع ہردوئی کا گزیٹیر بعنوان "باشندگان" بذیل "سادات" رقم طراز ہے:۔

> "بلگرام اور شاہ آباد میں زیدی زیادہ ہیں۔ اس سے اس روایت کا ثبوت ملتا ہے کہ خاندان بلگرام کا تعلق سادات بارہہ مظفر نگر سے ہے۔ زیدی سادات اضلاع مظفر نگر و میرٹھ و بجنور میں زیادہ تعداد میں پائے جاتے ہیں۔ ضلع ہردوئی میں عموماً اور پرگنہ جات سنڈیلہ و بلگرام میں ان کے پاس زمینداری بھی بہت ہے" ....

> "سادات کا خاندان سید محمد صغریٰ کی اولاد میں ہے جو بعہد التمش بلگرام میں آئے ۶۱۴ھ کو

اس مقام کی فتح کے بعد ایک جاگیر وسیع ملی جو اب تک اُن کے احفاد کے قبضہ میں ہے........
بلگرام کے شجرہ سے پایا جاتا ہے کہ محمد صغری کی چھٹی پشت میں سید ابوالفرح واسطی تھے انھیں کی نسل میں مظفر نگر کا مشہور خاندان بارہہ بھی ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو اُن کا لڑکا داؤد سادات بلگرام اور رتھان پوری شاخ نسل بارہہ دونوں کا مورث ہوگا"

آغاز

میر عبدالجلیل اور نواب دلیر دل خاں سے بھکر میں روشناسی ہوگئی تھی۔ اسی وسیلت شناسائی سے نواب بخشی الممالک امیر الامرا کی ملازمت میں میر پہونچے۔ دِلّی کا قیام ادھر بیماری سے مجبور اُدھر بیکاری سے پریشان۔ جب بیماری سے کچھ فرصت پاتے تو دلیر دل نواب کے ہمراہ جاکر امیر الامرا کے مجرائی ہو جاتے۔ ایک نفیس قصیدہ (یا خود انھیں کے الفاظ میں "ایک رنگین کاغذ") امیر الامرا کے لئے تیار کیا تھا جس کو دیکھکر فضلائے دہلی متعجب تھے۔ دلیر دل خاں نے اُسکی تقریب کی۔ امیر الامرا نے فرمایا کہ صبح جب فضلائے وقت یکجا ہوں تو پیش کیا جائے۔ روزوں کی وجہ سے وہ صحبت منعقد نہ ہوسکی اور نہ رمضان بھر وہ کاغذ نظر سے گذر سکا۔ اِدھر نواب دلیر دل خاں آخر رمضان میں صوبہ دار مقرر ہو کر چلے گئے۔ اور اُردوے معلّےٰ (پایۂ تخت) میں میر عبدالجلیل کا جو کچھ سہارا یا مربی تھا رخصت ہو گیا۔ مگر نواب صاحب چلتے وقت امیر الامرا سے "پروانگی مجرا" لے کر ان کو دیتے گئے تھے۔ چنانچہ اُن کی روانگی کے بعد میر صاحب نے دو تین بار حاضری دی۔ عید کے دن رباعی تہنیت بھی پیش کی۔ اس مبارکباد کو مطالعہ فرما کر متبسم ہوئے اور کہنے لگے کہ "نہایت خوب کہی ہے" حسب دستور میر صاحب تسلیمات بجا لائے۔ امیر الامرا نے بیٹھ جانے کے لئے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اُس زمانہ میں اُن کے جبروت کا یہ اقتضا تھا کہ اگر کسی کی طرف اتنا بھی متوجہ ہو جاتے تو گویا اُس کو نہال کر دیتے تھے۔ ع

اُن کا نہ دیکھنا نظر التفات تھا

رباعی یہ تھی ؎

نواب فلک رتبہ امیر الامرا ہر حرف زعید بجرا بہ شد ایما

عین از عیش و یاز یمن است نشاں   دال آمدہ رمز دولت فیض آرا

جس زمانہ میں میر عبدالجلیل دہلی میں مقیم اور مبتلائے بخار تھے۔ امیر الامرا کے مشکوئے معلّٰے میں لڑکا پیدا ہوا۔ اس سے قبل جو اولاد ہوئی تھی اُنکی ولادت میں بڑی خوشی و شادمانی کیگئی تھی۔ ضیافت و انعامات میں زر خطیر خرچ کیا گیا تھا۔ مگر کسی بچہ نے زندگی نہیں پائی اور والدین کو مفارقت کا داغ دے گئے۔ اس لئے اس بچہ کے پیدا ہونے پر نواب نے نہ کسی کی نذر لی نہ کچھ خوشی کی میر عبدالجلیل نے عربی فارسی و ہندی میں علیٰحدہ علیٰحدہ رنگ سے تاریخ تولد باسلوب دعا لکھی اور دربار میں پیش کی۔ نواب نہایت محظوظ ہوئے۔ مولوی جیون اور جُو جُو صاحب کہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے دیکھکر بہت خوش ہوئے۔ مولوی صاحب نے سب کے سامنے فرمایا کہ "ہمکو تمہاری ذات پر افتخار ہے کہ ہمارے زمانہ میں تم جیسے اہل استعداد موجود ہیں"

فی العربیۃ ؎

نال[۹۳] امیر الامرا[۹۴] نعمۃ   وھی قدوم الولد المستنیر
ارّخ فی ذاک عبد الجلیل   امتعہ اللہ بعمر کبیر ۱۱۲۶ھ

فارسی ؎

گلے شگفتہ بگلزار خاندان حسین   زمانہ شد بہ دوام بقائے اُو ضامن
فرشتہ آمین[۹۵] گفتا چو گفتم ایں تاریخ   ہزار سال شود عمر ایں گل آمن[۹۶] ۱۱۲۶ھ

۹۳ امیر الامرا ایک نعمت پر پہونچا۔ یہ نعمت فرزند روشن کا آنا ہے۔ اس بارہ میں عبدالجلیل نے تاریخ کہی۔ اللہ تعالیٰ اسکو عمر دراز نصیب فرمائے۔

۹۴ الامرا کی ہمزہ کا حذف کرنا عربی ترکیب میں محل اعتراض ہے۔ وزن جمع الف ممدودہ کے ساتھ ہے نہ کہ الف مقصورہ کے ساتھ۔ ضرورت شعری کی توجیہ بھی ضعیف ہے۔

۹۵ موزونی مصرع میں تامل ہے۔ آمین اسم فعل ہے، بمعنی دعا کو قبول کر یا ایسا ہی ہو۔

۹۶ آمن بمدِ الف و کسرہ میم۔ اَمن کا اسم فاعل جو بحالت امالہ امین ہو جاتا ہے۔ آمن و امین بے خوف و بے دہشت

ہندی سے

پتر جنم سینت کھوں، ہنس جبین مہیپ
چیر بجیو جُگ جُگ صدا بہ پیتر کل دیپ ۱۱۲۶ھ

سوانح نگاری بھکر و سیوستان اور بخشی گری و وقائع نگاری سرکار سیوستان سے میر عبدالجلیل کی معزولی خدمت کی وجہ یہ تھی کہ پرگنہ جنوبی (سرکار بھکر) میں ایک بار بارش ہوئی جس کے قطرے درختوں کے پتوں پر منجمد ہوگئے جو رنگ و ذائقہ میں نبات (مصری) سے اصلاً تفاوت نہ رکھتے تھے میر صاحب نے یہ رباعی کہی اور فرد سوانح میں لکھدی سہ

فرخ سیر آن شہنشہِ بابرکات ۔۔۔ چرخ از ادب او شدہ شیریں حرکات
در سندِ زمیں عہد عشرت مہدش ۔۔۔ باراں بارید ریزۂ قند و نبات

اتفاقاً اس رباعی کا تذکرہ دربار امیر الامرا میں آگیا کہ اس پر میر جملہ نے اعتبار نہ کیا اور عرض والا میں پہونچایا تھا۔ شعیب خاں نے امیر الامرا سے عرض کیا کہ فلاں نے خوب رباعی کہی ہے جو سننے کے قابل ہے نواب صاحب میر عبدالجلیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ انھوں نے رباعی پڑھ دی اور ساری روداد عرض کی۔ رباعی بہت پسند کی اور وہ "فرد رباعی" (پرچہ) اُسی طرح ہاتھ میں لئے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ظاہر النواب قطب الملک (وزیر اعظم) اُسی روز امیر الامرا کے یہاں آگئے تھے۔ انھوں نے تخلیہ میں فرد مذکور قطب الملک کے حوالہ کی اور کہا کہ یہ مقدمہ عرض معلی کے قابل ہے۔ انھوں نے بھی تصدیق کی اور فرد کو لئے ہوئے جب دربار پہونچے تو سب سے پہلے یہی فرد حضرت ظل سبحانی کے ہاتھ میں دیدی۔ حضرت بدولت نے مطالعہ فرما کر نہایت پسند کیا اور آفرین و تحسین کی قطب الملک نے گزارش کیا کہ یہی رباعی تو قائل کی تغییر کا باعث ہوئی ہے۔ حضرت نے تعجب و استبعاد کرکے خود فرمایا کہ ہم نے بدستور خدمات سابق پر بحال کیا۔ دوسرے دن جب میر صاحب امیر الامرا کے یہاں حاضر ہوئے تو فرمایا کہ "لیجئے صاحب! آپ تو اپنی خدمات پر بحال ہوگئے۔ یہ بحالی کی پروانگی آگئی ہے"

میر صاحب کے دوست شیخ محمد رضا تتوی نے بھی جو بھکر کے بخشی و وقائع نگار بڑے بزرگ اور موزون طبع تھے اسی واقعہ کے متعلق دو تین رباعیاں فردیہ وقائع میں درج کردی تھیں انھیں شیخ صاحب کو میر عبدالجلیل اپنے نج کے خطوط میں "شیخ محمد رضا جیو" کے نام سے یاد کرتے ہیں ۹

چو فرخ سیر بادشاہ جہاں | بیاراست گیتی چو باغ جناں
بجشن ہمایوں جلوس ملک | نثار شکر کرد از آسماں

میر کی یہ رباعی شیخ مرتضیٰ حسین الہ یار بلگرامی نے بھی حدیقۃ الاقالیم میں نقل کی ہے سیوستان کے جغرافیہ میں لکھتے ہیں کہ اُس دیار میں قند و نبات کے ریزوں کی بارش تو ۹۰۰ سو جریب سے لیکر ایک ہزار جریب تک کے رقبہ میں ہوئی تھی۔ میر نے اس واقعہ کو درج روزنامچہ کیا اور بحکم فرخ سیر بادشاہ معزول ہوئے تو اپنی تصدیق کے لئے خدا یار خاں ناظم صوبہ و دیگر رؤسائے معتبر اور قاضی شہر وغیرہ ارباب شرع کی مُہر و دستخط سے محضر مرتب کرا کے شاہجہاں آباد لے گئے۔ تحریری شہادت کی تائید میں ایک بار شتر کے بقدر اصلی عطیہ قدرت بھی ہمراہ تھا اس کو دارائی کے خریطوں (تھیلیوں) میں بھروا کر حسین علی خاں کی معرفت حضور معلیٰ میں پیش کیا اور کامیاب ہوئے۔ شیخ کہتے ہیں کہ یہ آسمانی قند ایک دام میں بہت سا ملجاتا تھا۔ برسوں ٹھہرتا تھا۔ رنگ کی صفائی اور براقی میں یہ ریزے اولوں (ژالہ) یا نمک سنگ کے مشابہ تھے انکا قوام اتنا سخت تھا کہ آہنی ہاون دستہ سے یہ دشواری ٹوٹتے تھے۔ خواص یہ تھا کہ چند روز تک آنکھ میں لگانے سے ناخنہ، جالا، ماندھ، آنکھ کی پھلی وغیرہ امراض جو مانع بصارت ہوتے ہیں دور ہو جاتے تھے۔ اچھی خاصی آنکھوں میں کوئی لگاتا تو روشنی بڑھتی تھی۔ اس کو آنکھ میں رکھنے سے سُعال (کھانسی) جاتا رہتا تھا۔

سید حسن علی خاں

سید حسن علی خاں برادر کلاں عالمگیر خلد مکاں کے عہد میں خطاب خانی[۹۷] سے سرفراز اور فوجداری نذربار[۹۸] و سلطان پور[۹۹] توابع بگلانہ[۱۰۰] پر ممتاز تھے۔ بعد ازاں حاکم اورنگ آباد مقرر ہوئے۔ جب شاہزادہ محمد معز الدین شاہ عالم کو خلد مکاں نے صوبہ دار ملتان مقرر کر کے بھیجا تو حسن علی خاں کو شاہزادے کے ہمرکاب جانے کا حکم دیا۔ لیکن حسن علی خاں کی شاہزادے سے موافقت مزاج نہیں ہوئی اور وہ آزردہ خاطر ہو کر لاہور واپس آئے۔ عالمگیر نے ایک رقعہ میں اس کا ذکر کیا اور عمدۃ الملک امیر الامرا امیر خاں کو لکھا ہے کہ

"حسن علی خاں با فرزند زادہ معز الدین برہم زدہ نیکی نمود بے اجازت ایشاں برخاستہ آمد و شاہزادہ شکوہ نوشتہ منصب کم باید کرد و جاگیر ضبط نمود۔ تا دیگراں را عبرت شود بیت

کند تحمل بسیار مرد را بے قدر   کماں چو تن بہ کشیدن دہد کبادہ شود

اعوذ باللہ من شرور انفسنا و من سیئات اعمالنا۔"

میر عبد الجلیل کا قیام اس وقت بھکر و سیوستان میں تھا جب حسن علی خاں نے نواحی بھکر سے ہو کر لاہور جانے کا قصد کیا تو میر عبد الجلیل نے ان کے ساتھ نہایت پسندیدہ اور ان کے شایان شان

---

۹۷ خان ترکی یا تاتاری خطاب ہے۔ اصل ملک (ترکستان یا تاتار) میں بادشاہ یا کسی فرقہ کے امیر کے لئے استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستان میں بھی سردار و امیر و رئیس مستعمل ہے۔ ایران میں بھی امراء و سلاطین کے نام کے ساتھ لگایا جاتا تھا

۹۸ سرکار نذربار۔ محال نذربار با حویلی۔ صوبہ مالوہ میں تھا۔

۹۹ سلطان پور۔ یہ صوبہ بمبئی کے ضلع خاندیس مغربی میں ایک اجڑا ہوا یا نیم ویران قصبہ ہے جو کسی وقت نذربار کا دار الملک تھا۔

۱۰۰ بگلانہ، صوبہ مالوہ میں ایک سرکار تھی۔ آئین اکبری میں بذیل صوبہ گجرات لکھا ہے "میان سرکار سورت و نذربار کوہستانے است آباداں بگلانہ گویند (بفتح با و سکون کاف فارسی و لام و الف و فتح نون و ہائے مکتوب) بوم راٹھور" صوبہ گجرات کے یہ کوہ و قلعے بعض کتابوں میں بگلانا بھی لکھے گئے ہیں۔

خدمات و مراعات کیں سادات سے ارتباط کی ابتدا انہیں سے ہوئی۔ شاہ عالم کے عہد میں حسن علی خاں چار ہزاری منصب پر فائز ہوکر صوبہ داری اجمیر[1] اور بعد ازاں صوبہ داری الہ آباد[2] پر متعین ہوئے

[1] اجمیر کے شمال میں ریاست جودھ پور (مارواڑ)، جنوب میں اودے پور (میواڑ) و میرواڑہ مشرق میں ریاست ہائے جے پور و کشن گڑھ اور غرب میں جودھ پور واقع ہیں۔

کہتے ہیں کہ اجمیر کا نام اُس کے بانی راجا اَجا کے نام سے پڑا تھا۔ وہ چوہان راجپوت تھا اُس نے شہر و قلعۂ اجمیر کی بنیاد قریب سنہ ۱۴۵ء کے ڈالی تھی لیکن ڈاکٹر بہلر Bühler وغیرہ کا خیال ہے کہ اس راجہ اجا اور اجے کا زمانہ قریب سنہ ۱۱۰۰ء کے رہا ہوگا۔ تو پھر یہی زمانہ اجمیر کی آبادی پڑنے کا بھی سمجھنا چاہیئے۔ اجے کے لڑکے آنا یا اَرنو نے سنہ ۱۱۵۰ء کے قریب آنا ساگر کا خوبصورت بند بندھوایا تھا جس پر بعد ازاں شاہجہاں نے ایک شاندار سلسلہ سنگ مرمر کے محلات اور کوشکوں کا تعمیر کرا دیا۔ سنہ ۵۸۸ھ (سنہ ۱۱۹۲ء) میں پرتھوی راج دہلی و اجمیر کا فرمانروا تھا۔ اُس کے زمانہ میں شہاب الدین محمد غوری نے دہلی پر حملہ کیا۔ اور ناکام رہا۔ سنہ ۵۸۸ھ (سنہ ۱۱۹۲ء) میں محمد غوری پھر افغانستان اور وسط ایشیا سے تازہ دم فوج لیکر آیا۔ پرتھی راج نے شکست پائی گرفتار ہوا اور قتل ہوا۔ دہلی سے فارغ ہوکر محمد غوری اجمیر آیا اور یہاں باشندگان کا قتل عام ہوا۔ پہلے پرتھی راج کا ایک لڑکا پھر اُس کا چچا ہری راج حاکم با تخت کے طور پر اجمیر میں رہے۔ اس کے بعد قطب الدین غوری نے جو اُس وقت محض نائب السلطنت تھا اجمیر کو سلطنت دہلی سے ملحق کرلیا۔ قطب الدین کی وفات کے بعد سنہ ۶۰۷ھ (سنہ ۱۲۱۰ء) میں میر سولنکی قبائل کے اہل گجرات نے رات کے وقت تاراگڈھ پر حملہ کیا یہی قلعہ شہر اجمیر کا محافظ و پناہ دہندہ ہے۔ ان لوگوں نے قلعہ کی مسلمان محافظ فوج کا ایک ایک شخص قتل کرڈالا۔ سید حسین خنگ سوار شقہ دار (گورنر) کی درگاہ جنہوں نے اس حملہ میں جان بحق تسلیم کی تھی تاراگڈھ میں اب بھی نہایت قابل لحاظ مقام ہے اسکی قبر مع اُسکے رفقا اور اُسکے گھوڑوں کی قبروں کے اُسی ایک احاطہ میں ہے جو گنج شہیداں کہلاتا ہے۔ اُسکے بعد شمس الدین التمش نے پھر یہاں حکومت اسلامی قائم کی جو تیمور اعظم کے حملہ تک رہی۔ رانا کومبھ والی میواڑ نے اُس زمانہ کی بدعملی اور ملکی بے انتظامی سے فائدہ اُٹھاکر اجمیر پر قبضہ کرلیا۔ مگر تھوڑے ہی عرصہ میں مار ڈالا گیا۔ اسکے بعد سنہ ۸۷۵ھ (سنہ ۱۴۷۰ء) سے سنہ ۹۳۸ھ (سنہ ۱۵۳۱ء) تک اجمیر مسلمان فرمانروایان مالوہ کے تحت میں رہا۔ حتیٰ کہ سلطنت مالوہ کا الحاق گجرات سے ہوگیا۔ مال دیو راٹھور نے مارواڑ کی گدی پانے کے بعد ہی اجمیر پر قبضہ کرلیا۔ بالآخر اکبر کے اوائل عہد میں اجمیر پھر سلطنت دہلی میں شامل ہوگیا۔

اکبر کے زمانہ میں اجمیر اُسی نام کے ایک صوبہ میں داخل تھا جس کا اطلاق تقریبًا پورے راجپوتانہ پر ہوتا تھا۔ قلعہ اور اطراف اجمیر کی اہمیت ریاست ہائے راجپوتانہ کے قلب میں واقع ہونے کی حیثیت سے سلاطین اسلام نے فوراً دریافت اور محسوس کرلی تھی۔ یہ بڑے بڑے شوارع کا مرکز اور جائے اتصال تھا۔ شمالی ہند کو

محمد معزالدین اور فرخ سیر کی معرکہ آرائی میں جو کھجوہ (ضلع فتح پور) میں ہوئی۔ فرخ سیر نے فتح پائی۔ اس میں حسن علی خاں اور اُن کے بھائی نے بکمال شجاعت و مردانگی کا اظہار کیا۔ فتح کا سہرہ انھیں کے سر رہا اس حُسن خدمت اور فوز عظیم کے صلہ میں بادشاہ نے حسن علی خاں کو منصب ہفت ہزاری اور

گجرات تک ایک طرف، اور مالوہ تک دوسری طرف سلسلے پھیلے ہوئے تھے۔ اجمیر خود تجارت کا مرکز و مرجع تھا، اس کے مستحکم قلعہ سے اسکی بخوبی اور کامل حفاظت ہوتی تھی۔ اطراف و نواحی کے خشک و بے آب مقامات کے مقابلہ میں وہاں پانی بافراط تھا۔ اسلئے بادشاہان مغلیہ کے وقت میں اجمیر مسکن شاہان بھی رہا تھا۔ اکبر نے منت مانی تھی کہ اگر اس کے بیٹا ہوگا اور زندہ رہے گا تو وہ زیارت کے لئے آگرہ سے اجمیر جائیگا اور حضرت خواجہ معین الدین چشتی سلطان الہند کے مرقد مبارک پر حاضر ہوکر سجدۂ شکر بجالائے گا۔ چنانچہ کمال عقیدت و استقامت کے ساتھ اس نے پا پیادہ چلکر اس منت کو پورا کیا۔ سلیم (جو تاج و تخت پاکر جہانگیر کہلایا) ۹۷۷ھ (۱۵۶۹ء) میں اکبر کے مشکوئے معلّی میں پیدا ہوا اور پھر مراد ۹۷۸ھ (۱۵۷۰ء) میں۔ تو اکبر نے آکر اس متبرک درگاہ کی زیارت کی شہر کے گرد قلعہ بندی کرائی۔ تین برس میں دولت خانہ مکمل ہوا۔ اُمرا و ارکان سلطنت نے عالیشان عمارات بنوائیں۔ اکبر نے آگرہ سے اجمیر تک راہ بتانے کے لیے سڑک پر برابر ستون بنوائے تھے جو ابتک اچھی حالت میں ہیں۔ جہانگیر و شاہجہاں نے بھی اپنے عہد کا معقول حصہ اجمیر میں صرف کیا۔ یہی مقام ہے جہاں جہانگیر کے دربار میں سر ٹامس رو Sir Thomas Roe جیمس اول بادشاہ انگلستان کا سفیر حاضر ہوا تھا اور جہاں محرم ۱۰۲۵ھ (جنوری ۱۶۱۶ء) میں اُسکو پہلا موقع بجاآوری آداب و کورنشات کا ملا۔ اجمیر کے قریب چھ میل جنوب کو ۹ رمضان ۱۰۶۹ھ کو (جون ۱۶۵۹ء میں) اورنگ زیب نے اپنے بھائی داراشکوہ کو شکست دی تھی۔ دارا کی شکست کے زمانہ سے فرخ سیر کے دَور یعنی برادران سادات کے زوال و وفات ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) تک اجمیر کی تاریخ قابل ذکر واقعات و ہنگاموں سے خالی نظر آتی ہے۔ ۱۱۳۴ھ (۱۷۲۱ء) میں اجیت سنگھ ولد راجہ جسونت سنگھ والی مارواڑ نے سلطنت مغلیہ کے انحطاط و زوال سے فائدہ اُٹھاکر بادشاہی صوبہ دار کو مار ڈالا۔ اور اجمیر پر قبضہ کر لیا۔ محمد شاہ کا تسلط عارضی طور پر پھر ہوگیا تھا لیکن دس سال بعد اس نے ابھے سنگھ پسر اجیت سنگھ کو صوبہ دار اجمیر و احمد آباد کا مقرر کر دیا ۱۱۴۴ھ (۱۷۳۱ء) سے ۱۱۶۴ھ (۱۷۵۰ء) تک راٹھور راجگان مارواڑ اجمیر پر برابر حکمراں رہے۔

شہر اجمیر کی آبادی ۱۹۰۱ء میں ۷۳۸۳۹، تھی۔ ۱۹۱۱ء میں ۸۶۲۲۲ ہوئی اور ۱۹۲۱ء میں ۱۱۳۵۱۲ پر پہونچی۔ اسمیں شک نہیں کہ اس اضافہ شمار میں غالب حصہ زائرین درگاہ شریف کا ہے لیکن ویسے بھی

سات ہزار سوار کا مرحمت فرمایا۔ ان کے باپ کا نام سید عبداللہ خاں تھا۔ اس لئے ان کو سید عبداللہ خاں قطب الملک یار وفادار ظفر جنگ خطاب عطا کیا۔ وزارت اعلیٰ کا بلند پایہ تفویض ہوا۔ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ قطب الملک نے عنان وزارت راجہ رتن چند کے ہاتھ میں دیدی تھی اور خود عیش و عشرت

مجموعی حیثیت سے شہر کی آبادی ترقی پر ہے۔ ریلوں کی وجہ سے تجارت کو بھی فروغ ہے۔

یہاں کئی ریلوں کا مرکز ہے۔ شہر کے گرد سنگین دیوار تھی، جو اب شکستہ حال ہے۔ پانچ پھاٹک ہیں۔ آثار قدیمہ حسب ذیل ہیں۔ (۱) اڑھائی دن کا جھونپڑا ۱۱۵۳ء ویسال دیو چوہان راجہ کا تعمیر کردہ تعلیم گاہ تھا۔ محمد غوری کے عہد میں مسجد بنا۔ اس مسجد اور قطب مینار دونوں کی تعمیر کا زمانہ ایک ہی بتایا جاتا ہے۔ (۲) آنا ساگر کے بند پر شاہجہانی محلات و تصور۔ جو محض تفریح گاہیں تھیں۔ ان میں سے چار اب بھی اچھی حالت میں ہیں مع فرش حمام سابق۔ (۳) درگاہ خواجہ صاحب مع مساجد اکبری و شاہجہانی اور دیگر عمارات اور پھاٹک۔ حضرت خواجہ نے ستانوے سال کی عمر میں بروز جمعہ ۶۔ رجب ۶۳۳ھ (۱۶ مارچ ۱۲۳۶ء) کو وفات پائی۔ روضہ کی تعمیر ۶۳۳ھ میں بعد شمس الدین التمش شروع اور زمانہ ہمایوں میں ختم ہوئی۔ ماہ رجب میں ۶ روز تک عرس ہوتا اور زائرین وطالبین کا ازدحام کثیر رہتا ہے۔ (۴) اکبر کا تعمیر کیا ہوا قلعہ۔ یہ ایک مربع اور بھاری عظیم الشان عمارت ہے۔ یہی بادشاہوں کا قیام گاہ اور جائے دربار عام تھا۔ (۵) نور چشمہ، باغ مسکن شاہان مغلیہ (۶) دولت باغ۔ اسکو جہانگیر نے نصب کیا تھا۔ آنا ساگر کے قریب شہر کی طرف ہے اس میں بڑے کہنہ سال درخت موجود ہیں۔

ضلع الہ آباد۔ ہندو اور اسلامی تاریخوں کے لحاظ سے نہایت قدیم اور اہم مقام ہے۔ پانڈو برادران نے اپنی جلاوطنی کا کچھ زمانہ اس کے اطراف میں بسر کیا تھا۔ راجہ رام چندر اور سیتا جی بھی اپنی طویل اور دیرطلب سفر کے دوران میں یہاں سے ہوکر گزرے تھے۔ ایک عرصہ تک یہ بھی کہا جاتا تھا کہ کوشم جو جنوب میں ہے وہی کوسمبی ہے جس کا مہابھارت اور پرانوں میں ذکر ہے لیکن تحقیق و تفتیش کے بعد اب وثوق کے ساتھ صرف اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ یہ مقام چوتھی یا پانچویں صدی مسیحی میں مگدھ کے گپت حکمرانوں کی عملداری میں شامل تھا۔ چینی سیاح ہیون تسانگ کے سفرنامہ سے پتہ چلتا ہے کہ الہ آباد ہرش وردھن بادشاہ قنوج کی مملکت میں ساتویں صدی کے شروع میں شامل ہوا تھا۔ ۵۹۰ھ (۱۱۹۴ء) میں سلطان معز الدین محمد سام مشہور بہ شہاب الدین غوری نے اس پر حملہ کیا اور اس وقت سے مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی مسیحی میں نواح الہ آباد کے قطعات کڑا کے متعلق تھے یعنی وہی قصبہ کورتہ کا دار الصدر تھا۔ ۶۸۵ھ (۱۲۸۶ء) میں معز الدین کیقباد اور اس کے باپ سے کڑے میں ملاقات ہوئی۔ لڑکا ابھی بچہ

میں پڑ گئے تھے۔ اس کے بعد جو موافقت بادشاہ سے رہی اور بعد چندے جس قدر ناموافقت و مخالفت بڑھی اور فرخ سیر اور ان بھائیوں اور ان کے ہوا خواہوں کا جو حشر ہوا جو واقعات و انقلابات نظم سلطنت

کے تخت پر اپنے دادا غیاث الدین بلبن کی جگہ پر بیٹھا تھا اور باپ اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے بنگالہ سے آرہا تھا۔ دونوں کڑے میں یکجا ہوئے اور اس نیت سے کہ خونریزی کی نوبت نہ آئے دریائے گنگ کے شکم میں اپنی اپنی کشتیوں پہ سوار ہو کر دونوں گفتگو کرنے لگے۔ ارادہ تھا کہ دونوں ساتھ ساتھ دارالسلطنت کو جائیں گے۔

اواخر تیرھویں صدی میں الہ آباد علاؤالدین حکمران کڑا کے قبضہ میں تھا۔ ۱۷۔ رمضان ۶۹۵ھ (۱۷۔ جولائی ۱۲۹۶ء) کو اسی دریائے گنگ کے ظرف پار بگ کے میدان میں مانک پور و کڑا کے مابین علاءالدین نے اپنی زشت اعمالی و شقاوت قلبی سے اپنے معمر چچا سلطان جلال الدین فیروز شاہ کو دغا و فریب سے مار ڈالا۔ اس کے بعد بھی مدت ہائے دراز تک یہاں بغاوت کے اعلان، مطلق العنانی کے اشتہار اور تشددات و خونریزی کے واقعات ہوتے رہے۔ سنہ ۹۳۱ھ (۱۵۲۵ء) میں اسکو پٹھانوں کے ہاتھ سے ظہیرالدین بابر نے چھینا۔ سنہ ۹۸۱ھ (۱۵۷۳ء) میں اکبر مہم ٹھٹھہ پر جا رہا تھا، پریاگ سے گزرا تو حکم دیا کہ گنگا و جمنا کے اتصال پر جو ہندوؤں کی تیرتھ کا مقام ہے قلعہ آگرہ کے نقشہ پر ایک عظیم الشان اور مضبوط قلعہ تعمیر کیا جائے۔ چنانچہ سنہ ۲۶ جلوس میں یہ کام ختم ہوا۔ جسمیں چار قلعے اور بارہ باغ اور کئی مکانات دلکشا بیگمات اور شاہزادوں کی محلسرائیں اور دولت خانہ شاہی تعمیر و تکمیل کئے گئے۔ ٹکسال قائم کی گئی۔ شریف سرمدی کا یہ شعر سکہ پر منقوش ہوا ؎

ہمیشہ چوں زر خورشید و ماہ روشن باد　　　　بہ شرق و غرب جہاں سکۂ الہ آباد

شاہزادہ سلیم جو بعد کو جہانگیر کہلایا ہے اپنے باپ کے عہد میں الہ آباد کا صوبہ دار تھا۔ خسرو باغ کے نام سے مشہور پُر فضا اور روح افزا روضہ، جہانگیر کے باغی و طاغی بیٹے خسرو کی شوریدہ سری کی یاد اب تک تازہ کر رہا ہے۔ اٹھارھویں صدی مسیحی کے اوائل میں بوندیلے بسر کردگی چھتر سال سلطنت مغلیہ کے خلاف یورش و سرکشی کر رہے تھے کہ نواب محمد خاں بنگش (والی فرخ آباد) صوبہ دار الہ آباد مقرر کر کے اُنکے استیصال کے لئے بھیجا گیا۔

شہر الہ آباد کی مردم شماری سنہ ۱۹۲۱ء میں ایک لاکھ پینتالیس ہزار چھ سو پانچ نفوس کی تھی۔ شہر جمنا کے بائیں ساحل پر جہاں وہ گنگا سے آکر ملگئی ہے آباد ہے۔ ہندوؤں کے زمانہ میں اس کا نام پریاگ یا پیاگ (قربانی کی جگہ) تھا۔ دونوں دریاؤں کے اتصال کی وجہ سے یہ مقام ہمیشہ متبرک سمجھا گیا ہے۔ عام طور پر یہ بھی مشہور ہے کہ ایک تیسرا دریا سرسوتی جو پنجاب کے جنوب و غرب میں ہو کر ریگزار میں ناپید ہو گیا تھا، یہاں آکر پھر نمودار ہوا ہے اور گنگا جمنا سے مل گیا ہے۔ سب سے پرانی یادگار قلعہ کے اندر ایک ستون ہے جس پر اشوک

میں پیش آتے رہے، بادشاہ گردی کی جو داستانیں یکے بعد دیگرے سنائی گئیں صفحات تاریخ اُن سے سیاہ ہیں تفصیل و نقل کی ضرورت نہیں۔ قطب الملک اور اُن کے رفقا و اعوان نے سلطان ابراہیم بن رفیع الشان بن شاہ عالم کو تخت پر بٹھایا۔ ایک طرف سادات بارہہ اور اُن کے انصار تھے، دوسری طرف محمد شاہی فوج

کا کتبہ تیسری صدی قبل مسیح کا ہے۔ اسی پر دوسری تحریر سامودر گپت کی فتوحات واقع چوتھی صدی مسیحی کی ہے اور تیسری نورالدین جہانگیر کے عہد کی۔

پہلے پراگ نام تھا، اکبر نے عظیم الشان قلعہ بنوایا تو اُسی زمانہ سے شہر کا نام الہ باس۔ الہ آباس اور الہ آباد قرار پایا اور ایک صوبہ کا صدر مقام ہو گیا۔ اکبر کے عہد کے اختتام پر شاہزادہ سلیم (جہانگیر) اس صوبہ کا گورنر تھا اور قلعہ میں رہتا تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں شہر اور صوبہ کو بھی اُنھیں تمام انقلابات و شورو شر سے سامنا کرنا پڑا جو بالائی ہند میں زوال سلطنت مغلیہ کے پیش خیمہ تھے۔ ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) سے ۱۱۴۲ھ (۱۷۲۹ء) تک محمد خاں نواب فرخ آباد یہاں کا گورنر رہا۔ پھر ۱۱۵۲ھ (۱۷۳۹ء) میں مرہٹوں نے شہر پر حملہ کیا۔ ۱۱۶۰ھ (۱۷۴۷ء) میں صفدر جنگ نواب اودھ کے ہاتھ میں عنان حکومت آگئی۔

پُرانے وقت کی عمارتیں قلعہ میں بہت کم باقی ہیں، ان کی بجائے زیادہ تر انگریزی بارکیں و سلاح خانہ وغیرہ قائم ہوئے ہیں۔ خسرو باغ شاہی تفریح گاہ ہے۔ خسرو جو جہانگیر کا سب سے بڑا بیٹا تھا اور جس نے اکبر کے بعد آگرہ کا تخت چھین لینے کی کوشش کی تھی مگر شکست پائی، اس باغ میں خود اُس کا اور اُسکی ماں و بہن کا روضہ ہے۔

عہد حاضرہ میں الہ آباد نہ صرف تین ندیوں کا سنگم بلکہ ہر قسم کے علمی و عقلی، ذہنی و مادی دریاؤں کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی اپنے قابل و فاضل اساتذہ و پروفیسروں کے طفیل میں اور پبلک لائبریری اپنی نادر و بیش بہا کتابوں کے ذخیرہ کے ساتھ اہل شوق اور تشنگان کمال کو صلائے کرم دے رہی اور فیض ابدی پہونچا رہی ہیں۔ ہائی کورٹ اور بورڈ مال کی عدالتیں اہل مظلمت اور اہل دولت کے لئے سب سے بڑی نصفت گاہیں ہیں۔ ریلوں کا مرکز ہے جہاں سے ہر سمت سڑکیں جاتی ہیں۔ تجارت و آمد و رفت کے لئے ہر قسم کی سہولت و آسانی مہیا ہے۔

روحانیات کے تعلق سے پریاگ راج ایک بڑا پرستش گاہ اور مرتاض رشیوں کا مرجع ہے۔

عمارات محدثہ میں یونیورسٹی کا سینٹ ہال۔ لاکالج، یونیورسٹی لائبریری، میور سنٹرل کالج، میوہال، تھارن ہل مین میموریل (جس میں کتب خانہ عامہ ہے)، ہائی کورٹ، پتھر کا گرجا، بہت سے مدارس و کالج اور ہوسٹل و بورڈنگ ہوس (طلباء کے دار الاقامت) قابل دید ہیں۔

کا توپ خانہ۔ ۱۴ محرم ۱۱۳۳ھ مطابق ۲۔ نومبر ۱۷۲۰ء کو لڑائی ہوئی۔ سادات نے شکست پائی قطب الملک مجروح ہوئے۔ حیدر علی میر آتش انکو اپنے ہاتھی پر سوار کرا کے بادشاہ کے سامنے لے گیا۔ بادشاہ نے جان بخشی کر کے حیدر قلی خاں کے حوالہ کر دیا۔ قطب الملک بادشاہی قید میں کئی سال رہے۔ دو بار زہر دیا گیا۔ پہلی مرتبہ اُن کے وفا کیش خدمتگار نے زہر مہرہ گھس کر پلا دیا تھا۔ خوب استفراغ کیا اور قے سے زہر نکل گیا۔ دوسرے دن بادشاہی خواجہ سرا پھر پیالہ لے کر آیا۔ حسن علی خاں نے راضی بہ قضا ہو کر پی لیا۔ او سلخ (۳۰) ذیحجہ ۱۱۳۵ھ

نواب شائستہ خاں بن نواب آصف جاہ کی شاہجہانی مسجد جو ۱۰۵۶ھ (۱۶۴۶ء) میں تعمیر ہوئی تھی گردش روزگار کے نذر ہو چکی۔ حسب روایت مسٹر ہیل اوائل عملداری ایسٹ انڈیا کمپنی یعنی ۱۸۰۰ء میں کرنیل کیٹ نے اسکو تغیر دیکر اپنی بود و باش کا مکان بنا لیا تھا۔ دس سال بعد یعنی ۱۸۱۱ء میں کمپنی کے حکم سے پھر اصلی صورت میں تبدیل کر دی گئی۔ بشپ ہیبر نے بھی اس مسجد (جامع) کو دیکھا تھا وہ اسکی بڑی تعریف کرتا اور اسکی خوبی موقع، بلندی، حسن مناظر، قرب دریا کی تحسین کرتا ہے۔ مدت تک جمعہ و عیدین کی نماز یہاں ہوتی رہی آخر یہ حالت بھی انقلابات حکومت و شدائد غدر سے قائم نہ رہی۔ اب اینٹ اور چونے کا ڈھیر ہے۔ عہد اسلام کی مفصلہ ذیل یادگاریں اب بھی باقی ہیں (۱) خلد آباد کی سرائے ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) (۲) مسجد شیخ محمد افضلؒ (بقعہ افضل) ۱۰۸۰ھ (۱۶۷۰ء) (۳) خانقاہ شیخ محمد افضلؒ (مقام افضل) ۱۰۹۲ھ (۱۶۸۱ء) (۴) مسجد دائرہ شاہ محب اللہ ۱۱۰۳ھ (۱۶۹۴-۵ء) (۵) خانقاہ دائرہ شاہ محب اللہ ۱۱۰۸ھ (۱۶۹۶ء) کی تعمیر ہیں۔ (۶) مقبرہ شاہ عبد الجلیلؒ جو نہایت مرتفع اور شاندار و مستحکم ہے۔ شاہ صاحب کی رحلت کے بعد غلام محی الدین نے ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ (۷) روضہ زینت النساء بیگم واقع بہادر گنج ۱۱۷۰ھ (۱۷۵۶ء) (۸) مسجد حسام الدین علی خاں، نزدیک باغ بادشاہی بزمانہ قیام شاہ عالم بادشاہ ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) (۹) مسجد قدم رسول ۱۱۸۰ھ (۱۷۶۶ء) (۱۰) مسجد رسول پور (سادات۔ حال انگریزی آبادی) قریب قدم رسول۔ تعمیر نو جدار خاں، نیابان منصب دار شاہ عالم ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) (۱۱) مقبرہ منور علیؒ شاہ۔ شاہ صاحب بڑے معمر و سن رسیدہ ہو گزرے ہیں۔ آپ کے متعلق عجیب و غریب روایات مشہور و مذکور ہیں۔ تاریخ پیدائش ۱۱ رمضان ۱۰۹۱ھ (۱۵۔ اگست ۱۶۸۰ء) اور تاریخ وفات ۴ جمادی الآخر ۱۱۹۹ھ (۱۵۔ اپریل ۱۷۸۵ء) بتائی جاتی ہے۔

الہ آباد کے آثار خصوصی میں بارہ سرائیں اور بارہ دائرے شمار کئے جاتے تھے۔ سرائے مسافروں کی قیامگاہ اور وارد و صادر کے لئے جائے راحت تھی۔ دائرہ Monastery یہاں کے باشندے فقرا اور اہل اللہ کے مساکن اور درویشوں کے مقامات کو کہتے ہیں۔ جس کے احاطہ میں متعدد مکانات بالکل مساجد، خانقاہیں بھی ہوتی ہیں

(۱۹ ستمبر ۱۸۲۳ء) کو تین سال قید رہکر اس جہان ناپائدار کے ترددات و صعوبات سے نجات پائی اور وہیں دہلی میں دفن ہوئے ؎

عجب رفیق ہے یہ بیکسی کہ بعد فنا　　سر مزار مجاور ہے نوحہ گر بھی ہے!

یہاں کبھی ذوق و شوق والوں کا مجمع اور طالبان فضل و کمال کا ہجوم رہتا تھا۔ علوم صوری و معنوی سے افادہ و افاضہ کرتے تھے۔ سنہ ۱۲۲۰ھ (۱۸۰۵ء) میں جو دوائر شہرت و نمود رکھتے تھے۔ صاحب آرائش محفل نے انکو مختصراً تحریر کر دیا تھا کچھ ان میں سے بھی اب نابود ہو چکے ہیں۔ جن کے آثار زبان حال سے کہہ رہے ہیں ؎

محو ہونا ہی تجھے ہے اگر اے یاد وفا　　میری تربت پہ نشان سر تربت ہونا

چند باقی ہیں۔ مثلاً ۱۔ دائرہ شاہ اجملؒ (سابق دائرہ شیخ محمد افضلؒ و شاہ خوب اللہؒ) ۲۔ دائرہ شاہ حجت اللہؒ (اصلاً دائرہ شاہ محب اللہؒ) ۳۔ دائرہ شاہ غلام علیؒ (حال محمدی شاہؒ) ۴۔ دائرہ شاہ نور علی وغیرہ۔ مگر ان میں نہ وہ رونق ہے نہ وہ عالم۔ شرف المکان بالمکین بزرگوں کے نام لیوا اور نقش قدم پر چلنے والے اخلاف حتی الوسع ان کو آباد کئے ہوئے ہیں۔ اور اس دور خزاں میں بھی محرمان باد صبا کے مشام جاں میں گل و یاسمن کی روح پرور نکہت پہونچا رہے ہیں۔

اسی سلسلہ میں اس سیاہکار نقاش سطور کو دائرہ شاہ رفیع الزماں قدس سرہ اور مرقد مبارک حضرت شاہ عبد الطیف نور اللہ مضجعہ کا تبرکاً و تیمناً ذکر کرنا چاہئیے تھا [حضرت شاہ عبد اللطیف کا سال وفات ۱۰۳۹ھ مطابق ۱۶۲۹ء اور تاریخ وفات "ہائے شیخ عجم" ہے) مگر گل چین تو از تنگی داماں گلہ دارد۔ حضرت قدسی منزلت ملاذی و ملجائی سیدی و مولائی شاہ محمد عبد اللطیف (ثانی) الحسنی الحسینی القادری النقش بندی طاب ثراہ (متوفی ۱۳۳۶ھ) کی بارگاہ والا میں بھی مجھے اپنی عقیدت و امتنان کا اظہار لازم ہے جنکی آرامگاہ خاکی کے زیر سایہ بیٹھ کر میں نے ان اوراق کو سیاہ کیا ہے۔ اور جن کے حریم پاک کے آستانے پر بہت سے فیوض ربانی اور لطائف و برکات روحانی راقم قلیل البضاعت کے شامل حال رہے ہیں۔ مقبول نامقبول نہ رہے گا مگر صفحات روزگار پر یہ سطریں آپکی بدولت یادگار رہجائینگے۔

ع　ما نمانیم و بہ گیتی سخن از ما ماند

۱۰۵ کھجوا، ضلع فتح پور، صوبجات متحدہ میں ایک قصبہ و تحصیل کا نام ہے۔ آبادی تین ہزار ہوگی۔ اورنگ زیب نے اپنے بھائی شجاع پر ۱۹۔ ربیع الاول سنہ ۱۰۶۹ھ کو (۱۶۵۹ء میں) فتح پائی تو اُس نے موضع کھجوہا کے موقع پر ایک نئے قصبہ کی بنیاد اس کی یادگار میں ڈالی۔ اورنگ آباد نام رکھا مگر پرانا نام بدستور مشہور رہا۔ سرائے اور بارہ دری، باغ اور تالاب جو اُسی زمانہ میں بنائے گئے تھے اچھی عمارتیں ہیں اور سرکار کی طرف سے ان کی قدر ضرورت

سید عبدالجلیل نے ان کی مدح میں مثنوی لکھی تھی جو مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ میں حسب موقع شامل و داخل کر دی۔ چند اشعار یہ ہیں ؎

مگر نواب قطب الملک یک رنگ — وزیر صاحب شمشیر و فرہنگ
ارسطو فطرتے، کاصف نشان است — یمین الدولہ عبداللہ خان است
نظر پروردۂ فضلِ الٰہی — جوان بخت، تفضل دستگاہی
بدیوان چوں نشیند نو بہار است — بمیداں چوں در آید ذوالفقار است
امیر واہب جود و کرم، اوست — وزیر صاحب سیف و قلم اوست
دلیلِ سیف، جدش شاہِ مرداں — بدیہی کے بود محتاج برہان

مرمت و درستی بھی ہوگئی ہے۔ سنہ ۱۱۲۴ھ (سنہ ۱۷۱۲ع) میں فرخ سیر نے اپنے برادر عمزاد عزالدین کو اسی مقام کے قریب شکست دی تھی اور یہاں سے فاتحانہ کوچ کرتا ہوا دہلی گیا تھا۔

۱۷۱۵ راجہ رتن چند، عبداللہ خاں وزیر کا دیوان بلکہ اُس کے سارے خان وان کا منتظم اور مختار مطلق تھا۔ اس کی دست اندازی شاہی احکام و دفاتر تک پہونچ گئی تھی۔ کہتے ہیں کہ رتن چند کسی وقت پرچونی کی دوکان رکھتا تھا۔ اپنے ایمان و عقائد میں کامل و پختہ تھا۔ فرائض کو پوری پابندی و احتیاط سرگرمی سے ادا کرتا تھا۔ مگر چنداں عاقبت اندیش نہ تھا نہ اپنے سود و بہبود پر نگاہ رکھتا۔ اپنے آقا کے نام سے اُسکے اختیارات نافذ کرتا تھا اور کل سلطنت پر حکمرانی کرنے لگا تھا۔ اُس کی مطلق العنانی و دست درازی کی شکایت مسامع بادشاہی تک پہونچی مگر وزیر نے کبھی توجہ نہ کی نہ اُسکو برطرف کیا۔ رفیع الدرجات کے تخت نشین ہونے پر اس کی اور راجہ اجیت سنگھ کی خواہش سے جزیہ اُٹھا دیا گیا۔ آخر زمانہ میں وہ قاضیوں اور مفتیوں کے تقرر اور امور مذہبی میں بھی دخل دینے لگا تو لوگوں کی نفرت اور بیزاری بہت بڑھ گئی۔ نواب نظام الملک کا بالخصوص بدخواہ اور بداندیش تھا۔

حسن علی خاں کے قتل ہوجانے پر رتن چند نے عبداللہ خاں کے پاس خبر بھیجا اور خود پالکی میں سوار ہوکر قیامگاہ کو بھاگا جا رہا تھا کہ مغلوں نے دیکھ لیا۔ اس کی سخت گیری کی وجہ سے عوام الناس عاجز تھے ہجوم کثیر ہوگیا۔ رتن چند کو پالکی سے باہر کھینچ لیا اور خوب زدوکوب کی۔ اور تن برہنہ کرکے محمد امین خاں کے مکان پر لے گئے۔ خان موصوف نے ستر پوشی کرائی، کپڑے پہنائے اور پا بجولاں کرکے قید خانہ بھیجدیا۔

بخاطر خصم را اگر خار خار است ۔۔۔ برو برہانِ قاطع ذو الفقار است
وطن او را چو واسطا از قدیم است ۔۔۔ قلم ہم زو راست۔ حجت مستقیم است

شاہجہاں آباد میں بے آبی کی شکایت سخت تھی۔ قطب الملک نے پرپت گنج کی نہر ۱۱۲۷ھ (۱۷۱۵ء) میں اصل نہر شاہجہانی سے نکلوائی اور وہاں کے لوگوں اور زمین کو سیراب اور جل تھل کر دیا میر عبد الجلیل نے تاریخ لکھی ؎

بحر جود و فیض، قطب الملک، عبداللہ خاں ۔۔۔ نہر خیرے کرد جاری آن وزیرِ محتشم
بہر آں عبد الجلیل واسطی تاریخ گفت ۔۔۔ نہرِ قطب الملک مدِ بحرِ احسان و کرم

میر عبد الجلیل اور اُن کے ارکانِ خاندان کا مسلک باوجود ان تمام تعلقات و مراسم کے نہایت منصفانہ رہا ہے۔ یہ حضرت جہاں سادات بارہہ کے فضائل و محامد و احسانات کو یاد کرتے، اُنکی سخاوت و شجاعت کی داد دیتے ہیں، اُنکے کارہائے نیک و آثر شریفہ کو شمار کراتے، اُنکی خوبی و نیکنامی کا ذکر کرتے ہیں، وہاں ان کا قلم اس حقیقت کے لکھنے سے باز نہیں رہتا کہ "........ در اواخرِ دولت، راہ غلط پیمودند و تا روز قیامت داغ بدنامی بر خود بُردند۔"........ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ "سبحان اللہ ہر چند سادات خود دعوائے سلطنت نہ کردند و اولاد تیموریہ را بر تخت نشاندند۔ اما حرکتے کہ با محمد فرخ سیر کردند مبارک نیامد۔ دمے بآسایش نگزاریدند نفسے بہ طمانیت نہ کشیدند۔ دریاہائے فتنہ از ہر چہار طرف تلاطم در آمد و اسباب زوال دولت آمادہ گشت" (سروآزاد)

یہ بھی میر صاحب کی تعلیم کا نتیجہ ہے کہ میر غلام علی آزاد بھی بادشاہ کو ہر جگہ "فرخ سیر شہید مرحوم" کے نام سے یاد کرتے اور احترام مناسب کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔

فرخ سیر کی نسبت خاتمہ مثنوی میں جبکہ وہ ناشاد و نامراد دنیا سے رخصت ہو چکا تھا میر صاحب لکھتے ہیں

(۱) کہ شاہنشہ سوئے جنت خرامید
(۲) پئے تاریخ ایں مصرع بر آمد ۔۔۔ بہ بحرِ رحمتِ ایزد در آمد
(۳) شہنشہ را بہ غفراں یاد آرند۔

میر سید محمد امیر الامرا حسین علی خاں کی نسبت ایک گفتار (نوٹ) میں لکھتے ہیں "چوں بادشاہ از گفتہ سادات تخلف نمی کرد، بداں رضا داد۔ ہشتم ماہ مذکور (ربیع الثانی سنہ ۱۱۳۱ھ - ۱۰ فروری سنہ ۱۷۱۹ء) ہفت چوکی و منصب داران خاص جلو[۱۱۵] و جلو قدیم را شکوہ برخیزانیدہ در قلعہ بند و بست خود نمود و مردم معتبر از نوکران خود جابجا نشاندہ خود در حویلی دارا با فوج مسلح نشستہ و نواب قطب الملک و اجیت سنگھ[۱۱۶] راٹھور

---

۱۱۵ ایم ریان فرانسیسی لکھتا ہے کہ فرخ سیر کا باڈی گارڈ (عسکر محافظ ذات) کئی سو عورتوں کی جماعت پر مشتمل تھا۔ اس میں حبشنیں بھی تھیں، گرجنیں بھی، قلماقنیاں بھی۔ تیغہ و سپر سے سب مسلح رہتی تھیں، اکثر کے پاس نیزہ و بندوق بھی ہوتی تھی۔ حبشیہ اور نیگرو اس ملک میں عموماً حبشن کہلاتی تھیں۔ قلماق تاتاری عورتیں ہوتی تھیں۔ گرجن عورتیں وہی ہیں جن کے حسن و جمال کا اس قدر شہرہ و غلغلہ ترکستان اور ایران میں پھیلا ہوا ہے۔ ہندوستان میں تو یہ کسی قدر موٹی اور بھدی سمجھی جاتی ہیں۔ حسن و نزاکت کے لئے اتنا جسم و شحم یہاں ناموزوں اور ناشایاں بتایا جاتا ہے۔ نورس و نوخیز نازک و نازنین عورتیں، جن کی تازگی و رعنائیت کا آغاز ہو، اہل ہند کی نظر میں جذب خاص رکھتی ہیں اور ذوق سلیم کی چیزیں ہیں

۱۱۶ راجہ اجیت سنگھ کی معرکہ آرائی کا ذکر سید حسین علی خاں کے ذیل میں آچکا ہے، نیز جودھ پور و مارواڑ کے سلسلۂ تاریخ میں۔ اجیت سنگھ جودھ پور کا راجہ یا اُس زمانہ کے بعض مورخین کے بقول "موروثی زمیندار" تھا راجپوت ٹھاکر راٹھور نسل سے تھا۔ سنہ ۱۰۹۱ھ (سنہ ۱۶۸۰ء) میں مسند نشین ہوا۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد اجیت سنگھ نے خود مختاری و بغاوت و شرارت اختیار کی تھی۔ بہت ہی ناشائستہ حرکات و افعال کا مرتکب ہوا تھا۔ مساجد کو منہدم کر کے اُن پر مندر تعمیر کرائے تھے۔ سنہ ۱۱۲۷ھ (سنہ ۱۷۱۵ء) میں اپنی لڑکی کی شادی فرخ سیر بادشاہ سے کی۔ دار الخلافہ کے واقعات اور ہنگاموں کے سلسلہ میں حتی کہ فرخ سیر کی معزولی و قید و بند میں بھی اجیت سنگھ کا نام بارہا آیا ہے۔ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۲۰ء) میں دہلی سے چلے جانے کے بعد اُس نے سنہ ۱۱۳۳ھ (سنہ ۱۷۲۱ء) میں اجمیر پر قبضہ کر لیا اور سکہ بھی اپنے نام سے جاری کیا لیکن دو سال بعد محمد شاہ کے حوالہ کر دیا۔ اسکی حالت دیکھ کر اہل تدبیر اور واقعہ طلبوں نے اس کے بیٹے ابھے سنگھ کو ترغیب دی کہ ریاست جودھ پور کو تباہی و بربادی سے بچانا ضروری ہے اور اس ضرورت سے باپ کا قتل کرا دینا اور خود ابھے سنگھ کا گدی پر بیٹھنا عین مصلحت۔ نظر بر آں ابھے سنگھ نے سنہ ۱۱۳۷ھ (سنہ ۱۷۲۴ء) میں اپنے بھائی بخت سنگھ کو آمادہ کیا، اُس بدبخت نے اس عمل زشت کا ارتکاب کر کے اپنے باپ کے قتل کا پاپ اپنے سر لے لیا۔ یہ واقعہ محمد شاہ کی شروع عملداری کا ہے

راجہ جودھ پور و میرٹھ را در قلعہ فرستاد تا بادشاہ را در قید آوردہ میل در چشمش کشیدہ کور کردہ محبوس داشتند۔"

اس کا دستور یہ تھا کہ لوہے کی سلائی آگ میں گرم کرکے آنکھ کے اندر پھیر دی جاتی تھی۔

اجیت سنگھ ایک رات خواب شیریں میں تھا کہ قتل کر دیا گیا۔ بارہ تیرہ برس باپ دادا کی گدی پر رہا۔ ابھے سنگھ مسند نشین ہوا۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۱ء) میں اُس نے محمد شاہ بادشاہ کی بڑی خدمت و نمک حلالی کی۔ احمد آباد کو فتح کیا۔ سربلند خاں کی بغاوت و سرکشی کا استیصال کیا۔ چھبیس سال حکمراں رہا

اجیت سنگھ علم و ہنر اور اہل کمال کا بڑا قدرداں تھا۔ اس نے ایک مبسوط کتاب تالیف کرائی تھی جس میں سورج بنسی خاندان کے حالات شروع سے لیکر اپنے عہد تک کے درج کرائے تھے۔ اس کا سال ولادت ۱۶۸۱ء تھا۔ اجیت سنگھ کا بیٹا ابھے سنگھ جو ۱۷۵۰ء تک حکمراں رہا اس بارہ میں اپنے باپ کا ہم قدم صاحبانِ فن و کمال کا سرپرست اور شعرا کا محسن و مربی تھا۔ جسونت سنگھ (پدر اجیت سنگھ) جو ۱۶۲۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۷۸ء میں فوت ہوا۔ ہندی اور بھاشا میں کامل بتایا جاتا ہے۔ اس نے بھاشا بھوشن اور کئی کتابیں فلسفہ ویدانت پر یادگار چھوڑی تھیں۔

۱۶۸۱ ریاست جودھ پور، مارواڑ، راجپوتانہ میں سب سے بڑی، سب سے پرانی اور تاریخی ریاست ہے۔ چاروں طرف سے دیسی ریاستوں سے محصور ہے۔ مارواڑ کو اسکی خشکی اور کم آبی کی وجہ سے ارض الموت egion of death کہتے ہیں۔ مکرانہ کی سنگ مرمر کی مشہور کانیں بھی اسی ریاست میں ہیں؛ جہاں سے مرمر اراولی کے بلوری پتھروں کی طرح برآمد ہوتا ہے۔

مہاراجگان جودھ پور، رام چندر جی فرمانروائے اجودھیا کی نسل سے ہونے کے دعویدار اور راٹھور راجپوتوں کے مسلم سردار ہیں۔ خاندان مغلیہ کے ساتھ عرصہ تک اس خاندان کے تعلقات قرابت و رفاقت نہایت مخلصانہ و عزیزانہ و راستبازانہ رہے ہیں۔ راجہ اُدوے سنگھ نے اپنی بہن جودھ بائی اکبر کو اور اپنی بیٹی مان بائی شاہزادہ سلیم جہانگیر کی زوجیت میں دی تھیں۔

مہاراجہ کا خطاب سب سے پہلے جسونت سنگھ نے پایا۔ وہ مالوہ کا صوبہ دار اور افواج شاہی کا سالار تھا۔ بہت سی مہمات اور لڑائیوں میں بادشاہ کی طرف سے شریک ہوا اور داد شہور و شجاعت دی۔ اسی کا بیٹا اجیت سنگھ تھا جو باپ کے مرنے کے بعد پیدا ہوا تھا اور جس نے اورنگ زیب کی وفات (۲۸۔ ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ مطابق ۱۱۔ فروری ۱۷۰۷ء)

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ "ہشتم ماہ ربیع الآخر (۱۸- فروری ۱۷۱۹ء) سادات بارہہ فرخ سیر بادشاہ را گرفتہ اسیر زنداں کردند. شاہ تا دوماہ محبوس ماندہ جان بجاں بخش سپرد. بالآخر ہشتم جمادی الآخرہ جنازۂ آں بادشاہ مغفور را بیروں آوردہ درمقبرۂ ہمایون مدفون ساختند"۔

کے بعد اپنے آبائی مقبوضات و ملوکات پر قبضہ کرلیا اور راجگان اودے پور و جے پور سے اتحاد و موافقت کرکے مسلمانوں کے دست تصرف یا ماتحتی سے خلاصی حاصل کی۔ معاہدۂ اتحاد میں اہم شرط یہ تھی کہ والیان جودھ پور و جے پور خاندان راجہ اودے پور سے پھر رسم قرابت وازدواج قائم کرلیں گے جو سلاطین مغلیہ سے قرابت کرلینے کی وجہ سے منقطع ہوگئے تھے۔ اسی کے ساتھ یہ اقرار بھی تھا کہ اودے پوری شہزادیوں سے جو اولاد ہو اسکو اور رانیوں کی اولاد کے مقابلہ میں مسند نشینی کا حق فائق حاصل ہوگا۔ اسی عہد و پیمان کی بنا پر ۱۱۲۱ھ (۱۷۰۹ء) میں سانبھر میں راجگان موصوف سے سخت لڑائی ہوئی جس کے ایک دو سال بعد بالآخر بادشاہ سے صلح ہوگئی۔

برادران سید (بارہہ نے) جن کو فرنگی مورخین "نفتلہ جنگ" یا the Warwick s of the East کہتے ہیں جب حکومت و اقتدار پایا تو اجیت سنگھ کو مجبور کیا کہ حسب دستور قدیم اور معمول شاہانہ اپنے وارث و ولی عہد کو مع کسی قدر فوج کے بطور یرغمال (کفیل یا ضمانت) آستان خلافت کو بھیجکر اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا اظہار کرے۔ اس نے انکار کیا۔ تو تنبیہ و سرزنش کے لئے فوج کشی کی گئی۔ تنگ ہوکر اس نے اپنا بڑا لڑکا ابھے سنگھ دہلی بھیجا اور اپنی لڑکی (راج کنواری) فرخ سیر کو بیاہ دی، پھر پائے تخت کو خود بھی گیا۔ کئی سال تک مہاراجہ مذکور نے وہاں حاضری دی اور امرائے دربار اور ارباب حل و عقد کی سازشوں اور مشوروں میں شریک رہا لیکن جب ۱۱۳۱ھ (۱۷۱۹ء) میں فرخ سیر قتل کردیا گیا تو اس نے سادات کی موافقت اور شرکت کار و رفاقت سے انکار کردیا۔ ان کے افعال و اعمال سے بیزاری و تنفر کا اعلان کیا اور ابھے سنگھ کو دہلی میں چھوڑ کر خود ۱۱۳۲ھ (۱۷۲۰ء) میں جودھ پور واپس چلا آیا۔

شہر جودھ پور پرانا اور سرسبز مقام ہے۔ آبادی ۱۹۲۱ء میں ۸۰۴۳، تھی۔ اس کو راؤ جودھا نے آباد اور اپنے نام سے منسوب کیا تھا۔ یہاں کی تجارت خوب اور روز افزوں ترقی پر ہے۔

نمبر ۵ میرٹھ کا قلعہ مشہور ہے جس پر اکبر کے حکم سے ۹۶۹ھ (۱۵۶۲ء) میں مرزا شمس الدین نے فوج کشی کی تھی۔ اس وقت رانائے اودے پور کی حکومت میں تھا۔ جے مل رانا کی طرف سے حاکم تھا اس نے کمال دلیری و مردانگی سے مقابلہ کیا۔ آخر ٹھہر نہ سکا اور قلعہ خالی کردینا پڑا۔ اکبر کے عہد میں یہ سرحدی مقام اور نہایت زبردست

مسٹر طامس بیل Thomas W. Beale مفتاح التواریخ میں لکھتے ہیں کہ "فرخ سیر دو ماہ بعد از معزولی خود بتاریخ دوازدہم ماہ جمادی الثانی سال مذکور حسب ایمائے قطب الملک در زندان بقتل رسید۔ لاش او را در مقبرہ ہمایوں بادشاہ دفن کردند" لیکن اپنی تاریخ انگریزی میں تاریخ قتل ۹ رجب سنہ ۱۱۳۱ھ مطابق ۱۶ مئی سنہ ۱۷۱۹ء تحریر کرتے ہیں۔

حسب روایت سیر المتاخرین فرخ سیر ترپولیہ کے اوپر ایک تنگ و تاریک کمرہ میں محبوس رکھا گیا تھا۔

واضح رہے کہ فرخ سیر کے مظالم کی فرد بھی کچھ کوتاہ نہیں ہے۔ اُس نے ۱۷ ذیقعدہ سنہ ۱۱۲۴ھ (۷ دسمبر سنہ ۱۷۱۲ء) کو جہاندار شاہ پر فتح پائی، تخت فرمانروائی پر اکبرآباد میں جلوس کیا۔ مرزا ایزد بخش رسا کو جو کسی وقت عالمگیر کا میر منشی تھا اور پھر اعظم شاہ کا متوسل اور خیر طلب ہو گیا تھا، طلب کر کے حکم دیا کہ اُسکی مونچھوں کا ایک ایک بال جڑ سے اکھاڑ ڈالا جائے بعد ازاں اُس کو ایک ستون سے باندھ کر آگرہ میں بڑی خواری و بے دردی سے ہلاک کرا دیا۔ شاہجہان آباد ہو چکر جہاندار اور امیر الامراء ذوالفقار خاں اور بہت سے دیگر اعیان دولت کو قتل کرایا۔ ان کے سر تن سے جدا کر کے نیزوں پر آویزاں کیے گئے۔ لاشیں پاؤں کی طرف سے رسیوں سے باندھ کر ہاتھی کی پشت پر ایک اس طرف، اور دوسری دوسری طرف لٹکا دی گئیں۔ خود بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا۔ راجہ سبھہ چند دیوان امیر الامراء کو گرفتار کر کے اُسکی زبان کٹوالی۔ جہاندار کے بہت سے مشیروں کو پکڑوا کر مروا ڈالا۔ اعز الدین پسر جہاندار شاہ و عالی تبار پسر اعظم شاہ اور ہمایوں بخت اپنے چھوٹے بھائی کو معدوم البصر کر کے محبس بھیجدیا۔

اسی بنا پر بعض مورخین نے اسکو حجاج ثانی[1] کے لقب سے یاد کیا ہے۔ یہ تشابہ (ایک بے اختیار بادشاہ کا ایک باقتدار وزیر سے) صحیح ہو یا نہ ہو مگر اس میں شک نہیں کہ اسکی شمشیر خون آشام نے اپنی پیاس

سمجھا جاتا تھا۔ اجمیر و ناگور سے اُس طرف میرٹھ تھا جسے مل کی تعریف و تحسین کے ترانے راجپوت اب تک گاتے ہیں۔ آئین اکبری میں اس کو متعلق سرکار ناگور کے لکھا ہے۔ اور تحریر کیا ہے کہ "قلعہ از سنگ دارد" "ہزار دو صد"[?] دربار اکبری میں راجہ میرٹھ کے ذیل میں لکھا ہے کہ میراٹ باشندگان میرواڑہ کا نام تھا۔

[1] حجاج بن یوسف ثقفی عبد الملک بن مروان اموی کا امیر الامراء تھا۔ مورخین عرب اسکو "وزیر عظیم الوزراء لشقیہم" لکھتے ہیں۔ شاید اپنے جرائم اور جور و ستم کے لحاظ سے تاریخ اسلام میں اپنی نظیر نہیں رکھتا ہے۔ نہایت ظالم و سنگدل نا خدا ترس

بہت سے گنہگار اور بے گناہوں کے لہو سے بلا امتیاز بھائی تھی بلکہ بدنصیب نادانشمند فرخ سیر اپنا دامن زیادہ تر

شخص تھا۔ اسکی گورنری و وزارت کی یادگار بہت سے دردانگیز و روح فرسا واقعات صفحۂ روزگار پر مرتسم ہیں۔ اس نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے مقابلہ کیا تھا۔ یکم ذیحجہ ۷۲ھ (۲۰ اپریل ۶۹۲ء) کو مکہ معظمہ کا محاصرہ شروع ہوا چھ ماہ تک عرصۂ پیکار گرم رہا۔ ام القریٰ کے باشندے اور حرم بیت اللہ میں اماں پانے والے سامان رسد اور خورد و نوش کے بہم نہ پہونچنے سے عاجز آگئے تھے۔ بہت سے صحابۂ پاک قتل ہوئے۔

باایں ہمہ اس کے اعمال حسنہ سے بھی کچھ باتیں قابل تحریر ہیں۔

(۱) قرآن پاک پر اعراب لگائے۔ سچ یہ ہے کہ یہ کام نہایت ضروری اور اچھا تھا۔ اور وہ دنیائے اسلام پر بڑا احسان کر گیا ہے۔ اگر یہ شخص حجاج "سفاک" نہ ہوتا تو خدا معلوم کہ اس کار خیر کے اجر و مزد میں اس کا شمار نیک و برگزیدہ مسلمانوں کے کن کن طبقوں میں کیا جاتا۔

(۲) حضرت عبداللہ بن زبیر کے تعمیر کرائے ہوئے خانہ کعبہ کو ۷۴ھ (۶۹۳ء) میں تغییر دے کر اپنی طرف سے بنوایا۔

(۳) ملوک عرب میں سب سے پہلے اپنے بادشاہ عبدالملک بن مروان کا سکہ سونے چاندی پر ۷۶ھ (۶۹۵ء) میں منقوش کر کے جاری کیا۔ اس سے پیشتر بادشاہان عجم کے سکے چلتے تھے۔ (بروایت دینوری)

(۴) بلاذری لکھتا ہے کہ ۸۰ھ (۶۹۹ء) تک عراق کے خزانہ میں فارسی طریقے، فارسی زبان اور فارسی رقوم و علامات رائج تھیں صالح بن عبدالرحمن کاتب نے جو سیستان کے گرفتار شدہ قیدیوں میں سے کسی کا بیٹا تھا زادان پسر فرخ (فرخ حجاج کا میر منشی تھا) ایک دوسرے فارسی یا مجوسی سے جو سواد (کلدانیہ) کے دفتر مالی میں باش کاتب اور محاسب کے عہدہ پر ممتاز تھا شیخی یا طنز سے کہلا بھیجا کہ اگر اجازت ہو تو حسابات کلیتًا عربی میں کر دیئے جائیں۔ حجاج نے سنا تو اسکے موافق حکم دیدیا۔ زادان کا بیٹا مردان شاہ چلا اٹھا کہ "خدا تیری نسل دنیا سے قطع کر دے جیسے تو نے فارسی زبان کی جڑ کاٹی ہے۔" دربار کے پارسیوں نے رشوت کے طور پر اسکو ایک لاکھ درہم بھی پیش کئے تاکہ وہ اس خدمت سے عجز و ناقابلیت کا اعتراف کر کے دستکش ہو جائے مگر اس نے انکار کر دیا۔ حتی کہ ۸۱ھ (۷۰۰ء) میں عراق کا سارا دفتر عربی زبان میں مستقلًا منتقل ہو گیا۔

پروفیسر براؤن لکھتے ہیں کہ عبدالملک کا قابل مگر بے رحم نائب حجاج بن یوسف تھا۔ (یہ ایسا نام ہے جو یزید ابن زیاد اور شمر کے نام سے کسی طرح کم نفرت و بغض کے ساتھ نہیں سنا جاتا۔ یعقوبی) مکہ کے محاصرہ اور گولہ باری اور ابن زبیر کی بغاوت کے استیصال کے لئے اسکی تیاری و آمادگی ہی نے سب سے پہلے اسکی سفارش اسکے آقا سے کی تھی۔ پھر تو بائیس برس (۷۳ھ سے ۹۵ھ) تک یہ تشنۂ خون اور بے درد شخص دنیائے اسلام میں طوفان بنا رہا۔ اپنی سنگدلی اور شقاوت سے جن لوگوں کو اس نے قتل کرایا تھا ان کی تعداد کا تخمینہ ایک لاکھ بیس ہزار کیا جاتا ہے

ناکردہ گناہ لوگوں کے خون سے داغدار کرکے رخصت ہوا ہے۔ ؎

بجرم عشق مرا گر کشی، چہ خواہی گفت ؟ جواب خون رقیباں کہ بے گناہ ماندا

میدان جنگ میں جان دینے والوں کا شمار اس کے علاوہ ہے (مروج الذہب مسعودی) باشندگان کوفہ کو اُس کا ان کلمات سے خطاب کرنا "خدا کی قسم میں دیکھتا ہوں کہ نظریں مجھ پر جمی ہوئی ہیں۔ گردنیں میری طرف بڑھی ہوئی ہیں۔ اور سر درو ہو جانے کے لئے خود بخود جھکے ہوئے ہیں۔ کاٹے جانے کے لئے تیار ہیں۔ میں ہی وہ شخص ہوں جو اسکو انجام کو پہونچاؤں گا" اس شخص کی خون آشام طبیعت کے خاصہ کو ظاہر کرتا ہے۔ (الفخری) اس کے آقا عبدالملک کے الفاظ بھی اس سے کم درجہ نہیں رکھتے جو اُس نے مسندِ خلافت پر اپنے جلوس کی خبر پاکر کہے تھے۔ جب باریاب نوید لیکر پہونچا وہ قرآن مجید پڑھ رہا تھا۔ سنتے ہی اُس نے کتاب مقدس بند کردی اور اُس کی زبان سے نکلا ھٰذَا فِرَاقُ بَیْنِی وَبَیْنَکَ

حجاج سنہ ۴۱ھ (سنہ ۶۶۱ء) میں پیدا ہوا۔ ترپن چون سال کی عمر پاکر شوال سنہ ۹۵ھ (جولائی سنہ ۷۱۴ء) میں فوت ہوا۔ مدفن کوفہ ہے۔ مگر طبری لکھتا ہے کہ پندرہ روز مرض آکلہ میں مبتلا رہا تھا۔ پیٹ میں کیڑے پڑ گئے تھے سخت تکلیف و ایذا تھی، اسی حالت میں جمعہ ۲۱۔ رمضان المبارک سنہ ۹۵ھ کو چون سال کی عمر میں اُس کا خاتمہ ہوا۔ واسط میں دفن کیا گیا مگر قبر نیست و نابود ہوگئی۔ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِاُولِی الْاَلْبَابِ

عراق و خراسان میں بیس سال حکومت کی۔ مرنے کے بعد قیدیوں کا شمار کیا گیا تو پچاس ہزار نکلے بیس ہزار عورت اور تیس ہزار مرد۔ اس کے زندان خانہ پر چھت نہیں ہوتی تھی۔ برف اور بارش قیدیوں پر گزرتی اور دھوپ کی شدت اور آفتاب کی طپش و تابش سے جلتے بھنتے تھے۔

اگرچہ یہ سب مظالم بھی اختلال عقل کا نتیجہ تھے مگر کچھ دن پہلے سے حواس ظاہری میں اختلال فاحش ہوگیا تھا جو جان کے ساتھ گیا۔ مرض الموت میں ایک منجم سے پوچھا کہ امسال کوئی بادشاہ مریگا یا نہیں۔ اس نے کہا کہ عنقریب وہ فوت ہونیوالا ہے جسکا لقب کلیب ہے، حجاج بولا کہ صغر سن میں تو میری ماں بھی مجھے کلیب کہا کرتی تھی۔ منجم نے جواب دیا وَاللّٰہِ اَنْتَ تَمُوْتُ۔ حجاج نے کہا "اچھا پیشتر میں تمھیں کو روانہ کرتا جاؤں"۔ اور بیچارے بیگناہ کی گردن اڑوا دی۔

رجال کے سلسلہ میں حجاج کا شمار تابعین میں ہے۔

حجاج کے سوانح حیات "الحجاج ابن یوسف سنہ ۴۱۔۹۵ ہجریہ" کے نام سے جے پیریر J. Perier نے قلمبند کئے اور سنہ ۱۹۰۴ء میں پیرس میں طبع کرائے ہیں۔

سیّد حسین علی خاں

امیر الامرا سید حسین علی خاں، اگرچہ قطب الملک سے چھوٹے تھے لیکن شجاعت و بسالت، سخاوت و علو ہمت، وقار و تمکنت میں بڑے بھائی سے بدرجہا فائق تھے۔ خلد مکان کے عہد میں پہلے حکومت رن تھنبور[۱۱] اور آخر کو فوجداری سدول تھانہ پر مقرر تھے۔ محمد اعظم کی لڑائی میں شاہ عالم نے انکی بہادری و مردانگی اور حسنِ تدبیر و کامیابی دیکھ کر سہ ہزاری منصب اور نقارہ عنایت کیا۔ پھر عظیم آباد پٹنہ کی نائب صوبہ داری پر مامور ہوئے۔ معز الدین اور فرخ سیر کی جنگ آزمائی میں حسین علی خاں نے کمال تہور و بہادری دکھائی۔ گھوڑے سے عین وقت پر اُتر کر پیادہ ہو گئے اور خوب لڑے کاری زخم کھائے۔ زمین پر گرے۔ فتح ہونے پر بادشاہ نے حسین علی خاں کو امیر الامرا بہادر فیروز جنگ خطاب، اور ہفت ہزاری و ہفت ہزار سوار کا منصب اور میر بخشی گری کی خدمت مرحمت فرمائی۔ جلوس کے دوسرے سال مہاراجہ اجیت سنگھ مارواڑ نے تمرد اختیار کیا۔ اُس کی تنبیہ و استیصال کے لئے سید حسین علی خاں مع ایک

۱۱؎ رن تھم بھور (جس کا صحیح اور اصلی نام رنستمبھ پور (یعنی "ستدِ جنگ کا مقام" ہے) نظامت سوائی مادھو پور ریاست جے پور، واقع راجپوتانہ میں ایک مشہور قلعہ ہے جو مضبوط حصار اور دمدموں اور برجوں سے محاط و محفوظ ہے۔ اس کے اندر ایک محل، ایک مسجد اور ایک قبر کسی مسلمان ولی کی باقی ہے، باقی سب [illegible] ہیں۔ سب سے پہلے سلطان التمش نے ۶۲۳ھ (۱۲۲۶ء) میں اس کو فتح کیا تھا۔ مگر قبضہ صرف چند روز رہا۔ ۶۸۹ھ یا ۶۹۰ھ (۱۲۹۰ء یا ۱۲۹۱ء) میں جلال الدین خلجی نے اور ۶۹۹ھ (۱۳۰۰ء) میں علاء الدین کی افواج نے محاصرہ کیا مگر ناکامی ہوئی۔ بالآخر ۷۰۰ھ (۱۳۰۱ء) میں خود علاء الدین گیا اور قلعہ فتح کیا۔ راجہ ہمیر دیو چوہان اور اُس کے رفقا تہ تیغ ہوئے۔ یہ قلعہ کچھ زمانہ تک ریاست مالوہ کے، اور کچھ روز میواڑ کے، اور پھر ریاست بوندی کے تصرف میں رہا۔ ۹۷۶ھ (۱۵۶۹ء) میں اکبر نے خود محاصرہ کر کے اس کو ایک ماہ میں فتح کیا۔ اور سرکار رن تھم بھور کے نام سے معہ تراسی محالات کے صوبہ اجمیر میں شامل کیا۔ رن تھم بھور عرصہ تک خانخاناں کی جاگیر میں تھا۔ اسیران شاہی اور پولیٹیکل مجرم اکثر اسی قلعہ میں رکھے

فوج سنگین وجرار کے مامور ہوئے۔ فوج نے میرٹھ تک جہاں جہاں راجہ کا علاقہ تھا غارت و تاراج کر ڈالا۔ مظفر و منصور لشکر کی ہیبت وصولت سے راجہ بیکانیر کی طرف بھاگ گیا۔ مستحکم و استوار مقامات میں چھپتا اور پناہ لیتا رہا۔ اس بارہ میں امیر الامرا کا حکم جس طرح عمل پزیر ہوتا تھا حسب ذیل بتایا جاتا ہے

"چونکہ اجیت سنگھ و جے[1] سنگھ سوائی کے دیہات باہم مخلوط تھے۔ تعلقہ اول کی رعایا ہراس زدہ ہو کر فرار ہو جاتی تھی۔ اس لئے تاراج کرنے والوں کو حکم تھا کہ خالی مواضع کو لوٹ کر آگ لگا دیں آباد مکانات سے مزاحمت نہ کریں۔ یہ حالت دیکھکر اجیت سنگھ کی رعایا جے سنگھ کی رعایا کی وساطت سے اماں مانگ کر آجاتی تھی۔ اُس وقت سزاول متعین کر دئے جاتے تھے جو تاراجیوں کو ہدایت کرتے کہ آگ بجھا دیں اور جو کچھ لوٹا ہو واپس کر دیں۔ اس حکم کی خلاف ورزی نہیں ہونے پاتی تھی۔ بعض ثقہ لوگوں نے گانوں والوں سے جاکر دریافت کیا تو سب نے بالاتفاق کہا تھا کہ جلنے کی سواے ہمارا کوئی نقصان نہیں ہوا۔

امیر الامرا کا ضبط و نسق اس حد تک تھا کہ اُن کی فوجیں دو کھیتوں کے اندر ہو کر تنگ و باریک راستہ سے نکل جاتی تھیں مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ راہ سے ذرا ہٹ جائے کھیتی کو ہاتھ لگانا معلوم"

جاتے تھے۔

زوال سلطنت مغلیہ پر سترھویں صدی مسیحی کے آخر میں یہاں کے قلعہ دار نے خود اسکو راجہ جے پور کے حوالہ کر دیا تھا۔

اکبر نامہ میں وجہ تسمیہ یہہ لکھی ہے کہ رَن پہاڑ کو کہتے ہیں۔ یہ قلعہ رَن پہاڑ کی چوٹی پر بنایا گیا تھا جس پر بڑے بڑے پتھر تھے، اس لئے رَن تھمبور جوشن پوش پہاڑ ہوا۔ جہانگیر نے اپنے تزک میں ایک دوسری وجہ لکھی ہے۔ دو پہاڑ برابر برابر ہیں، ایک کا نام رن، دوسرے کا تھنبور ہے قلعہ تھنبور پر ہے۔ کندھار کا مشہور و مستحکم قلعہ رن تھنبور سے پورب کی جانب چند میل پر تھا۔ ابوالفضل لکھتا ہے "قلعہ سنگین دارد بالاے کوہ"۔

[1] راجہ جے سنگھ ثانی، اجمیر یا جے پور میواڑ کا موروثی رئیس اور کچھواہہ راجپوتوں کا سردار، مرزا راجہ جے سنگھ کا پرپوتا تھا۔ معمولاً مرزا راجہ جے سنگھ سوائی کہلاتا ہے۔ فرخ سیر کے عہد میں "دھیراج راجہ جے سنگھ"

اجیت سنگھ نے جب اپنی خرابی اور ملک کی تباہی دیکھی تو معتبر وکلا کی معرفت پیش کش حاضر کیا۔ اپنے بڑے لڑکے ابھے سنگھ کو بھیجا۔ اپنی لڑکی بادشاہ کی تزویج میں دینا چاہی، جس کو اس ملک میں ڈولہ دینا کہتے ہیں اور اس طرح اپنے عفو جرائم کا خواستگار ہوا۔ امیر الامرا نے بھی مصالحت پسند کی اور ابھے سنگھ کو ہمراہ لے کر حضور میں پہونچا۔ ڈولہ کے لئے فوج مامور کر دی۔ ڈولہ پہونچنے کے بعد بادشاہ کی شادی کے مراسم ادا ہوئے۔ اہل تاریخ لکھتے ہیں کہ بادشاہان ماسبق کے زمانہ میں بھی ایسی عظیم الشان تقریب کبھی جلوہ پزیر نہیں ہوئی تھی۔ اور اس کے حسن انصرام کا سہرا انھیں بھائیوں کے سر باندھتے ہیں۔ میر عبد الجلیل نے ایک مثنوی رنگین اس رسم طوی کے متعلق لکھی اور داد سخنوری دی تھی۔

کچھ دن بعد امیر الامرا صوبہ دار دکن مقرر ہو گئے۔ میر جملہ سمرقندی، شکایت و سعایت کر کے فرخ سیر کا مزاج اُن کی طرف سے برابر برہم کرتا رہا۔ بہت سے ناگوار و خلاف شان واقعات اور نا ملائم مکالمات پیش آئے۔ مخالفت بڑھتی رہی۔ بعض امرا و والیان ملک نے سرتابی اختیار کی، جن کی سرزنش و گوشمالی اور باقتضائے مصالح، کسی کسی سے مصالحت کے لیے، امیر الامرا کو حزم و ہوشمندی سے کام لینا پڑا۔ قطب الملک، دار الملک کی روز افزوں سازشوں اور دربار کی نزاعات سے پریشان و دل شکستہ

خطاب پایا۔ محمد شاہ نے "سوائی" اضافہ کیا۔ بڑا مدبر و منتظم تھا ہندوستان کے ہر حصہ میں اس نے بازار و کاروان سرائے تعمیر کرائے۔ بڑا دانشمند و حکیم تھا۔ اپنی یادگار پانچ رصدگاہیں چھوڑی تھیں۔ (۱) دہلی (۲) بنارس (۳) متھرا (۴) اوجین (۵) جے پور۔ زیج محمد شاہی کا مجوز و بانی بھی ہے۔ ۹۔ شعبان ۱۱۵۶ھ (۱۰۔ ستمبر ۱۷۴۳ء) کو وفات پائی۔ افواج بادشاہی کا سپہ سالار تھا۔ بڑے بڑے کارہائے نمایاں اس نے کئے تھے۔

۱۱۳۱ھ امیر الامرا کے بھائی قطب الملک عبد اللہ خاں، وزیر اعظم نے رفیع الدرجات کو تخت سلطنت پر بٹھایا۔ اس کے حکم سے بادشاہ معزول فرخ سیر کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی۔ باقتضائے صلاح ملکی دو بار زہر دیا گیا سمت جانی کا بُرا ہو، کارگر نہ ہوا۔ آخر تسمہ کشی کی، اور رنگہراے فنا بنایا۔ کہتے ہیں کہ یہ بدعت متحدثہ خود اسی بادشاہ مخول کی نکالی ہوئی تھی۔ جس روز فرخ سیر کا تابوت ہمایوں کے مقبرہ کو لیے جاتے تھے، دہلی میں بلوائے عام ہو گیا تھا شہر کے ہزارہا حاجت مندوں نے، جو بادشاہ مخیر کی فیاضیوں اور خوان کرم و نوال سے روٹی پاتے تھے، کہرام برپا کر رکھا تھا مخالف فریق لکھتا ہے کہ دو تین ہزار مرد و عورت حاضر تھے اور بازاری فقیر جمع ہو کر ساتھ ساتھ روتے ہوئے چلے۔

ہو گئے تھے ان کی متواتر و مسلسل تاکید و اصرار پر امیر الامرا آخر ربیع الاول ۱۱۳۱ھ (۱۹ فروری ۱۷۱۹ء) میں دہلی آئے۔ بادشاہ سے علانیہ مخالفت کی۔ ایک ہفتہ بعد قطب الملک اور راجہ اجیت سنگھ کے مشورہ سے قلعہ کا بندوبست ہوا۔ فرخ سیر قید کر دیا گیا[۱۱۱]۔ اب بھی امیر الامرا کو آرام و اطمینان نصیب نہ ہوا۔ پہلے شاہزادہ نیکو سیر اور اس کی فوج سے مقابلہ رہا۔ صلح ہوئی تو چھبیلہ رام ناگر، ناظم الہ آباد اور اس کے بھتیجے درجا نشین گردھر بہادر نے مخالفت کی۔ بالآخر ان سے بھی مصالحت ہو گئی۔ اب نواب نظام الملک ناظم مالوہ[۱۱۲] کو امیر الامرا سے رنجش پیدا ہوئی۔ جس کا نتیجہ ایک معرکۂ عظیم تھا۔ صاحب سیر المتاخرین اور حاجی مصطفےٰ لکھتے ہیں کہ عبداللہ خاں اور حسین علی خاں دونوں (بھائیوں) کے باہم صفائے قلب نہ تھی اور اندرونی تعلقات صمیم و خالص نہ رہے تھے۔

اعتماد الدولہ محمد امین خاں کی تحریک و تجویز اور نواب نظام الملک کی اجازت و مرضی سے ۱۵ ذیقعدہ ۱۱۳۱ھ (۲۹ ستمبر ۱۷۱۹ء) روز یکشنبہ کو ابو الفتح ناصر الدین محمد شاہ کو جس کا نام پہلے روشن اختر تھا تخت سلطنت پر بٹھا دیا گیا۔

۶۔ ذیحجہ ۱۱۳۲ھ (۲۷ ستمبر ۱۷۲۰ء) کو میر حیدر[۱۱۳] ترک نے اپنی "فرد احوال" پیش کرنے کے حیلہ

سادات کے متوسلین پر پتھر پھینکتے، نفریں کرتے، اور آوازے کستے تھے۔ بادشاہ کی قبر پر تین روز تک مجمع ہو کر مولود خوانی کرتے رہے۔ اُن میں بھی دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک حیدری، دوسرا نعمت اللٰہی۔ تفصیل محل مناسب پر آئیگی۔

۱۱۲ مالوہ سے کشور ہند کا وہ مسطح حصہ مراد ہے جس کا رقبہ ۶۳۰۰۷ میل مربع ہو گا اور جس میں وسط ہند کے مغربی قطعہ کا بڑا حصہ داخل ہے۔ وہ جزیرہ نمائے ہند کا سب سے زیادہ زرریز، سرسبز اور آباد و قابل سکونت جزو سمجھا جاتا ہے۔ اور جو تاریخ ہندوستان کے عہد قدیم و متوسط میں ہمیشہ نمایاں و ممتاز رہا ہے۔ ہندوؤں کے زمانہ میں اس کے حدود حسب ذیل تھے۔ جنوب میں سلسلہ کوہ وندھیاچل، شرق میں سلسلہ کوہ مذکور جو شمال میں بھوپال سے چندیری تک چلا جاتا ہے۔ مغرب میں وہ شاخ جو اُم جھیرہ سے چتوڑ (راجپوتانہ) تک پھیلی ہے شمال میں مکندوارہ سلسلہ جو چتوڑ سے چندیری کے پورب تک جا کر مل گیا ہے۔ مسلمانوں کی عملداری میں صوبہ مالوہ اور بھی وسیع تھا یعنی علاقہ مندرجہ بالا کے علاوہ، ضلع نماڑ جنوباً مابین وندھیا و ست پورہ سلسلہ ہائے کوہ کے، میواڑ (واقع راجپوتانہ) مغرب میں ہاڑوتی (یعنی ریاست ہائے بوندی و کوٹہ واقع راجپوتانہ) شمال میں

سے قریب جاکر امیر الامرا کے پہلو میں خنجر مار دیا۔ قابو طلبان خوشامد پرست نے تن سے سر جدا کرکے بادشاہ کے روبرو حاضر کیا۔ صاحب مفتاح التواریخ تاریخ قتل ۲۷۔ ذیقعدہ ۱۱۳۲ھ لکھتے ہیں جو ۱۰ ستمبر ۱۷۲۰ء کے مطابق ہوتی ہے۔

اور موجودہ ممالک متوسط کا بڑا حصہ جنوب و مشرق میں معہ گڑھا منڈلا کے شامل تھا۔

مالوہ کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ بودھوں اور ہندوؤں کے زمانہ کے حالات بھی بہ تفصیل کافی فراہم و قلمبند بتائے جاتے ہیں۔ لیکن اس زنجیر کی کوئی کڑی اپنے اندر دلچسپی و اہمیت کا کوئی نمایاں پہلو نہیں رکھتی اس لئے اس کے تذکرہ سے گریز کیا جاتا ہے۔

مسلمانوں میں سب سے پہلے سلطان التمش یہاں آیا اور ۶۳۱ھ (۱۲۳۴ء) میں اوجین پر قابض ہوا۔ بھیلسہ پر تاخت کی۔ ان دونوں شہروں پر تسلط ہو جانے سے تقریباً سارا مالوہ مسلمانوں کے تصرف میں آگیا جس کا زمانہ سلطان غیاث الدین بلبن کے وقت سے سلطان محمد بن فیروز شاہ کے عہد تک شمار ہوتا ہے۔ بالآخر ۸۰۰ھ (۱۴۰۳ء) میں دلاور خاں غوری استقلال و بادشاہی کا دعویدار ہوا۔

۸۰۴ھ (۱۴۰۱ء) سے ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) تک وہ ایک خود مختار سلطنت رہا جو صوبہ مالوہ یا مانڈو کے نام سے موسوم تھا۔ مانڈو وہ مشہور قلعہ ہے جو ان حکمرانوں کا دار الملک تھا۔ ۹۳۸ھ (۱۵۳۱ء) میں اس کا الحاق گجرات سے ہوا۔ اس کے امرا اس سے پہلے برابر شاہان گجرات و شاہان دکن (خاندان بہمنی) و دیگر روسائے قرب و جوار سے معرکہ آرا ہوتے رہے۔ ابتداً فیروز شاہ نے دلاور خاں غوری کو (جس کا زمانہ ۸۰۰ھ سے ۸۰۸ھ تک یعنی ۱۴۰۱ء سے ۱۴۰۵ء تک تھا) مالوہ بطور جاگیر دیا تھا۔ لیکن تیمور کے حملہ سے جو انقلابات رونما ہوئے اُن سے منتفع و متمتع ہو کر وہ خود مختار بن گیا اور دھار کو اپنا دار السلطنت مقرر کیا۔ اس کا بیٹا الپ خاں عرف والی خاں جو ہوشنگ شاہ کے نام سے بھی مشہور ہے جانشین ہوا۔ اس کا زمانہ مابین ۸۰۸ھ و ۸۳۸ھ (۱۴۰۵ء و ۱۴۳۴ء) کے تھا۔ اُس نے ہوشنگ آباد کی بنیاد ڈالی، اس کا عظیم الشان مقبرہ سنگ مرمر کا بنا ہوا قلعہ مانڈو میں موجود ہے۔ وُہی یہاں دار السلطنت کو اُٹھا لایا تھا۔ اُس نے ایک پسر نابالغ محمد غزنی خاں چھوڑا تھا جسکو اُس کے ولی و سرپرست محمود خلجی نے بعجلت ہلاک کرا دیا۔ اور خود تخت نشین ہو گیا۔ اس محمود خلجی کے عہد (۸۴۰ھ سے ۸۷۳ھ مطابق ۱۴۳۶ء سے ۱۴۶۹ء تک) میں مالوہ کو بہت عروج و ترقی نصیب ہوئی۔ اُس کی مستعدی حدِ کمال تک پہونچ گئی تھی۔ اُس کی نسبت یہ مقولہ زبانزد ہو گیا تھا کہ "اُس کا خیمہ اُس کا گھر ہے اور میدان جنگ اُسکی آرام گاہ"۔ بایں ہمہ اُس کے انتظام اور ملک داری کی خوبی یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں عناد و عداوت قطعاً مفقود تھی۔ محمود نے اپنا قلمرو ہر طرف بڑھایا۔ منجملہ دیگر مقامات کے اجمیر و رنتھمبور واقع راجپوتانہ اور ایلچپور واقع دکن کو بھی شامل کر لیا۔ ۸۴۶ھ (۱۴۴۲ء) میں چند امرا کے

ہنگامہ فرو ہوا تو بادشاہ کے حکم سے لاش کی تکفین کی گئی اور نماز جنازہ پڑھکر اجمیر بھیجدی گئی وہاں ان کے باپ سید عبداللہ خاں کے جوار میں دفن ہوئی۔ [امتیاز کے لئے یہ سید عبداللہ خاں اجمیری عرف میاں خاں کہلاتے ہیں۔]

بلانے سے وہ دہلی کی طرف بڑھا۔ لیکن بہلول لودی نے مقابلہ کرکے اُسکو پسپا کردیا۔ اُسی زمانہ ۸۴۲ھ میں اُس نے رانا کمبھ والی چتور پر حملہ کیا۔ حیرت ہے کہ اِس کے نتیجہ اور اپنی اپنی فتح کے بابت دونوں فریق یکساں مدعی ہیں۔ رانا نے مشہور "فتح مینار" قلعہ میں تعمیر کرایا جو اس جنگ میں اُسکی کامیابی و باعزت نکلنے کی یادگار ہے۔ محمود کا بیٹا غیاث الدین ۸۷۳ھ (۱۴۶۹ء) میں تخت نشین ہوا، اس نے باپ کی حیات میں نہایت صبر و ضبط سے کام لیا اور بہت محنت و تکان اُٹھایا تھا۔ لہذا عنان حکومت اپنے بیٹے ناصر الدین کے سپرد کی اور خود عزلت نشین و گوشہ گزین ہوگیا ناصر الدین کا زمانہ ۹۰۶ھ سے ۹۱۶ھ تک (۱۵۰۰ء تا ۱۵۱۰ء) تمام تر بیرحمی و بیدردی و سنگدلی کے واقعات سے داغدار ہے۔ اُسکی بدنامی و جفاکاری کی داستان طویل ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اُس نے خود اپنے باپ اور ولی نعمت کو بھی زہر دلا دیا تھا۔ یہ ایک ایسا قبیح فعل تھا کہ جب ۱۰۲۵ھ (۱۶۱۶ء) میں سفر کرتا ہوا جہانگیر مانڈو پہونچا تو اُس کو بحد غیظ و اشتعال پیدا ہوا اور اُس نے بادشاہ کے فرسودہ استخوان نکلوا کر دریائے نربدا میں پھنکوا دیئے۔ ناصر الدین کالیا دیہہ محل کے ایک تالاب میں اوجین کے متصل غرق ہوگیا تھا۔ شراب کے نشہ سے بدمست تھا گرا، اور پھر کس کی مجال یا کس کو پروا تھی کہ اُس کو نکالے۔ ۹۱۶ھ (۱۵۱۰ء) میں محمود ثانی تخت نشین ہوا۔ اُس کی نسبت مورخین کا اجماع و اتفاق ہے کہ اُس کا یہ خیال بلکہ عقیدہ تھا کہ سلطنت و حکمرانی محض تلوار سے ہوتی ہے۔ اسی لئے اُس نے اس خیال یا ارادہ کو جامۂ عمل پہنایا اور اپنے طریق عمل کے دردناک نتائج دیکھے۔ اُس نے خود اپنے مقربین سے بدگمانی پیدا کرلی۔ میدنی رائے ایک راجپوت کو بلا کر وزیر سلطنت بنایا۔ اس شخص کے روز افزوں اثر اور قوتِ بازو سے خائف ہو کر اُس نے ۹۲۳ھ (۱۵۱۷ء) میں سلطان مظفر شاہ والی گجرات کو اپنی دستگیری اور اس غاصب کے اخراج کے لئے بلایا۔ کچھ زمانہ بعد وہ میدنی رائے اور رانا سانگا والی چتوڑ سے نبرد آزما ہوا، گرفتار ہوگیا تھا مگر عزت و احترام کے ساتھ رہائی پائی۔ باایں ہمہ وہ باز نہ آیا اور چند سال بعد اُس نے رانا کے جانشین پر حملہ کیا۔ رانا کے رفیق و سرپرست بہادر شاہ والی گجرات نے پھر اُسکو گرفتار کیا۔ فرار ہو جانے کی تدبیر و کوشش میں مصروف تھا کہ مار ڈالا گیا۔ اُس کے ساتھ بادشاہان مالوہ کے خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔ اور ۹۳۷ھ (۱۵۳۱ء) میں یہ سلطنت گجرات سے ملادی گئی۔

۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں ہمایوں نے بہادر شاہ پر حملہ کیا اور مالوہ سے باہر نکالدیا۔ مندسور اور مانڈو میں متواتر شکستیں دیں۔ خاندان سوری کے عمل و حکمرانی میں (۹۴۷ھ سے ۹۶۲ھ تک یا ۱۵۴۰ء سے ۱۵۵۵ء)

دنیا کی حالت دیکھئے! ایک وقت وہ تھا کہ ان دونوں بھائیوں خصوصاً امیر الامرا کی شجاعت وسخاوت، کرم وحلم اور مواسات فطری کا ایک عالم معترف ومدح خواں تھا۔ ان کے احسانات کافہ انام پر مبذول ومشمول تھے۔ یہ کسی متنفس پر کبھی ستم وبیداد جائز نہیں رکھتے تھے۔ یا یہ کیفیت ہوگئی اور مقلب القلوب نے دلوں کو ایسا پھیر دیا کہ خود ان کے دست گرفتہ اشخاص سادات سے برگشتہ ومنحرف ہوگئے۔ جانتے تھے کہ ان کی قوت ودولت کا زوال خود اپنی خرابی وتباہی کا باعث ہوگا، مگر کہتے یہی تھے کہ "بار خدایا! یہ کشتی غرق ہوجائے اور ہم سب ڈوب جائیں۔" جب اپنوں کی یہ کیفیت تھی تو بیگانوں کی کون اور کیا شکایت کرسکتا ہے؟ ؎

مالوہ کا حاکم شیر شاہ کا بازوے راست شجاعت خاں تھا۔ جو اِن اطراف میں شجادل خاں کے نام سے شہرت خاص رکھتا ہے۔ اور جو شجالپور کا بانی تھا جس کا تذکرہ آئین اکبری میں بھی کیا گیا ہے۔ [شجالپور یا شجاعت پور، واقع وسط ہند کا پرانا نام رائے کرن پور تھا] اُس کی وفات پر اُس کا لڑکا باز بہادر جانشین ہوا، اس کی شہرت بالخصوص فن موسیقی اور دیگر علوم میں دخل ودستگاہ رکھنے کی وجہ سے ہے۔ اس سے زیادہ شہرت ودلچسپی اُس افسانہ آمیز وافسوں خیز تعشق سے باقی ہے، جو اِسکو روپمتی باشندہ سارنگ پور کیسی باکمال وصاحب جمال سے پیدا ہوگیا تھا۔ تفصیل وتشریح کی گنجایش نہیں ؎

پروانہ جل کے خاک ہوا شمع رو چکی　　تاثیر حسن وعشق جو ہونا تھا ہو چکی

سنہ ۹۷۱ھ (سنہ ۱۵۶۲ء) یا ایک دوسری روایت کے مطابق سنہ ۹۶۸ھ میں باز بہادر کو مجبور ہو کر اکبر کی اطاعت کرلینا پڑی۔ اور مالوہ سلطنت مغلیہ کا ایک صوبہ ہوگیا۔ اور اٹھارھویں صدی تک رہا۔ آئین اکبری میں شیخ ابوالفضل نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ مالوہ کا ذکر کیا ہے جیسا کہ اوپر لکھ چکا ہوں مختلف زمانوں میں اس صوبہ کے حدود اور اس کی وسعت مختلف رہی ہے۔ سنہ ۱۰۰۳ھ (سنہ ۱۵۹۴ء) میں اس میں بارہ سرکاریں یا اضلاع تھے۔ لیکن سنہ ۱۰۷۶ھ (سنہ ۱۶۶۵ء) میں صرف نو رہ گئی تھیں۔ مالوہ کو زیادہ اہمیت اپنے موقع ومحل کے لحاظ سے بھی حاصل تھی۔ وہ مغلوں کے شارع اعظم پر واقع تھا جس پر ہو کر شاہی فوجیں دہلی سے دکن کو جاتی تھیں، وہ ایک متعارف شاہراہ تھی، جو دھولپور، گوالیار، نرور، سرونج اور ہنڈیا میں ہو کر گزرتی تھی۔ اس زمانہ کے متعدد صوبہ داروں میں سے شاہزادہ مراد سنہ ۱۰۰۰ھ (سنہ ۱۵۹۱ء)، ونظام الملک اول سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۱۹ء)، اور مہاراجہ سوائی جے سنگھ والی جے پور سنہ ۱۱۴۷ھ (سنہ ۱۷۳۴ء) خاصکر قابل ذکر ہیں۔

اس کے بعد مختصراً مرہٹوں کا قدم مستقل طور پر مالوہ کی سرزمین پر قریب سنہ ۱۷۴۳ء کے جم گیا۔ جب کہ پیشوا اس

بخونِ دیدہ نوشتیم بر درودیوار — کہ چشمِ مردمی از اہلِ روزگار مدار

سادات کی دولت کے زوال کے بعد لوگوں میں دو فرقے ہو گئے تھے۔ ایک اُنکو نیکی و بھلائی کے ساتھ یاد کرتا تھا "نعمت اللّٰہی"۔ دوسرا بدی و برائی سے "حیدری"۔ یہ مناقشے اسی حد تک محدود نہیں رہے بلکہ مجالس اور باہمی صحبتوں میں دونوں فریق کے مابین بڑی بڑی بے لطفیاں ہو جاتی تھیں۔ میر عبدالجلیل اور ان کے متبعین اپنی وضع نمک حلالی و وفاداری پر قائم رہے۔ سادات کی مدح سرائی و منت شناسی میں ان کی نوا سنجی برابر جاری رہی۔ میر صاحب کی ستائش گرانہ عربی رباعیاں موقع مناسب پر نقل کی جائینگی۔

فرخ سیر کی معزولی کی تاریخ مرزا بیدل نے کہی تھی ؎

دیدی کہ چہ با شاہِ گرامی کردند — صد جور و جفا زراہِ خامی کردند
تاریخ چو از خرد جستم۔ فرمود — سادات بوے نمک حرامی کردند
۱۱۳۱ھ

میر عظمت اللہ بے خبر بلگرامی نے اس کے جواب میں لکھا تھا ؎

باشاہِ سقیم، آنچہ شاید، کردند — از دستِ حکیم، ہرچہ آید، کردند
بقراطِ خرد و نسخہ تاریخ نوشت — سادات دوائش آنچہ باید، کردند
۱۱۳۱ھ

صوبہ کا نائب گورنر مقرر ہو کر آیا۔ پھر رفتہ رفتہ سارا ملک مرہٹہ سرداروں کی سپاہ کا جولان گاہ بن گیا اور اُن کا اقتدار قائم و راسخ ہو گیا۔ حتی کہ آج اُنھیں کے اخلاف "سندھیا والی گوالیار، ہولکر والی اندور، دیواران دھار و دیواس" قابض و دخیل ہیں۔

١١٤ میر حیدر خاں کاشغری، ترکان دوغلات توران سے تھا۔ اس کا پردادا میر حیدر مغلائی، صاحب تاریخ رشیدی، بابر و ہمایوں کے ہمیشہ ہمرکاب رہتا تھا۔ حیدری گروہ اسی قاتل سے منسوب ہے۔ میر شمشیر ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کو "میر" کہتے تھے۔ سنی مذہب تھا بعض سادات بارہہ شیعہ غالی تھے۔ سیاسی اور ذاتی اختلافات کے علاوہ تعصب و اختلافِ عقائد بھی باعث منافرت تھا۔

محمد یوسف[۱۱۵] برہان پوری[۱۱۶] نکہت تخلص، نے جو بعد کو "سخنور خاں" کے خطاب سے ممتاز ہوا طبقہ

[۱۱۵] خوش سلیقہ اور زمانہ شناس شاعر تھا۔ اس کے آباو اجداد اکبر بادشاہ کے تصرف سے پہلے کشمیر کے سلاطین تھے۔ خلد مکاں کے عہد میں نکہت' امیر الامرا ذوالفقار خاں کا مصاحب تھا۔ اور محمد شاہ کے زمانہ میں وزیر الممالک قمر الدین خاں کا متوسل اور حاشیہ نشین۔ بعد کو بادشاہ نے "سخنور خاں" خطاب دیدیا تھا۔ بہت سے قصائد امرائے وقت کے مدح میں اس نے لکھے ہیں سنہ ۱۱۵۰ھ (سنہ ۱۷۳۷ع) میں انتقال کیا۔ اس قطعہ کا صلہ بارگاہ خسروی سے ہزار روپیہ نقد اور خلعت پایا تھا۔

[۱۱۶] برہان پور۔ اب ایک قصبہ چھتیس ہزار کی آبادی کا اور ایک تحصیل کا مقام ضلع نماڑ، صوبہ متوسط میں رہ گیا ہے۔ اسی میں آسیر گڈھ کا پرانا قلعہ بھی تھا۔ گریٹ انڈین پننشولا ریلوے کا اسٹیشن لعل گڈھ یہاں سے دو میل پر ہے۔ شہر کے گرد پختہ دیوار ہے جس میں بڑی بڑی سڑکوں کی نکاس پر عظیم الشان پھاٹک بنے ہوئے ہیں۔ اور جس کی جانب جنوب دریائے تاپتی رواں ہے۔ بہت سے آثار قدیمہ و صنادید اسلامی اس حصار سے باہر بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مضافات شہر دور دور تک چلے گئے ہوں گے۔ شہر کے باشندگان میں مسلمانوں کی تعداد ایک ثلث کے قریب ہے۔ ان میں بوہرہ یا گجراتی تاجروں کا شمار غالب ہے۔

برہان پور کی بنیاد سنہ ۸۰۳ھ (سنہ ۱۴۰۰ع) میں نصیر خاں نے ڈالی تھی جو خاندیش کے فاروقی خاندان کا سب سے پہلا آزاد فرمانروا تھا۔ اسی نے شہر کا یہ نام شیخ برہان الدین غریب' دولت آبادی' سے منسوب کرکے رکھا تھا۔ دریائے تاپتی کی دوسری جانب زین آباد بھی اسی زمانہ میں آباد کیا تھا۔ یہ ایک دوسرے بزرگ شیخ زین الدین سے موسوم ہے۔ اس کے بعد سے برہان پور برابر سلاطین فاروقی کا مسکن بنا رہا اور ان کے زمانہ حکومت میں جو دو صدیوں سے زیادہ رہا ہوگا دو بڑی بڑی مساجد یعنی جامع مسجد اور بی بی مسجد یہاں تعمیر ہوئیں۔ سنہ ۱۰۰۹ھ (سنہ ۱۶۰۰ع) میں برہان پور کو مع مملکت فاروقیہ کے شہنشاہ اکبر نے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ اکبر اور اس کے جانشین کے عہد میں برہان پور کی رونق و تزئین خوب ہوئی۔ ابوالفضل لکھتا ہے کہ اکبر نے خاندیس کا نام شہزادہ دانیال کے نام سے واندیس رکھا تھا۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "یہ شہر بڑا ہے۔ اس میں بہت سے باغات ہیں۔ بعض میں چوب صندل بھی برآمد ہوتی ہے ہر قوم کے لوگ یہاں آباد ہیں اہل صنعت و حرفت بکثرت ہیں۔ موسم گرما میں یہ شہر گرد و غبار سے بھرا رہتا ہے۔ اور برسات میں گلی کوچے کیچڑ اور پتھروں سے پر ہوجاتے ہیں۔" سنہ ۱۰۴۵ھ (سنہ ۱۶۳۵ع) تک برہان پور اس سلطنت کے شاہزادگان متعین دکن کا دارالصدر رہا پھر اس کی جگہ اورنگ آباد نے لے لی۔ اس انتقال کے بعد برہان پور خاندیش جیسے بڑے صوبہ کا صدر مقام ہوگیا جس کی حکمرانی کے لئے ہمیشہ کوئی نہ کوئی شاہزادہ خاص خاندان شاہی سے مامور ہوتا تھا۔

سادات کے برہم ہوجانے اور محمد شاہ کے استقلال سلطنت پر قطعہ تاریخ لکھکر بادشاہ کی نظر سے

سنہ ۱۰۲۳ھ (سنہ ۱۶۱۴ء) میں جب سر ٹامس رو Sir Thomas Roe جیمس اول James I. کی طرف سے مغل اعظم کے دربار میں برسم سفارت آیا تھا اُس وقت تک یہ ردّو بدل نہیں ہوا تھا۔ چنانچہ جہانگیر کے فرزند شاہزادہ پرویز کے حضور میں اسی جگہ وہ آداب بجالایا تھا۔ سر ٹامس رو کے چالیس سال بعد نامور سیاح ٹیورنیر Tavernier کا گزر ہوا وہ اپنی زبان میں برہان پور کو برام پور Brampour لکھتا ہے۔ وہ یہاں سے ہوکر دوبار گزرا تھا۔

ٹیورنیر تحریر کرتا ہے کہ "یہ ایک بڑا شہر بہت زیادہ ویران وتباہ ہے بہت بڑی تعداد مکانات کی محض خس پوش ہے۔" پھر لکھتا ہے کہ "شہر کے وسط میں ایک عظیم الشان قلعہ بھی ہے جس میں گورنر رہتا ہے۔ اس صوبہ کی حکومت بڑی وقعت وعزت کی بات سمجھی جاتی ہے۔ جو صرف بادشاہ کے بیٹے یا چچا کو تفویض ہوتی ہے۔ اس شہر میں تجارت بھی بہت ہے۔ خود برام پور میں جیسا کہ اور صوبجات میں بھی پایا جاتا ہے ایک عجیب وبے اندازہ مقدار چھینٹوں (کالی کٹ کے کپڑوں پر چھپی ہوئی) کی تیار کی جاتی ہے جو نہایت صاف اور سفید ہوتی ہے۔ یہ ایران، ترکی، مسکووی، پولینڈ، عرب اور قاہرۃ الکبریٰ ودیگر مقامات کو بھیجی جاتی ہے۔"

مساجد ودیگر عمارات کے نشانات بتاتے ہیں کہ جب شاہان مغلیہ کے عہد میں برہان پور اپنے منتہائے عروج ورونق پر رہا ہوگا تو اُس کا رقبہ پانچ میل مربع کے قریب ہوگا۔ سلطنت کے متعلق جو لڑائیاں ہوتی رہی ہیں اُن میں بھی برہان پور کا حصہ غالب رہا ہے، خاصکر عالمگیر کے زمانہ میں۔ سنہ ۱۰۷۶ھ (سنہ ۱۶۶۵ء) میں بادشاہ مذکور ایک عظیم الشان سپاہ یہاں چھوڑ کر جیسے ہی کہ دکن کے فتح کرنے کے لئے اُٹھا تھا کہ مرہٹوں نے برہان پور کو غارت وتاراج کر ڈالا۔ اس کے بعد متوالی ومتواتر معرکہ آرائیاں اس کے اطراف ونواحی میں ہوتی رہیں یہانتک کہ سنہ ۱۱۳۲ھ (سنہ ۱۷۱۹ء) میں مرہٹوں کا مطالبہ چوتھ (مال کا حق چہارم) باضابطہ منظور کرنا پڑا۔ سنہ ۱۱۳۳ھ (سنہ ۱۷۲۰ء) سے سنہ ۱۱۶۱ھ (سنہ ۱۷۴۸ء) کے مابین برہان پور نواب نظام الملک آصف جاہ کا دار الریاست رہا۔ وہ اُس وقت صوبہ دار دکن تھے۔ موجودہ حصار شہر پناہ سنہ ۱۱۴۲ھ (سنہ ۱۷۲۹ء) میں نواب نے تعمیر کرایا تھا۔ اس کے بعد سنہ ۱۱۷۴ھ (سنہ ۱۷۶۰ء) میں برہان پور پیشوا کے قبضہ میں آگیا۔ پھر سنہ ۱۸۰۳ء میں سرکار انگریزی کے قلمرو میں داخل کر لیا گیا۔

تانہ گوجری کی مسجد کے مینار نہایت شاندار کوسوں سے نظر آتے ہیں۔ بی بی کی مسجد اب بہت خراب وشکستہ طلب ہوگئی ہے۔ جامع مسجد کے عربی وہندی زبان کے کتابے بتاتے ہیں کہ اس کو سلطان عادل شاہ بن مبارک

گزارا تھا۔ "آفتاب ملک اقبال از کسوف آمد بدر" مادہ تاریخ تھا۔

شاہ فاروقی نے ۸۹۷ھ (۱۴۹۲ء) میں تعمیر کرایا تھا۔ امپیریل گزیٹیر لکھتا ہے کہ اس کو علی خاں (علی شاہ) نے ۹۹۶ھ (۱۵۸۸ء) میں بنوایا تھا، دوسرا کتابہ شاہد ہے کہ اس کو بارہ سال بعد یعنی رمضان ۱۰۰۹ھ میں اکبر نے آکر دیکھا تھا۔ یہ نہایت عمدہ و شاندار عمارت سنگ سیاہ کی ہے جس پر نقاشی و سنگتراشی کمال ذوق سلیم اور خوش سلیقگی سے کی گئی ہے۔ آبادی سے ملی ہوئی ساحل دریا کے ساتھ ساتھ قلعہ کی ویران عمارت اور شکستہ فصیل کی [illegible] بلندی تک چلی گئی ہے۔ سر بفلک ایوانات، کمرے اور دیوان خانے شہادت دیتے ہیں کہ اس کی شاہی محلسرائیں اور قصور کیسے رفیع و عظیم رہے ہوں گے۔ دو تین پختہ حوض بھی باقی ہیں۔ قلعہ کی مسجد کے صرف مینار رہ گئے ہیں۔ مضافات شہر کے مقابر میں میراں عادل شاہ اور مبارک شاہ کے مقبرے قابل تذکرہ ہیں جن کی مرمت محکمہ آثار قدیمہ نے کرادی ہے۔ شہر کے جنوب و مشرق کے گوشہ میں ترکی وضع کا سنگ مرمر کا ایک زنانہ حمام بھی ابھی باقی ہے۔ یہ اب ڈاک بنگلہ بنا دیا گیا ہے۔ اور اس کی مرمت و نگہداشت ہوتی رہتی ہے۔ اس کی چھتیں گنبد دار مثمن ہیں۔ درمیان کے حوض بند کر دیے گئے ہیں۔ جھرنے اور نالیاں ہنوز قائم ہیں۔ دریائے تاپتی سے (جو نیچے بہتی ہے) اس کی کرسی اسی فٹ بلند ہوگی۔ نہایت دلکش و دلفریب منظر ہے۔ اتوارہ کے دروازے کے باہر شاہ سوزا کا گنبد معہ چار دیواری کے نظر آتا ہے۔ یہ نہایت خوبصورت عمارت ہے۔ گنبد نہایت خوشنما خربزہ کی شکل کا ہے۔ اس کے نیچے کا حصہ بارہ پھل کا ہے۔ ہر پھل میں نہایت خوشنما در بنے ہیں۔ اور بہت نفیس نقاشی اور گلکاری کی گئی ہے۔ یہ اب بھی اچھی حالت میں ہے۔ شیخ نظام الدین چشتی بھکاری (متوفی ۹۸۵ھ) شیخ بہاء الدین، شاہ منصور، شیخ عیسٰے، شاہ برہان الدین راز الٰہی، شاہ جمال قادری، شاہ بیم، اور اور بہت سے اولیاء کبار اور بزرگوں کی درگاہیں مرجع خاص و عام ہیں، ان کی شاندار عمارات اپنے گنبدوں، وسیع و خوبصورت مساجد اور خوشنما خانقاہوں کے ساتھ قابل دید ہیں۔ کوس بھر کے فاصلہ پر شاہ نواز خاں (خطاب، مرزا ایرج نام، عبد الرحیم خاں خانخاناں کے بڑے بیٹے) کا نہایت خوبصورت اور رفیع الشان مقبرہ بنا ہوا ہے۔ اس پر چینی کا کچھ کام باقی ہے۔ خود مرزا عبد الرحیم کی یادگار ایک پختہ سرا ہے جس میں اب بازار لگتا ہے۔ دروازے کی پیشانی پر کتابہ لگا ہوا ہے۔ جہانگیر کے عہد میں ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۸ء) میں اسکی تعمیر ختم ہوئی تھی

یہ بھی یاد رکھنے کی بات ہے کہ شہنشاہ جہانگیر نے برہان پور میں ایک مکمل سلسلہ آب رسانی کا قائم و جاری کرایا تھا۔ اس میں سے بعض راجبہاؤں اور چاہات اور حوضوں کے نشانات اب بھی باقی ہیں حال میں رد و بدل یہ کیا گیا ہے کہ سنگی نلوں کے بجائے آہنی لگا دئے گئے ہیں۔ اہل نظر لکھتے ہیں کہ اس سے بہتر اور

میر غلام علی لکھتے ہیں کہ "اس زمانہ میں اس خوبی و شان کا کوئی امیر سُنا یا دیکھا نہیں گیا۔ امیر الامرا جامع اخلاق حمیدہ تھا۔ اُس کی سرکار کا "صلائے عام" اور "افراط طعام" مشہور ہے۔ اورنگ آباد میں لوگ بالاتفاق کہا کرتے تھے کہ اُس کے عہد میں بہت سے آدمیوں کے گھر کھانا نہیں پکتا تھا امیر الامرا

با قاعدہ مصفیٰ پانی پہونچانے کا کارخانہ کہیں پایا نہیں گیا۔

شاہجہاں کی محبوب اور شہرۂ آفاق ملکہ ممتاز محل کا انتقال بھی اسی برہان پور میں ہوا تھا وہ زین آباد کے مشہور و وسیع باغ کے اندر، جو ایک خوبصورت عمارت ایک حوض کے مابین واقع تھی چھ مہینہ تک دفن رہی تھی اس باغ کے نشانات اب بھی موجود ہیں۔

با ایں ہمہ افراط آب و آبرسانی بُرہان پور میں کسی وقت کثرت گرد و غبار کی شکایت بدرجہ غایت تھی۔ آزاد بلگرامی کو دکن کے قیام کے زمانہ میں اولیائے کرام کی قبور طیبہ کی زیارت خصوصاً حضرت شاہ برہان (متوفی ۱۰۳۱ھ) اور اُن کے پیر و مرشد سید لشکر محمد عارف (متوفی ۹۹۳ھ) کے مزارات کی آستان بوسی کے لئے بارہا یہاں آنا پڑا تھا۔ مآثر الکرام میں لکھتے ہیں کہ اس وسیع قلمرو میں کوئی دوسرا شہر اسکی گرد کو بھی نہیں پہونچتا۔ اس کی شاعرانہ یا عقیدتمندانہ توجیہ یہ فرماتے ہیں ؎

فتاد بس کہ گذر لشکر محمد را　　غبار خیز بود کوچہائے بُرہاں پور

۱۱۴ بلغور۔ واو معروف۔ ہر غلہ جو چکی میں ڈالکر پیس لیا یا توڑ لیا گیا ہو اُس سے جو چیز یا آش تیار کیا جائے وہ بھی بلغور کہلاتا ہے۔ معمولاً آش گندم سے مراد ہوتی ہے۔

۱۱۵ شہر سورت، برلب دریائے راپتی، بجانب جنوب، سمندر سے چودہ میل بذریعہ دریا، اور دس میل براہ خشکی واقع ہے۔ عہد اورنگ زیب خلد مکان میں صوبۂ گجرات میں شامل تھا۔ کسی وقت ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی شہر تھا۔ اشیائے درآمد و برآمد کا کثیر حصہ تو بمبئی کو منتقل ہو گیا، تاہم ابھی سوداگری کا ایک بڑا مرکز سمجھا جاتا ہے۔ اٹھارھویں صدی میں اس ملک ہندوستان میں سورت سب سے زیادہ آباد شہر تھا۔ ۱۷۹۷ء میں اُس کے باشندگان کا تخمینہ آٹھ لاکھ نفوس کا کیا گیا تھا۔ اگر اس میں کچھ شک و شبہ کی گنجائش مانی جاوے تو بھی یہ شمار کہاں تک گھٹایا جائیگا۔ ۱۸۱۱ء میں دو لاکھ پچاس ہزار اور ۱۸۱۶ء میں ۱۲۴۴۰۶ آبادی تھی جو رفتہ رفتہ کم ہوتی گئی۔ ۱۸۴۷ء کے بعد بتدریج اضافہ ہو کر ۱۹۰۱ء میں ایک لاکھ بیس ہزار کے قریب پہونچ گئی تھی ۱۹۱۱ء میں ۱۱۴۸۶۸ اور ۱۹۲۱ء میں ۱۱۷۴۳۴ رہ گئی۔

کی سرکار کے طباخ اپنے حصے کا کھانا بیچ ڈالتے تھے۔ متکلف پلاؤ کی قاب چند (تانبے کے) پیسوں کے عوض مل جاتی تھی۔"

دکن میں غلہ خام و پختہ کے لنگر خانوں کا جاری کرنا، ہر ماہ کی گیارھویں اور بارھویں کی مجالس کا دکن اور ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں اور مقامات میں قائم کرنا، امیر الامرا کے اعمال خیر سے ہے۔ ان مجلسوں میں فقرا و مشائخ کے ساتھ وہ نہایت عجز و انکسار کے ساتھ پیش آتا، طرح طرح کے سلوک کرتا، خود اپنے ہاتھ میں آفتابہ لیکر مہمانوں کے ہاتھ دھولاتا تھا۔

امین الدولہ اور امیر الامرا کی بدمزگی اور میر عبدالجلیل کی سعی و سفارش سے امیر الامرا کا امین الدولہ کی تقصیرات سے درگزر کرنا اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اُس کے انصاف و جوانمردی کی متعدد حکایتیں اور واقعات زبانزد ہیں۔ دکن پہونچنے سے پہلے روپیہ کی شدید ضرورت تھی وہاں پہونچکر ضرورت اور بڑھی سخت پریشانی ہوئی۔ عمال و متصدیوں نے آمدنی کی قلت اور اخراجات کی زیادتی کی اطلاعیں بھیجنا شروع کیں۔ اسی بنا پر حیدر قلی خاں حاکم بندر سورت نے ملا عبدالغفور ملک التجار بندر مذکور کا مال و متاع جو ایک کرور سے زیادہ کا تھا ضبط کر لیا۔ متوفی کا لڑکا ملا عبدالحی مستغیثانہ حضور میں آیا اور بشرط معافی

یہاں کی دولت تمامتر پارسیوں اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے۔ مسلمان بجز بوہروں کے باقی سب شکستہ حال ہیں۔ بوہرے البتہ دولت مند اور مرفہ الحال تاجر ہیں۔ ان کے پیر صاحب "ملا" کہلاتے ہیں اور یہیں رہتے ہیں۔ سیر و تفریح کا شوق اور مشغلہ سورت کی ہر ایک ملت اور طبقہ کے لوگوں میں یکساں اور تمام مقامات سے زیادہ پایا جاتا ہے۔ باغات میں برابر مختلف اقوام کے جلسے اور دعوتیں ہوتی رہتی ہیں۔ جلوس بڑے تزک و احتشام سے نکلتے ہیں جن پر صرف کثیر کیا جاتا ہے۔ شہر سے کچھ فاصلہ پر میلے لگتے ہیں۔ ان ضیافتوں میں پارسی بھی شامل و شریک ہوتے ہیں۔ بوہرے اپنی مہمان نوازی اور خوش گزرانی کی بدولت دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہ تمام فضول مصارف اور شاہ خرچیاں اُس زمانہ کی یادگار سمجھنا چاہئیے جب دولت و مال کا ان کے پاس حصر و شمار نہ تھا۔

دریا کے پیچ اور ساحل کے وسط میں قلعہ ہے۔ اس میں پرانی سی بے قاعدہ قلعہ بندی و تحصین کی گئی ہے ہر گوشہ پر برج ہیں جن سے قلعہ بہت پر فضا اور دریا سے نہایت خوش نما معلوم ہوتا ہے۔ خداوند خاں ایک ترک سپاہی نے جو

مال پندرہ لاکھ روپیہ امیر الامرا کو نیاز دینا چاہا۔ امیر الامرا نے ایک روز صبح کے وقت ملّا عبد الحیٰ کو بلا کر مال مذکور معہ رقم نیاز کے معاف و واپس کر دیا۔ خلعت دیکر اُس کے وطن کو رخصت فرمایا۔ اور کہا کہ "آج شب کو اس شخص کے مال کے متعلق مجھ سے اور میرے نفس سے مجادلہ رہا۔ آخر الامر میں اپنے نفس طامع پر غالب آگیا۔"

[ایک ایسا ہی واقعہ معدلت شاہجہانی کی یادگار ہے۔ سورت اُس وقت ہندوستان کا سب سے بڑا بندرگاہ اور ممالک بیرونی کی تجارت کے لئے ممتاز تھا۔ وہاں کے حاکم محمد امین نے تشخیص مال و ابواب میں سختی اور تحصیل مطالبات میں بیجا سخت گیری کی۔ اطلاع ہونے پر حکماً دربار میں گرفتار کر کے لایا گیا۔ منصب و جاگیر ضبط ہوئی۔ ثبوت جرم پر اُس کی آستین میں علیٰ رؤس الاشہاد والعیاذ سانپ چھوڑنے کا حکم صادر ہوا۔ امرائے مقربین نے سعی و سفارش کی۔ نامقبول ہوئی۔ سورت بادشاہ کی بڑی بیٹی جہاں آرا بیگم کی جاگیر میں تھا۔ اہل تدبیر نے بیگم صاحبہ سے عریضۂ شفاعت لکھا کر پیش کرایا۔ شاہجہاں سخت ناخوش ہوا۔ امین کو حراست خانہ میں بھیجدیا۔ اور محل سرا میں جاکر شاہزادی کو نہایت زجر و توبیخ کی۔ اسی سزا کے نفاذ کا پھر حکم دیا اب کس کو سرتابی یا گریز کی مجال ہو سکتی تھی۔ مگر سعد اللہ خاں کا نائب راجہ رگھوناتھ رائے (جس کو عالمگیر

شاہان گجرات کا ملازم تھا۔ ۹۴۷ھ (۱۵۴۰ء) میں پرتگالی انداز پر اس کا نقشہ بنایا اور اس کو تعمیر کیا تھا۔ یہ قلعہ مغلوں کے عہد میں اور انگریزوں کے زمانہ میں بعد غدر تک فوجی مرکز و مسکن رہا ہے۔ اسی خداوند خاں کی تعمیر کی ہوئی مسجد اور مرزا سامی کا مقبرہ بھی اُسی سال کا ہے۔ اس پر نہایت عمدہ نقاشی اور نگکاری کی گئی ہے۔ اس کے سوا نو سید صاحب کی مسجد اور نو مقبرے متصل کے اور مسجد سید عید روس تعمیر شدہ ۱۰۴۹ھ (۱۶۳۹ء) قابل دید عمارات ہیں۔

ابو الفضل صوبہ گجرات کے ذیل میں لکھتا ہے "سورت از نامور بنادر، دریائے تاپتی نزد او گزرد، ہفت کروہی ہدد پاسے شور پیوندد۔ سورت با حویلی، قلعہ سنگین دارد"

سورت ایک تاریخی مقام ہے۔ یونانی سیاح و جغرافیہ نویس ٹالی Ptolemy (سنہ ۱۵۰ء میں) اس شہر کے متبرک حصہ پھول پدا کا ذکر کرتا ہے۔

مسلمان مورخین تیرھویں صدی کے آغاز میں قطب الدین کا فتح کرتے ہوئے یہاں آنا بیان کرتے ہیں۔ ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء) میں بغاوت گجرات کے زمانہ میں محمد بن تغلق کے عہد میں افواج شاہی نے اس کو تباہ و غارت کیا۔ ۸۸۶ھ

بھی عزت و نیکی کے ساتھ یاد کرتا ہے) بڑھ کر آداب فدویانہ بجا لایا اور گزارش کیا کہ اس ظالم و خائن کے ذمے مظلوم و ستم رسیدہ رعایا کا بہت سا روپیہ واجب ہے۔ جب تک پوری تحقیقات ہو کر رعایا کا زر بالفعل ادا نہ ہو جائے تفصیل سزا میں توقف ہونا چاہئے۔ یہ عرض قبول ہوئی اور جس قدر روپیہ لوگوں سے بیجا وصول کیا گیا تھا راجہ نے حساب کر کے واپس کرا دیا۔]

امیر الامرا نہایت ذہین تھا۔ شعر خوب سمجھتا۔ فن تاریخ دانی میں یکتا تھا۔ ارباب کمال کو نہایت دوست رکھتا تھا۔ نماز صبح کے بعد اذن عام تھا۔ صاحبان فضل و کمال آتے اور پہر دن چڑھے تک اہل علم و ہنر کی صحبت رہتی۔ تاکید تھی کہ اس وقت کوئی اہلکار یا متصدی سرکار آنے نہ پائے۔ میر عبدالجلیل امیر الامرا کی خوش فہمی کی اپنے اعزہ و اہل برادری سے ہمیشہ اپنی زبان و قلم سے تعریف و توصیف کیا کرتے تھے۔ اس کے مرثیہ میں ایک بڑا زبردست قصیدہ لکھا تھا جس میں تاریخ بھی نکالی ہے۔ انکو امیر الامرا کے ساتھ جیسی محبت مفرط تھی اس کے لحاظ سے جلے ہوئے دل کے پھپھولے خوب پھوڑے ہیں۔

آثار کربلاست عیاں از جبین ہند — زد جوش خون آل نبی از زمین ہند
شد ماتم حسین علی تازہ در جہاں — سادات گشتہ اند مصیبت نشین ہند
نیلی است نیل معاملہ پیراہن عرب — وز خون گریہ سرخ شد است آستین ہند

(سنہ ۷۷۳ھ میں فیروز تغلق نے یہاں قلعہ تعمیر کرایا۔ سنہ ۹۲۰ھ (سنہ ۱۵۱۴ء) میں ایک پرتگیز سیاح باربوسہ Barbosa یہاں آیا۔ اس کے بعد سے برابر پرتگالی سیاح اور غارتگر اور جہاز یہاں آنے اور لوٹ مار اور آتش زنی کرنے لگے۔ سنہ ۹۸۰ھ (سنہ ۱۵۷۳ء) میں خود اکبر نے محاصرہ سنگین کر کے سورت کو مرزایان کے ہاتھ سے فتح کیا۔ ایک سو ساٹھ (۱۶۰) سال تک یہ مقام مغلوں کے اقتدار اور ان کے امرا کے قبضہ میں رہا۔ اس کی دلچسپ تاریخ اور اس کی تجارت کی روز افزوں گرم بازاری ایک مستقل تحریر اور تفصیل کی محتاج ہے جس کی ان مختصر حواشی میں گنجائش نہیں۔

تاریخ اسلام میں سورت "باب الملکہ" اور "بندر مبارک" لکھا جاتا تھا۔ سنہ ۱۰۷۴ھ (سنہ ۱۶۶۴ء) سے سورت پر مرہٹوں کے حملے شروع ہوئے۔ اورنگ زیب کی وفات یعنی سنہ ۱۱۱۸ھ (سنہ ۱۷۰۷ء) کے بعد سے تو سلاطین دہلی کا اقتدار و اختیار برائے نام تھا۔ سنہ ۱۱۴۶ھ (سنہ ۱۷۳۳ء) میں تیغ بخت خاں گورنر نے خود مختاری کا اعلان کیا۔ ۱۴ مئی سنہ ۱۸۰۰ء کو جو

گیتی چرا سیاہ نہ گردد ز دود غم — خاموش شد چراغ نشاط آفرین ہند
ہند این چنین مصیبت عظمیٰ ندیدہ است — دیدیم داستان شہور و سنین ہند
از داغ دل زند چراغان اشک جوش — این است نوبہار گل آتشین ہند
ماہی در آب می طپد و مرغ در ہوا — از شیون عظیم امیر امین ہند
فرزند مصطفیٰ لخلف الصدق مرتضیٰ — کز روے فخر بود بہ آتش نگین ہند
رستم نشان حسین علی خاں شہید شد — از خنجرے کہ بود نہاں در کمین ہند
آن صفدرے کہ از قلم تیغ بارہا — تحریر کردہ نسخۂ فتح مبین ہند
تیغش بروز معرکہ خصم سیہ بخت — چوں برق می شگافت صف آہنین ہند
دریا دلے کہ بود ز ابر عطا کفش — شادابی بہار بہشت برین ہند
از بہر ہر ہلاک زدہ عالی جناب — در ترکتاز حادثہ حصن حصین ہند
منقاد او شدند از آں سرکشان دہر — کز داغ ضبط کرد نشاں بر جبین ہند
ہند از شہادتش تن بے روح گشتہ است — یعنی کہ بود او نفس واپسین ہند
عالم چو چہرہ در نظر خلق شد سیاہ — افتاد تا ز خاتم دہر آں نگین ہند

معاہدہ انگریزوں سے ہوا اُس نے سورت اور اُس کے مضافات و ملحقات کا نظم ختم کر دیا۔

میر غلام علی آزاد نے اپنے سفرِ حجاز کے تذکرے میں سورت کو بڑی محبت سے یاد کیا اور "معمورۂ محروسہ" "بلدۂ مانوسہ" اور "سرۂ مسرورہ" کا بارہا نام لیا ہے۔ تمام مورخین متفقاً لکھتے ہیں کہ سلاطین تیموریہ کے عہد سلطنت ترقی میں سورت سب سے بڑا بندرگاہ تھا۔ اُس زمانہ میں اُس کی رونق تمام بندرگاہوں سے بڑھی چڑھی تھی۔

۱۱۱۹ھ ملک التجار عبد الغفور کی نسبت صاحب سیر المتاخرین لکھتا ہے کہ وہ ایک ممتاز بوہرہ سوداگر تھا جس کی دولت و ثروت کا شہرہ اقصائے عالم میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے زر و مال کا شمار کروروں سے متجاوز تھا

اس پر پیلان فرانسیسی نے (۱۶۰۸ء میں) اضافہ کیا تھا کہ "بوہرے مسلمان تاجران سورت کا ایک مشہور فرقہ یا طبقہ ہیں۔ یہ داڑھی رکھتے ہیں ایک مخصوص وضع کا عمامہ باندھتے ہیں اور آپس ہی میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ سورت کو سورت بندر انھیں دولت مندوں نے بنا رکھا تھا۔ اسی لیے اپنی بود و باش محدود رکھتے ہیں۔ بعد۔

گردوں ز اختراں ہمہ تن اشک گشتہ است | در اعتنائے ماتم رکن رکین ہند
دل چاک چاک گشت جگر داغ داغ شد | زیں غم کہ گشت زہر از و انگبین ہند
اِسْتَرجَعَ المَلائکۃُ وَاسْتَعبَرَ الفَلَک | فِی ہٰذِہِ المُصِیبَۃِ سُحقاً الّذِینَ ہِنْد
از دست ابن ملجم ثانی شہید شد | گوئی ز کوفہ است کل ماتمین ہند
تا کربلا و تا نجف و تا مدینہ رفت | سیلاب خون دیدہ و آہ انین ہند
اے دوستان آل و محبان اہل بیت | غمگیں شوید بہر حسین حزین ہند
تا حق اہل بیت رسالت ادا شود | بر رغم ایں جماعۂ منصوبہ بین ہند
از کلک من بمرثیۂ سید شہید | ایں چند بیت ریخت چو در ثمین ہند
رضوان حق چو سبزہ قرین ضریح او | تا ہست حسن سبزہ بہ گیتی قرین ہند
سال شہادتش قلم واسطی نوشت | قتل حسین کرد، یزید لعین ہند

۱۱۳۲ھ

آزاد بلگرامی لکھتے ہیں کہ بعض ثقات (جن سے مراد غالباً اہل عقیدت ہوگی) کہتے تھے کہ امیر الامرا کے واقعۂ قتل سے پہلے کسی مرد صالح نے خواب دیکھا تھا کہ سید الشہدا ثالث ائمہ اثنا عشر (علیہ و علیٰ آبائہ السلام) نے امیر الامرا کو مخاطب کر کے فرمایا بلغ وعدک (۱۱۳۲ھ) و غلب عدوک (۱۱۳۲ھ)۔ اس سانحہ کے بعد جب حساب کیا تو ہر فقرہ تاریخ تھا اور صنعت تقلیب بھی۔

قلی خاں نے جس حصۂ دولت پر قبضہ کر لیا تھا اس کی مالیت ایک کروڑ ہوگی حالانکہ اس کا کاروبار کروڑہا روپئے کا تھا۔ اس شاہ تاجر کے یہاں انیش جہاز اتنے بڑے بڑے تھے جتنا دولت برطانیہ کا جہاز انڈیامین Indiaman مگر عجیب اتفاق یہ تھا کہ وہ اس شمار کو کبھی بیس تک نہ پہونچا سکا ہر سال ایک دو جہاز بنائے اور اضافہ کئے جاتے تھے مگر اتنے ہی بیکار یا ضائع ہو جاتے تھے۔"

اسی کا ایک ہم پیشہ خواجہ جاوید فخر التجار تھا۔ پونے دو سو برس کی بات ہے کہ وہ ہندوستان کے گورنر جنرل سے بھی زیادہ شان و شوکت رکھتا تھا، اس کا احتشام و اقتدار اُس زمانہ کے ناظم بنگال کے مساوی تھا پندرہ ہاتھی پچاس بہترین قیمت گھوڑے اس کے اصطبل میں رہتے تھے۔ ایک سو بیس عورتیں محل میں تھیں۔ پندرہ چوبدار اور دو سو خدمتگار رہتے تھے۔ پانچ جہاز تھے۔ دو ہزار کشتیاں تھیں۔ نمک کا کل اجارہ تھا یہ تو معلوم نہ ہو سکا کہ اُس کے

مثنوی شادی فرخ سیر بادشاہ میں حسین علی خاں کی ستایش میں بہت سے اشعار موجود ہیں ؎

سپہ سالارِ فوجِ نصرت آثار / امیرِ صاحبِ شمشیرِ خوں بار
رسول اللہ را فرزندِ کونین / امیر المومنیں را قرۃ العین
بوالا دودمانی بے نظیر است / امیر ابن الامیر ابن الامیر است
امیر است و امیراں را بہ سیما / کہ سر باشد رئیس جملہ اعضا
فروغِ مہرِ شاہنشاہ والا / خلافت رتبۂ ایزد تعالیٰ
نمایاں از دلِ او چشمِ بددور / چو از مصحف شعاعِ سورۂ نور
متجلی دارد از مہرِ نبوت / بآبائے کرام ارثِ فتوت
کرم ممنونِ دستِ اوست در بزم / ظفر مفتونِ تیغِ اوست در رزم
بروز جنگ نصرت آفرین ست / نشانے از امیر المومنین ست
نہ تنہا او ز حیدر یادگار است / کہ تیغش نیز یاد از ذوالفقار است
ازاں دستش قوی چنگال دارد / کہ زور از موتم الاشبال دارد
ازاں در رزم باشد نصرت ایجاد / کہ ہست او از حسین و از علی یاد
چو ایجادش ازاں ہر دو امام است / مرکب نام او از ہر دو نام است
ز نواب و ز خان قدرش بلند است / شرف ز اجداد خود او را پسند است
برائے مدعا بہ زیں مثل نیست / مکمل در لطافت چوں گل نیست
سیادت جامۂ پر افتخار است / کہ ایں را چوں گل و آں چوں بہار است
ثنا ہا جملہ خاطر خواہ گویند / چو فرزندِ رسول اللہ گویند

میر عبد الجلیل نے عید قرباں کی تہنیت میں یہ قطعہ امیر الامرا کی نذر کیا تھا ؎

پاس کتنی دولت تھی۔ لیکن اس کا خرچ معمولی ایک ماہ ہزار روپیہ روزانہ سے کم نہ تھا۔ ایک بار اس نے الہ وردی خاں (مہابت خاں، اخیر گورنر بنگال) کو سینتیس لاکھ نوے ہزار کا پیشکش دیا تھا۔ یہ دولت و ثروت بنگال کی تھی۔ اگرچہ اس زمانہ میں نمک تیس یا چالیس روپیہ فی سو من بکتا تھا

۱۳۵ آئین۔ نالہ و نالیدن

ھُمَامٌ یُبِیدُ النَّجْرَ بَاتَ عَطَاؤُهُ   أَفَاضَ عَلٰی مَنْ جَرَّ جُوْدًا عَوَائِدَا
تَنَسَّکَتْ هَدْیُ الْجُوْدِ فِیْ کُلِّ مَوْقِفٍ   وَأَلْبَسَتْ نَحْرَ الْمُعْتَفِیْنَ[۱۲۲] قَلَائِدَا

امیر الامرا ہر سال مولد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں خوب روشنی و چراغاں کیا کرتا تھا۔ کعب بن زہیر کے ایک مشہور مصرع کی تضمین کر کے میر نے اس اہتمام و احتشام کو خوب چمکایا ہے۔ ؎

اَمْنَاءُ رُکْنِ الْاُمَرَاءِ عَالِیْ سَیِّدِ الْاُمَرَاءِ   شَہْرُ الرَّسُوْلِ شُمُوْعًا فِیْ غَیَاهِبِہٖ
اَشْرَقَ الشُّمُوْعُ عَلَی الْمُخْتَارِ مُشْتَعِلًا   اِنَّ الرَّسُوْلَ لَنُوْرٌ یُسْتَضَاءُ بِہٖ

واقعہ یہ ہے کہ میر عبدالجلیل پر امیر الامرا کے احسانات و عنایات کا بار کچھ کم نہ تھا۔ ان کے تعلق دربار و قیام دہلی کے باعث وہی تھے۔ ملازمت مکرر و جاگیر انھیں کی بدولت نصیب ہوئی۔ میر سید محمد کے تقرر خدمات کی سعی و توجہ میں بھی امیر الامرا کا حصہ غالب تھا۔

سیاسی مصالح اور روپیہ کی ضرورت مسلّم مگر امیر الامرا کا یہ گناہ ناقابل عفو ہے کہ فرخ سیر کے زمانہ میں اپنے اقتدار و اختیار کا بعض اوقات بیجا استعمال کیا تھا۔ ممتاز محل (شاہجہاں کی ملکہ) کی شہرۂ آفاق قبر سے مروارید کی چادر جبر و ستم سے لے لی۔ اُس دورِ فلاح و ارزانی میں یہ چادر لاکھوں کی تھی اور اب تو کروڑوں کی ہوتی۔ تاج محل سے جو چیزیں امیر الامرا نے غصب کی تھیں اُنکی قیمت تین کروڑ بتائی جاتی ہے۔ ؎

اتنی نہ بڑھا پاکیِ داماں کی حکایت   دامن کو ذرا دیکھ! ذرا بندِ قبا دیکھ!!

---

۱۲۱ تنسک۔ بتقیمیں۔ ... اور ... ہونا

۱۲۲ معتفی۔ بعیص ... جو شخص طالب فضل و رزق ہو۔ از نہایہ جوزی

میر سید محمد المتخلص شاعر

نِعَمُ الْاِلٰہِ عَلَی الْعِبَادِ کَثِیْرَۃٌ　　وَاَجَلُّھُنَّ نَجَابَۃُ الْاَوْلَادِ

میر سید محمد ہر اعتبار سے میر عبد الجلیل کے خلف الصدق تھے۔ ۱۴ ربیع الاول سنہ ۱۱۰۱ھ (۱۴ دسمبر سنہ ۱۶۸۹ء) کو سہ شنبہ کے دن نماز ظہر کے بعد بلگرام میں پیدا ہوئے اور مصداق الولد الحر یقتدی بآبائہ الغر تمام علوم شریفہ و فنون لطیفہ کے جامع اور فضائل و کمالات کے حامل تھے۔ عربیت، لغت، ہندی اور تاریخ دانی میں خاص کر دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ درسی کتابیں میر طفیل محمد سے پڑھی تھیں اور باقی کمالات و فنون اپنے پدر جلیل سے حاصل کئے تھے اور بقول السراج المستغنی بالسراج یکون مثل الاول تمام فضائل صوری و معنوی و خصائل رضیہ میں ممتاز اور باپ کے ہمقدم تھے۔ نہایت صدق و راستبازی، صفا و یک رنگی سے بسر فرماتے۔ ان کا جوہر ہمت و سخاوت بہت بلند تھا۔ سید العارفین میر لطف اللہ عرف شاہ لدھا کے مرید تھے۔ اکثر اوقات مطالعہ و مباحثہ کتاب میں مصروف رہتے۔ کتب حقائق مثل فتوحات مکیہ وغیرہ کے اکثر زیر نظر رہتی تھیں۔ پڑھانے کا بھی شوق تھا۔ آزاد اور یوسف دونوں خواہر زادوں کو عروض و قافیہ اور بعض فنون و نکات ادب بتائے تھے۔ صوفیہ کرام کے اقوال و حکایات، و اشعار عربی و فارسی اور ہندی کے گیت اور دوہے ان کو بے شمار یاد تھے۔

میر عبد الجلیل کو شفقت کے ساتھ جو لازمۂ ابوت ہے، میر سید محمد سے عنایت و محبت خاص تھی۔ جس زمانہ میں کہ میر صاحب بھکر میں تشریف فرما تھے میر سید محمد نے کئی بار وہاں جانے اور شرف قدمبوسی حاصل کرنے کا ارادہ کیا۔ لیکن سفر کے شدائد اور بھکر کی آب و ہوا ناسازگار و ناموافق ہونے کی وجہ سے میر صاحب ہمیشہ (باوجود غایت الفت پدری و شوق لقا) مانع آتے رہے۔ میر سید محمد کو تحریر فرمایا اور صاف طور پر سمجھایا تھا کہ

اگر علیلی نمی باشد بنا بر آں ارادہ سفر ایں طرف وا رند بر خوردار اخوند ہی داشتہ کہ در ایں جا

ما ہمیں شما اید کسے کہ یک پسر داشتہ باشد باختیار خود جدائی پسر را قبول نہ دارد۔ تمام آرزوئے ما ہمین است کہ شمارا سیر بہ بینم۔ اما اسباب و دواعی مختلفہ نمی گزارند کہ شمارا بطلبم۔ اول خود ہوائے بھکر از سہ چہار سال ایں قدر مختلف شدہ کہ در نوشتن نمی آید۔ خصوص در موسم سرما ایں قدر تغیر فاحش در ہوا ہم می رسد کہ ہیچ متنفسے از آزار سالم نمی ماند۔ ایں معنی را از مداری و فیض اللہ کہ تازہ می رسند تحقیق نمایند و مقدمات دیگر کہ عدم دلجمعی کلیہ جا تفسیر آں تواند شد نیز رادع ایں ارادہ اند بنا بر آں جرأت بہ براہ پیمائی دور و دراز نمودہ تجویز مشاق نمی کنم۔"

جب میر عبدالجلیل بھکر سے شاہجہاں آباد پہنچے تو میر سید محمد کو اپنے پاس بلانا چاہا اور والا نامہ بھیجا لیکن باقتضائے وقت و مصالح فی الفور یہ حکم بھی بھیجا کہ توقف کیجئے اور دوسری اطلاع یا طلب ثانی کا انتظار فرمائیے۔ میر سید محمد نے اس کے جواب میں عرض کیا لَنْ اَبْرَحَ الْاَرْضَ حَتّٰی یَاْذَنَ لِیْۤ اَبِیْ (جب تک مجھکو میرے والد اجازت نہ دیں میں تو اس جگہ سے ٹلنے والا نہیں ہوں۔ جزو ۱۳۔ سورۂ یوسف ع ۱۰۔۸۰)۔ میر عبدالجلیل اس جواب سے نہایت خوش ہوئے اور اپنی محبت و رضا کا ان الفاظ میں اظہار فرمایا

ے تا یاذن لی ابی بخطت دیدم ؛ گلہائے طرب از چمن دل چیدم
از غایت اہتزاز پروانہ صفت ؛ لے شمع پدر اگرد سرت گردیدم

میر سید محمد نے ۱۱۵۵ھ (۱۷۴۲ء) میں کتاب مستطرف[۲۲۳] کا جو فن ادب عرب میں دلچسپ و مستند کتاب ہے نہایت دلپذیر انتخاب کیا اور الجزء الاشرف من المستطرف نام رکھا تھا۔ تبصرۃ الناظرین فارسی کی تاریخ بالخصوص بلگرام اور اہل بلگرام کے متعلق خوب لکھی ہے۔

---

۲۲۳ پورا نام المستطرف فی کل فن مستظرف ہے۔ امام الشہی شیخ شہاب الدین محمد بن احمد الخطیب کی تالیف ہے۔ مصر میں دو جلدوں میں چھپی ہے۔ ادب و انشا کی بہترین اور جامع کتابوں میں اس کا شمار ہوتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اسکے چوراسی بابوں میں محاضرات، اجتماع، سیاست، تصوف جملہ علوم و فنون کو مختصر حکایات و لطائف میں محفوظ و پیش کر دیا ہے شیخ نے ۸۵۰ھ (۱۴۴۶ء) میں وفات پائی۔ کان مثواہ جنۃ الماویٰ

جب میر عبدالجلیل نے ۱۱۳۰ھ (۱۷۱۸ء) میں اپنی خدمات سے استعفا دیا تو سلطان فرخ سیر نے سرکار بھکر و سرکار سیوستان کی بخشی گری و وقائع نویسی و سوانح نگاری میر سید محمد کے سپرد کیں۔ سید محمد نے اپنے محل خدمات پر ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں پہونچکر اپنا کام شروع کر دیا۔ وہاں کی تمام رعایا اور رؤسا میر سید محمد کی نیک مردی، نیک نیتی، دیانت اور حسن معاملت سے نہایت راضی و مطمئن رہے۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں میر سید محمد سیوستان میں میر غلام علی آزاد کو اپنا نائب چھوڑ کر بلگرام چلے آئے اور جب انکی خدمات میں خلل پڑنے کی خبر ملی تو دہلی پہونچکر بعض امرا کے توسل سے اسکو رفع دفع کیا۔ ۱۱۴۵ھ (۱۷۳۲ء) میں مکرر سیوستان تشریف لے گئے۔ وسط ۱۱۴۷ھ (۱۷۳۴ء) میں آزاد کو ہندوستان واپس جانے کی اجازت دی اور خود اپنی خدمات کی انجام دہی میں مشغول و مصروف ہو گئے۔ جب سندھ میں نادر شاہ کا تسلط ہوا تو میر سید محمد سے عہدہائے بادشاہی کا سررشتہ منقطع ہوگیا۔ خدایار خاں[۱۲۷] والی سندھ نے آپ کو عرصہ تک نہیں چھوڑا اور کمال اعزاز و اکرام کے ساتھ سیوستان میں مقیم رکھا۔ نہایت شایستہ خدمات اور پسندیدہ سلوک عمل میں لایا۔ چونکہ اس ملک میں نادر شاہی ہنگامہ گرم تھا اور سندھ کی حالت پرانے طریق پر نہیں رہی تھی اس لئے میر صاحب وہاں سے نہایت دل برداشتہ تھے۔ چار و ناچار خدایار سے اجازت لی اور ۲۵۔ رمضان ۱۱۵۵ھ (۱۹۔ نومبر ۱۷۴۲ء) کو سیوستان سے نکل کھڑے ہوئے اور براہ مارواڑ وطن کا رخ کیا۔ ۲۷۔ محرم ۱۱۵۶ھ (۱۳۔ مارچ ۱۷۴۳ء) کو داخل بلگرام ہوئے۔ فعاد

آھلا الی موطنه من غربة طال بها عهد النوی۔

نیرنگ روزگار سے چالیس سال بعد اس خاندان کا آب و خور سندھ سے اٹھا تھا۔

حکیم عربی ابن خلدون نے اقوام و امم کی زندگی و اجل اور دولت و حکومت کی بقا و فنا کے بارہ میں ایک عمدہ تقریر لکھی ہے جسمیں یہ بحث بھی کی ہے کہ ان پر پیری و کہن سالی کیونکر آجاتی ہے اور جب تنزل نمودار ہوتا ہے تو اس کا زوال دشوار ہوتا ہے۔ اس بحث میں اکثر باتیں صحیح و

---

[۱۲۷] خدایار خاں بہادر ثابت جنگ عباسی، زمیندار خدا آباد۔ مخطوطات انجمن دارم مخلص میں اس کے نام کا ایک خط ملاحظہ طلب ہے۔

درست لکھی ہیں لیکن بعض جگہ اس کے ذہن نے خطا اور قلم نے لغزش بھی کی ہے جس طرح بعض اطبائے متقدمین نے افراد انسانی کی اجل طبعی (درازیٔ حیات) ایک سو بیس سال قرار دی ہے اسی طرح اس نے بھی دولت کی عمر تین ادوار (منزلیں) مانی ہیں۔ اہل نظر اس رائے کو صحت و صواب سے بعید مانتے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ خدا کے بنائے (بطریقے) ہوئے دنوں میں سو صرف تین ہی دن دولت کی عمر ہوتی ہے۔ یعنی طفولیت۔ بلوغ اشد و انتہا۔ مگر عمر و شیخوخت۔ اس میں سال، قرن کی مہلت و میعاد کہاں۔ اس اعتبار سے میر عبدالجلیل اور بزرگان بلگرام کا اتنی مدت کے بعد اس ملک سے چلا آنا محض اقتضائے فطرت انسانی یا گردش لیل و نہار تھا۔

اس سلسلہ میں ایک علمی لطیفہ یاد آگیا جب نادر شاہ والیٔ ایران نے ہندوستان پر تصرف و تسلط کر لیا اور اسکے بعد اپنے ملک کو واپس جانے کا ارادہ کیا تو کسی شخص نے نواب نظام الملک کو نادر شاہ کی واپسی و رجوع کی خبر دی۔ نظام الملک نے پوچھا کہ آیا اس خبر کی کچھ اصل بھی ہے۔ حضار مجلس میں سے ایک صاحب بولے "النادر کالمعدوم" اس کے عربی کے معنی تو ظاہر ہیں۔ "کل" ہندی میں بمعنی "غد" یا "فردا" آتا ہے۔ مقصود یہ تھا کہ نادر کل معدوم ہو جائے گا۔ نادر یں تو رہی بھی تھی۔

میر سید محمد نے آٹھویں شعبان ۱۱۸۵ھ (۱۲۔ نومبر ۱۷۷۱ء) کو شنبہ کی شب میں بلگرام میں وفات پائی۔ ان کے بھانجے اور شاگرد میر غلام علی آزاد نے جو اپنی عمر کا ستر والی مرحلہ طے کر رہے تھے اور وطن اور اہل وطن کو چھوڑ کر دکن میں مقیم تھے ان کا نہایت درد انگیز مرثیہ لکھا اور تاریخ نکالی ع
رفت قدسی جمال سید محمد از جہاں۔ آزاد نے ان کے حالات پر ایک تذکرہ میں لکھے ہیں اور بڑے امتنان و عقیدت سے ان کی شفقت و محبت کو یاد کیا ہے۔ عربی میں ایک قصیدہ اور چند قطعات و اشعار مرثیہ بھی آزاد نے لکھے ہیں۔

میر سید محمد بڑے طباع اور نقاد شاعر تھے۔ شاعر تخلص تھا۔ فارسی و عربی و ہندی میں کمال مہارت تھی تینوں زبانوں میں ان کا کلام موجود ہے اور دیوان مرتب۔

دنیائے علم پر میر سید محمد کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ انکو وقتاً فوقتاً جو خطوط میر عبدالجلیل نے سفر کی

لکھے تھے اُن کو یکجا کر دیا اور بعض پر مختصر حواشی یا ضروری تصریحات بھی لکھ دیے ہیں۔ ان خطوط سے اُنکی اصلی خانگی حالت اور قدیم طرزِ معاشرت کی جھلک نظر آتی ہے۔ افسوس ہے کہ خطوطِ مطبوعہ کے ساتھ اُنکی تاریخ تحریر درج نہیں ہے ورنہ سلسلۂ مکاتبت اور تسلسلِ واقعات کا پتہ چلتا۔ دوسرے اُن کی تعداد نہایت کم ہے یعنی صرف بائیس (۲۲)۔ اگر سب تعاتِ میر عبد الجلیل کے محفوظ و مرتب کیجا سے تو فنِ انشاء مکاتبت میں اُن سے بڑا قابلِ قدر اضافہ ہو جاتا۔

میر سید محمد نے منصور حلاج کے سال شہادت کی تاریخ صوری آیۂ قرآنی سے نکالی تھی: وَلَبِثُوا فِي كَهْفِهِمْ ثَلَاثَ مِائَةٍ سِنِينَ وَازْدَادُوا تِسْعًا [اور (اصحابِ کہف) اپنے غار میں تین سو برس رہے اور نو اور بھی۔ جزو ۱۵۔ سورۃ الکہف ع ۴۔ ۱۶۰۴] ایک مثنوی موسوم بہ ناز و نیاز بھی یادگار چھوڑی تھی، سید حسن ترمذی بلگرامی اور شاہ فیاض کا جو ان پر عاشق تھے دلچسپ پیرایہ میں قصہ نظم کیا ہے۔

میر غلام علی آزاد

میر غلام علی آزاد میر عبد الجلیل کے سب سے بڑے نواسے اور اُن کے مایۂ نازش، بلکہ سارے خاندان کے لیے باعثِ افتخار تھے۔ وہ اپنے تذکروں، قصائد اور مثنویات سے بلگرام اور اپنے اسلاف و اعزہ کو شہرتِ عام اور بقائے دوام کی سند دے گئے ہیں۔

آزاد کی ولادت ۲۵۔ صفر ۱۱۱۶ھ (۲۹ جون ۱۷۰۴ء) کو بلگرام میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت تمامتر وہیں پائی۔ درسی کتابیں ابتدا سے انتہا تک وہاں کے مشہور عالم اور استاد میر طفیل محمد کے حلقۂ درس میں پڑھیں، لغت، حدیث، سیرتِ نبوی اور فنونِ ادب کو میر عبد الجلیل سے حاصل کیا۔ عروض و قافیہ اور بعض دیگر شعبہ ادب اپنے ماموں میر سید محمد شاعر سے حاصل کیے۔ عربی شاعری میر عبد الجلیل سے سیکھی۔ ۱۱۳۳ھ (۱۷۲۱ء) میں حسبِ رواج خاندان میر سید لطف اللہ عرف شاہ لدّھا بلگرامی سے بیعت

طریقہ میں بیعت فرمائی۔ مذہباً حنفی تھے۔ اتباع امام کے ساتھ ضعیف الاعتقادی اور احداث فی الدین سے متنفر و محترز رہتے۔

جیسا کہ میر عبدالجلیل کے تذکرہ میں بیان ہوچکا ہے میر غلام علی و میر محمد یوسف انکے پاس سنہ ۱۱۳۴ھ (سنہ ۱۷۲۱ء) میں تکمیل علوم کیے دارالخلافہ شاہجہان آباد پہونچے۔ دوبرس وہاں قیام رہا۔ سنہ ۱۱۴۲ھ (سنہ ۱۷۲۹ء) میں آزاد کو سیوستان کے سفر کا اتفاق ہوا۔ میر سید محمد جو وہاں میر بخشی و وقائع نگار تھے ان کو نائب مقرر کرکے وطن چلے آئے۔ چار سال بعد واپس تشریف لے گئے تو ۱۱۴۷ھ (سنہ ۱۷۳۴ء) میں آزاد کو واپسی بلگرام کا موقع ملا۔

آزاد نے کسی وقت حضرت جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عالم رویا میں زیارت کی تھی شوق تجدید اور ولولۂ زیارت حرمین محترمین اسی زمانہ سے مستولی اور سینہ میں موجزن تھا۔ اسی حال میں جذبات الٰہیہ سے ایک جذبہ جسکو لجذبۃ من جذبات الرحمٰن یوازی عمل الثقلین کہنا چاہیے پہونچا اور آزاد اسی روز افزوں ذوق و شوق کے عالم میں اپنے احبا و اقربا کی اطلاع بغیر رجب سنہ ۱۱۵۰ھ (اکتوبر سنہ ۱۷۳۷ء) میں تنہا اور پا پیادہ بلگرام سے چل کھڑے ہوئے۔ زاد سفر کچھ نہ لیا۔ صرف اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ (میں تو اپنے پروردگار کی طرف چلا جاتا ہوں، وہ مجھے ٹھکانے لگادیگا جزو ۲۳ سورۂ والصّٰفّٰت ع ۳۔ ۷) زبان پر تھا اور جذبۂ عقیدت و محبت دامنگیر راستے کی صعوبات ناقابل برداشت ثابت ہوئیں، درد و محبت، سوز و گداز، کشش و نیاز کی کل روئداد کو آزاد نے ایک مثنوی میں درج کردیا ہے جسکا تاریخی نام طلسم اعظم ہے۔ اتفاقاً اثنائے راہ میں نواب آصف جاہ کا لشکر اطراف مالوہ میں خیمہ زن تھا۔ کسی فرد صالح نے بے سابقۂ معرفت و شناسائی ان کو اپنا مہمان بنایا۔ مراسم نیاز مندی و خدمتگزاری بجا لایا۔ سواری کے لیے ایک پر تکلف رتھ نذر کیا۔ ۲۲ شعبان کو نواب عالی مرتبت کا شرف لقا نصیب ہوا۔ آزاد نے یہ رباعی برجستہ عرض کی ؎

حق داد ترا خطاب آصف شایاں	اے حامی دیں! محیط جود و احساں
تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں	او تخت بدرگاہ سلیماں آورد

میر غلام علی آزاد نے مدۃ العمر شاعری کی مگر اغنیا و امراء کی مدح سرائی سے دور رہے۔ تمام
زندگی میں ایک یہی رباعی اور دو شعر اور نواب نظام الدولہ شہید کی شان میں کہے تھے۔ ظاہر ہے
کہ یہ رباعی محض مجبورانہ اور استعانت سفر بیت اللہ کے لئے گزارش کی تھی۔ آصف جاہ مبرور
اُس وقت مرہٹوں کی تنبیہ پر متوجہ تھے۔ صفوف اسلام کے ساتھ آزاد کو بھی شریک غزا و جہاد ہونا
پڑا۔ سارا رمضان سواد شہر بھوپال ۱۱۵۱ھ میں گزرا۔ آخر رمضان میں مصالحت ہوگئی۔ نواب نے زاد و
راحلہ حسب خاطر خواہ بہم پہونچا دیا۔ برہان پور ہوتے ہوئے آزاد سورت پہونچے اور جہاز پر سوار ہوگئے۔ ۱۱۵۱ھ
کا پہلا چاند (۹۔ اپریل ۱۷۳۸ء کو) سطح دریا پر کشتی کے عرشہ سے دیکھا۔ جہاز سے اتر کر جدہ سے مکہ پہونچے

۱۱۵۱ھ بھوپال، اکبر و اورنگ زیب کے عہد میں ملک گونڈوانہ میں داخل، اور صوبہ مالوہ میں شامل تھا۔ اب ایک ریاست وسط ہند میں مالوہ کے حدود شرقی میں واقع ہے۔ حکمران خاندان کا مورث یعنی ریاست کا بانی تیراہ کا ایک پٹھان دوست محمد خاں نام، بہادر شاہ کے اوائل عہد یعنی ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ء) میں دہلی آیا اور رفتہ رفتہ آزادی و اقتدار و اختیار حاصل کرتا گیا۔ بڑا دلیر و مستقل مزاج تھا۔ پہلے تو اس نے کچھ زمین اجارہ پر لی، بعد ازاں ریاست کی بنیاد ڈالی۔ ۱۱۴۳ھ (۱۷۳۰ء) میں وفات پائی۔ فیض محمد خاں جب اسیر و حاکم تھا تو اس نے عنان حکومت ایک ہندو بیجے رام کے ہاتھ میں دیدی تھی وہ شخص فی الواقع نہایت منتظم و مدبر تھا مگر بعد کو اس نے مقبوضات بھوپال باجی راؤ پیشوا کے حوالہ کر دی تھیں۔ فیض محمد خاں نے ۱۱۹۱ھ (۱۷۷۷ء) میں انتقال کیا۔ اٹھارھویں صدی مسیحی میں اس قطعۂ ملک پر جسونت راؤ پنوار راجہ دھار نے اور اس کے بعد امیر خاں نے قبضہ کر لیا۔

ابتدائی کچھ روز تک اسلام نگر دار الریاست رہا تھا۔

بھوپال میں بعض عمارات نفیس و قابل دید بنائی گئی ہیں۔ شہر کی آبادی عرصہ سے مائل بہ زوال ہے۔ ۱۹۲۱ء میں صرف ۴۵۰۹۴ اشخاص شمار میں آئے تھے۔

بھوپال کی فرمانروا بیگمات میں، نواب سکندر بیگم اور نواب شاہجہاں بیگم کا عہد نہایت ممتاز رہا ہے۔ ان کی خدمات نمایاں، معدلت گستری، حسن انتظام اور کارہائے رفاہ خلائق کے تذکروں سے صفحات تاریخ معمور ہیں۔ مدبرین فرنگ اور غیر ممالک کے اہل وقوف و خبرت نے خاص الفاظ میں ستائش و تحسین کی ہے۔

تقریباً پون صدی سے بھوپال علم و ادب کا مرکز چلا آتا ہے۔ پہلے صرف علوم دینیہ اسلامیہ اور فنون مشرقیہ کا مرکز تھا۔ والیۂ عالیہ سابقہ نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ (دام اللہ ظلالہا) کے عہد ہمایوں میں ہر قسم کے علوم و

بیت اللہ کی آستانہ بوسی فرمائی۔ مدینۃ النبی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے دیکھنے کا اشتیاق غالب تھا۔ تین دن مکہ شریف میں ٹھہر کر اُدھر کا رخ کیا۔ ۲۵ صفر ۱۱۵۱ھ (۲۸ جون ۱۷۳۸ء) کو سواد یثرب پاک سرمہ کش چشم سعادت ہوا۔ وہاں کے دوران قیام میں شیخ محمد حیات سندی مدنی[۱۲۶] سے صحیح بخاری پڑھکر سند حاصل کی۔ صحاح ستہ اور سائر مفردات کی اجازت لی۔ کئی نعتیہ قصائد عربی میں لکھکر روضۂ اقدس میں پیش کئے۔ عید الفطر آستان اطہر پر ہوئی۔ ۱۴ شوال (۱۵ جنوری ۱۷۳۹ء) کو بارگاہ رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ادائے حج کے لئے رخصت حاصل کی۔ ۲۰ ماہ مذکور (۲۱ جنوری) کو پھر مکہ مکرمہ میں داخل ہوئے۔ ذی الحجہ (مارچ) میں مناسک حج بجالائے۔ طائف بھی گئے۔ مکہ معظمہ میں شیخ عبد الوہاب طنطاوی[۱۲۷] کی صحبت میں حاضر رہ کر فن حدیث کے فوائد حاصل کئے۔ انھیں کے مکان پر قیام تھا۔ شیخ اس وقت سر آمد علمائے عصر سمجھے جاتے اور مکہ معظمہ میں فروکش تھے۔ مجالس درس وموعظت انکی ذات اقدس سے گرم و منور رہتی تھیں۔ آزاد کے اشعار عربی سنکر شیخ صاحب بہت تحسین فرماتے تھے جب میر غلام علی کا تخلص آزاد سنا اور اس کے معنی و مصرف کو سمجھا تو فرمایا کہ سیدی انت من عتقاء اللہ

فنون اور ہمت و تہذیب نے فروغ و ترقی پائی۔ جن کے دست جود و عطا کی بدولت اس وقت ہندوستان کی بڑی بڑی تعلیم گاہیں قائم اور سرسبز وشاداب ہیں۔ علیا حضرت کی کامیاب اور فیض رساں حکمرانی کو ایک عالم جانتا اور اعتراف کرتا ہے۔

فرمانفرمائے وقت، قوی شوکت سکندر صولت اعلیٰ حضرت حضور نواب لفٹیننٹ کرنیل افتخار الملک حاجی محمد حمید اللہ خاں صاحب بہادر (بالقابہ) ہیں۔ جو ایک سراپا خبر، روشن خیال، بیدار مغز اور قابل افتخار حکمراں ہیں، اپنی والدہ ماجدہ کے نقش قدم پر چلتے اور اہل علم وہنر کی سرپرستی وقدر دانی فرماتے ہیں۔ ؎

علا عن المدح حتی ما یزان بہ ۔ کانما المدح من مقدار ہ یضع

[۱۲۶] اطراف عادل پور توابع بکھر کے باشندے، قبیلۂ چاچر سے تھے۔ باپ کا نام ملا فلاریہ تھا۔ عادل پور آزاد نے بھی دیکھا تھا۔ شیخ محمد حیات آغاز شباب میں حجاز شریف تشریف لے گئے۔ مدینہ منورہ میں توطن قابل اختیار کر لیا تھا تحصیل علم بھی وہیں کی۔ باوجود فقدان وجہ معاش بڑی استقامت سے کام لیا۔ حرمین معظمین کی علمائے نامور مثل شیخ ابو الحسن سندی نزیل مدینہ و شیخ عبد اللہ بن سالم البصری المکی سے تلمذ تھا۔ حدیث شریف کی خدمت میں تمام عمر صرف کر دی اور

اسی طرح وہاں کے صاحبان فضل وادب اور بزرگان عرب نے آزاد کی عربی دانی اور قادرالکلامی کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا اور تعریف کی۔

ربیع الآخر ۱۱۵۲ھ (جولائی ۱۷۳۹ء) میں طواف وداع بجا لائے۔ ۳۰ جمادی الاول (۲۹ جولائی ۱۷۳۹ء) کو جدہ سے جہاز پر سوار ہوئے۔ بندرگاہ مخا (واقع ساحل یمن) ہوتے ہوئے سورت پہونچے۔ پانچ مہینہ قیام کیا وہاں سے سیدھے دکن چل دئے۔ آخر ذیقعدہ ۱۱۵۲ھ (وسط فروری ۱۷۴۰ء) میں وارد اورنگ آباد ہوئے۔ بابا شاہ مسافر[۱۲۸] نقشبندی کے تکیہ[۱۲۹] (مکان بود و باش فقرا) میں قیام اختیار کیا۔ سات سال تک اسی جگہ بسر کی۔ نواب نظام الدولہ خلف آصف جاہ سے بڑا ارتباط و اتحاد تھا۔ با ایں ہمہ آزاد، آزاد رہے، اور کوئی خدمت یا منت کشی اُن کی یا کسی امیر کی گوارا نہ کی۔

۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں وحشتِ دل پھر دامنگیر ہوئی۔ دیارِ عرب کی کشش تھی اور وطن و اہل وطن سے قطع تعلق پر سرگرمی و انہماک۔ لیکن ایک شب سروش غیبی کی صدا آئی ع کش دست از دامنِ روزگار۔ اقتثال امر غیب پر مجبور ہوئے۔ ارادۂ مصمم فسخ کرنا پڑا۔ سچ ہے۔ عرفت ربی بفسخ

اس فن مبارک میں تبحر عظیم حاصل کر لیا۔ اپنے اوقات عزیز کی بڑی نگہبانی کرتے اور برابر نشر علوم و فضائل میں مصروف رہتے۔ حرمین پاک کے خاص و عام اور مصر و روم و شام کے لوگ ان سے اعتقاد و اخلاص رکھتے اور فیوض و برکات حاصل کرتے تھے۔

چہارشنبہ ۶ صفر ۱۱۶۳ھ (۱۴ جنوری ۱۷۵۰ء) کو رحلت فرمائی۔ بقعۂ مبارک بقیع میں وقوع ہوئے۔

۱۲۸ ۱۱۵۶ھ (۱۷۴۳ء) میں رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ جنت المعلیٰ میں جگہ پائی۔

العزائم۔ اس زمانہ میں ان کو بارہا شہر حیدر آباد اور دکن کے مختلف مقامات کو کبھی از خود اور کبھی نواب نظام الدولہ کی معیت میں جانا پڑا۔ آزاد نے اپنی عمر کا بڑا حصہ (اڑتالیس سال) دکن میں گزارا۔ شفیق ماموں اور اُستاد (میر سید محمد) کے مرنے، نوجوان اکلوتے بیٹے (میر نور الحسن) کے غرق

---

۱۲۸ باباشاہ مسافر خلیفہ ارشد باباشاہ سعید پلنگ پوش کے تھے۔ شاہ مسافر کا اصلی نام حافظ محمد عاشور اور مولد و منشاء غجدوان تھا۔ مسافر ان کو پیر طریقت کا دیا ہوا خطاب تھا۔ باباسعید ہندوستان چلے آئے تھے۔ اور نواب غازی الدین خاں فیروز جنگ پدر نواب آصف جاہ کے لشکر کی نگہبانی و حراست پر مامور تھے، ہمیشہ ہمراہ رہتے۔ حافظ محمد عاشور نے اوائل میں میر عطاء اللہ ساکتری کی خدمت میں حاضر رہ کر کبرویہ طریق پر ریاضتیں کیں۔ میر عطاء اللہ نے رخصت کیا تو سیاحت کی ہدایت کی۔ بیہ غجدوان چلے آئے۔ بارہ سال قیام فرمایا۔ وہاں سے کابل آئے اور باباشاہ سعید کے مرید ہوئے۔ سات سال بعد اجازت لیکر حرمین شریفین گئے۔ سعادت حج حاصل کر کے ابتدائے عہد خلد مکاں میں ہندوستان آگئے۔ اورنگ آباد میں جس جگہ کہ اس وقت مرقد مبارک کا تکیہ ہے اقامت گزیں ہو گئے۔ بنفس واپسیں تک وہاں سے نہیں اُوٹھے۔ تشنگان ارادت و عرفان اس چشمہ ربانیت و رحمت سے خوب سیراب ہوتے رہے۔ ۲۰۔ رجب ۱۱۲۶ھ (۷۔ جولائی ۱۷۱۴ء) کو اس عالم سفلی کو چھوڑا اور اپنے پیر کے پہلو میں جانب قبلہ آسائش فرمائی۔

آزاد نے ان کو دیکھا نہ تھا لیکن بڑے اخلاص و عقیدت سے یاد کرتے ہیں ؎

قطب زماں صاحب شانِ عظیم — شاہ مسافر بہ درِ حق مقیم
خسروِ بے تاج و نگین و علم — تاج دہِ قیصر و خاقان و جم
رشتہ بہ اسرار حقیقت دواند — دامنِ ہمت بہ دو عالم فشاند
خور شکنی ہا اثر ذکر او — روشنیِ دل اثر فکر او
پادشہ سلسلہ نقشبند — یک نظر او دو جہاں را پسند

۱۲۹ یہ خانقاہ ایک بڑے وسیع باغ میں محمود دروازہ کے پاس واقع ہے۔ اور اب درگاہ شاہ مسافر کے نام سے زیادہ شہرت رکھتی ہے۔ اورنگ آباد میں یہ روضہ نہایت دلفریب، پر فضا اور فرح بخش مقام سمجھا جاتا ہے۔ اورنگ زیب اور اُس کے اعیان سلطنت کو ان بزرگ سے کمال اعتقاد تھا۔ شاہ صاحب کے پیر و مرشد کے لئے ۱۰۹۰ھ (۱۶۷۹ء) میں امرائے دولت اور اہل ارادت نے اس خوشنما اور شاندار تکیہ کو تعمیر کرایا تھا۔ اس کے متعلق مدرسہ، مسجد، دیوان خانہ اور ایوان سرا وغیرہ دیگر ضروری عمارات متعدد بنیاد کرائی تھیں۔ آصفجاہ

ہونے۔ خالہ زاد اور عزیز تر از جاں بھائی (محمد یوسف) کی وفات اور پیارے سے پیارے رشتہ داروں کی مفارقت دائمی اختیار کرنے کی خبریں آتی رہیں۔ مگر یہ دکن میں کچھ ایسے پاؤں توڑ کر بیٹھے تھے کہ اُٹھنا اور ہٹنا گوارا نہ کیا۔ حبِ وطن کا جاذبہ خاکِ دکن کی پا بوسیوں پر غالب نہ آسکا۔ شفقت بزرگانہ

اول ہمبر درسکے عہد بابرکت میں درگاہ نے اور بھی وُسعت اور رونق پائی درگاہ کے احاطہ کے اندر کئی پختہ حوض ہیں اور فوارے لگے ہیں۔ باہر ایک نہایت لمبا چوڑا حوض ہے جس کے لئے نہر سے پانی آتا ہے اور بڑی بلندی سے حوض کے اندر گرتا ہے۔ کسی وقت اس آبشار کے قریب ایک پن چکی بھی قائم تھی، جس کے اب صرف آثار و نشان باقی رہ گئے ہیں۔ درگاہ کی مسجد میں ایک درّہ رکھا ہوا ہے جس کی نسبت روایت یہ ہے کہ شاہ دیں پناہ (عالمگیر) خلاف شرع کام کرنیوالوں کو اس سے تعزیر دیتا تھا۔

نمبر ۱۳ شہر حیدر آباد۔ عُرفاً ریاست حیدر آباد دکن کا دارالصدر حقیقتاً ایالت نظام خلد اللہ سلطنتہ
سنہ ۱۹۲۱ء کا دارالملک موسیٰ ندی کے داہنے ساحل پر واقع ہے۔ اس کی آبادی مع اس کے جملہ مضافات کے میں چار لاکھ چار ہزار ایک سو ستاسی ۴۰۴۱۸۷ تھی۔ بلحاظ کثرت آبادی و زینت و رونق یہ شہر ہندوستان میں چوتھا مگر باعتبار تمدن و تہذیب پہلا سمجھا جاتا ہے۔

اس شہر کی بنیاد ۹۹۷ھ (۱۵۸۹ء) میں محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قطب شاہ (پانچویں قطب شاہی بادشاہ) نے ڈالی تھی۔ وہ اُس وقت گولکنڈہ کا فرمانروا تھا۔ جو حیدر آباد سے پانچ میل پچھم پر ہے۔ بانی نے اس کا نام بھاگ نگر رکھا تھا پھر حیدر آباد بدل دیا۔ ۱۰۷۶ھ (۱۶۶۵ء) میں جب شہنشاہ اورنگزیب محمد قلی اور اُس کے شکستہ خاطر و دل برداشتہ وزیر میر جملہ کے مابین تصفیہ کرانے آیا ہے اُس وقت تک شہر کی حالت رو بہ ترقی اور رونق روز افزوں تھی۔ ۱۰۹۸ھ (۱۶۸۷ء) میں شہنشاہ عالمگیر کا حملہ گولکنڈہ پر ہوا تو حیدر آباد مغلوں کے قبضہ میں آگیا اور اُن کے قبضے میں اُس وقت تک رہا کہ نظام اول نے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا اور اس کو اپنا دارالصدر قرار دیا۔

شہر کے گرد سنگین دیوار ہے، جس میں بُرج بنے ہیں۔ تیرہ پھاٹک اور بارہ کھڑکیاں ہیں۔ یہ شہر بشکل متوازی الاضلاع تعمیر ہوئی ہے۔ دَور چھ میل اور رقبہ سوا دو میل مربع ہوگا۔ اس کی تعمیر کا آغاز مغلوں کے اخیر صوبہ دار مبارز خاں نے کیا تھا۔ نظام اول نے اس کی تکمیل فرمائی۔ شمال و مشرق میں شہر اپنے اصلی حدود سے بہت بڑھ گیا ہے۔ موسیٰ ندی پر چار پل بنے ہیں۔ "پُرانا پل" بالکل پچھم کو ہے اولی فنیٹ برج Oliphant Bridge مشرق انتہا میں ہے۔ ان دونوں کے مابین دو پل (۱) افضل پل اور

محمد Mohammad

اور حقوق اعزہ کا اقتضا اسی قدر تھا کہ اپنے بھتیجے (غلام امام صادق کے بیٹے) میر اولاد محمد وغیرہ کا اور
اپنے پوتے میر امیر حیدر[۱۳۲] کو اپنے پاس دکن میں بلالیا اور بعد میں ان کی تربیت و پرداخت عالمانہ
اور امیرانہ طریقہ پر کی۔ اپنی صحبت گرامی کے فیض اور علوم عالیہ سے بہرہ وافر دے کر وطن کو رخصت کر دیا

(۲) چہار دروازہ پل، واقع ہیں۔

عہد قطب شاہی کی سب سے خوبصورت اور شاندار عمارات میں سے ایک چار مینار ہے۔ اسکی تعمیر ۹۹۹ھ (۱۵۹۱ء) میں ہوئی تھی۔ یہ شہر کے وسط یا مرکز میں واقع ہے۔ اس کے اندر سے چار سڑکیں نکل گئی ہیں۔ منارے ایک سو اسی فٹ بلند ہیں۔ ان میں سے ایک مینار پر مغلوں کے قبضہ کے زمانے میں بجلی گری تھی۔ اسکی از سر نو تعمیر میں ساٹھ ہزار روپیہ صرف ہوا۔ فرانسیسی جنرل مانشور بسی M. Bussy اور اس کی افواج ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۶ء) میں چار مینار پر قابض رہیں۔ سر سالار جنگ نے اپنی وفات سے کچھ روز پہلے اس عمارت کی تمام و کمال درستی و تجدید و تزئین کرادی تھی۔ چار مینار کے قریب چار کمان واقع ہے جس کی تعمیر سنہ ۱۰۰۱ھ (۱۵۹۲ء) میں ہوئی تھی چار شوارع پر جو شہر کے چار حصوں یعنی اصحاب اربعہ کو جاتے ہیں بنائی گئی ہیں۔ چار سو کا حوض چار مینار کے شمال میں ہے۔ بادشاہ نے اس حوض کے پاس ایک کوشک تعمیر کرایا تھا۔ جہاں سے اپنی فوج کی قواعد و کربندی دیکھا کرتا تھا۔ دار الشفاء (اسپتال) پرانی حویلی کے بالکل شمال میں تھوڑے فصل سے واقع ہے۔ اسکو سلطان قلی قطب شاہ نے بنوایا تھا۔ یہ ایک بڑی عمارت ہے جس کا صحن پختہ اور چوگوشہ ہے۔ مریضوں کے قیام و آرام کے لئے ہر طرف کمرے بنے ہیں۔ دروازے کے سامنے ایک نفیس مسجد اسی زمانہ کی تعمیر شدہ ہے۔ ایک بڑی عمارت سر سالار جنگ کے محل کے کچھ جانب عاشور خانہ نام، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے سنہ ۱۰۰۲ھ (۱۵۹۳ء) میں تعمیر کرائی تھی۔ محرم وغیرہ میں اب بھی یہاں عزاداری اور ماتم گساری ہوتی ہے۔ پرانا پل شہر کو اس کاروان سڑک سے ملا دیتا ہے جو گولکنڈہ جاتی ہے۔ اس میں تئیس محرابیں ہیں۔ چھ سو فٹ لمبا تینتیس ۳۳ فٹ چوڑا اور چون ۵۴ فٹ قریب دریا سے بلند ہوگا۔ یہ سنہ ۱۰۰۱ھ (سنہ ۱۵۹۳ء) میں تعمیر ہوا تھا۔ دریا یہاں سے بہت تنگ ہے اور اس کے کنارے سے ڈھالو ہیں۔ قصر گوشہ محل کی تعمیر ابو الحسن تانا شاہ آخر قطب شاہی بادشاہ نے کی تھی۔ یہ شہر سے ایک میل شمال پر ہے۔ اسمیں ایک بڑا حوض ہے اور بیگمات کے لئے نزہت گاہیں ہیں۔ مکہ مسجد چار مینار کے جنوب مغرب میں ہے جو سوا دو سو فٹ لمبی، ایک سو اسی فٹ چوڑی اور پچھتر فٹ بلند ہوگی یہ تمام و کمال پتھر کی عمارت ہے۔ اس کا پختہ چوکور فرش تین سو ساٹھ فٹ مربع ہے۔ اس کی سقف پندرہ محرابوں پر قائم ہے جس کے دو بڑے بڑے برج بنے ہوئے ہیں۔ یہ چھت سے سو فٹ بلند ہوں گے۔ اسمیں دس ہزار نمازیوں کی گنجائش ہے۔ محمد قطب شاہ (محمد قلی کے بھتیجے اور جانشین نے) اس کی تعمیر شروع کی تھی۔ اس کے انتقال کے بعد

یہ لوگ یہاں آکر چھوٹے پھلے مگر آزاد کو اپنی طرف کھینچنے میں ناکام رہے۔ آزاد نے چھیاسی برس کی عمر میں سنہ ۱۲۰۰ھ (۱۷۸۶ء) میں انتقال فرمایا۔ اور روضۂ شریفہ خلد آباد میں سپرد زمین ہوئے انکی قبر پختہ شہر پناہ کی جانب جنوب حضرت میر حسن العلائی سنجری کے احاطہ کے ایک گوشہ

ابوالحسن نے تعمیر جاری رکھی مگر تکمیل اورنگ زیب کے ہاتھوں سے ہوئی۔ اسی مسجد کی جنت نشان اراضی میں نظام علی خاں مبرور اور اُن کے سب جانشین استراحت گزین ہیں۔ یہاں مسجد چار مینار کے قریب ہے جو سنہ ۱۰۰۰ھ (سنہ ۱۵۹۱ء) میں تعمیر ہوئی تھی۔ مکہ مسجد اور گوشہ محل کو چھوڑ کر یہ سب باقی عمارتیں سلطان محمد قلی قطب شاہ کی تعمیر کرائی ہوئی ہیں جس نے سوا تین کروڑ روپیہ (تین ملین اسٹرلنگ) رفاہ عام کی عمارات اور آبپاشی کے کاموں پر صرف کیا تھا۔ اُن کے مقربین اور امرا نے بھی تقلید و تبعیت کی اور کارہائے نیک پر بیدریغ روپیہ صرف کیا۔ ایک بڑا وسیع گورستان ہے جو میر مومن کا دائرہ کہلاتا ہے۔ میر مومن نے جو بعہد عبد اللہ قطب شاہ کربلائے معلے سے حیدرآباد آیا تھا اس کام کے لئے وقف کیا تھا۔ سر سالار جنگ کے خاندان کا قبرستان دائرہ مذکور کے جنوب ہے۔

بعد کی تعمیرات میں پرانی حویلی ہے۔ یہ ایک وسیع عمارت شہر کے شمال و مشرقی حصہ میں واقع ہے۔ اسکو نظام اول مبرور نے تعمیر کرایا تھا۔ ایوان چو محلہ میں تین چوگوشہ محلات ہیں۔ اسکے ہر طرف نہایت خوشنما عمارات ہیں۔ وسط میں ایک بڑا حوض ہے۔ یہ محل نہایت پرتکلف اور سلیقہ سے آراستہ ہے۔ بیگمات عصمت سمات کی شاہانہ محلسرائیں تیسرے چوگوشہ سے اُس طرف ہیں۔

شاہی محلات و قصور گولکنڈہ، سرور نگر، مولا علی، آصف نگر، بیگم پیٹ اور ملک پیٹ میں بھی ہیں۔ سالار جنگ کا محل، افضل دروازہ کے قریب ہے۔ اس میں دو قطعے باغ ہیں۔ ایک جس میں بارہ دری اور تکرہ کورٹ و محل جیتے ہیں، ہے، موسیٰ ندی کے عین سامنے ساحل پر ہے اور دوسرا پرانی حویلی کو جانے والی سڑک کے اُس طرف۔ دونوں نہایت وسیع عمارتیں ہیں جو بہت سی اراضی پر پھیلی ہوئی ہیں۔ شمس الامرا کی بارہ دری شہر کے مغرب میں واقع ہے۔ اس کو ایک وسیع قطعہ زمین پر شمس الامرا اول نے تعمیر کیا تھا۔ فلک نما، ایک نہایت نفیس محل ہے۔ اس کو شہر کے مضافات جنوبی میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پینتیس لاکھ روپیہ کے صرف سے سر وقار الامرا مرحوم نے بنوایا تھا۔ اس قدر رفیع ہے شہر اور اس کے اطراف کا نظارہ نہایت دلکش اور نظر فریب ہوتا ہے۔ حیدرآباد میں کوئی عمارت خواہ بلحاظ حسن تعمیر خواہ باعتبار خوبی تجویز نقشہ اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔ جنت آشیان نظام سادس نے سنہ ۱۸۹۷ء میں بذریعہ خریداری اسکو ملوکات شاہی میں شامل و داخل فرمالیا تھا۔ چہاں نما محل، اور اس کے خوشنما باغات جو سر آسمان جاہ مبرور کے ملوک ہیں، فلک نما

ہیں خلیرہ (کٹھرہ) کے اندر واقع ہے۔ اہلِ وقوف سے اُس کا پتہ زائرین اور مستفیدین کو کسی قدر دشواری سے چلتا ہے۔ افسوس ہے کہ کسی حوصلہ مند نے اُس پر کتبہ نہ لگا دیا تاکہ کسی سے پوچھنے اور دریافت کرنیکی ضرورت باقی نہ رہتی۔

بارھویں صدی کے لئے ہندوستان میں آزاد کی ذات ایک نعمت بے مثال تھی۔ وہ مجسمہ ذہانت و قابلیت تھے۔ اپنی لازوال یادگاریں عربی و فارسی تصانیف کا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے۔ شعرائے ہند و ایران کے تین مبسوط تذکرے (۱) ید بیضا (۲) سروِ آزاد (۳) خزانۂ عامرہ۔ اور

کے شمال میں ہیں۔ محل اور اُس کے بنگلوں میں جو باغات کے اندر بنے ہوئے ہیں، ایک بڑی تعداد باسلیقہ و ہنرمندانہ کلوں اور پرزوں کے کھلونوں کی موجود ہے۔

اطرافِ بلدہ، دو طور پر منقسم ہیں۔ ایک جو موسیٰ ندی کے اُس پار ہیں۔ دوسرے وہ جو شہر کے ملحق ہیں۔ اول الذکر میں بیگم بازار، کاروان، افضل گنج، مشیر آباد، خیرات آباد، سیف آباد اور چادر گھاٹ داخل ہیں جو پورب سے پچھم کو تین میل تک چلے گئے ہیں۔ اوسط عرض، شمال سے جنوب تک ڈیڑھ میل ہوگا اور رقبہ پانچ میل سے اوپر۔

رزیڈنسی بازار۔ ان بستیوں کے جنوب و شرق، اور شہر کے شمال و شرق میں واقع ہیں۔ باقی حصص ان مضافات کے جو شہر کے جنوب اور شرق میں ہیں۔ یاقوت پورہ، ملک پیٹ، اور جہاں نما کہلاتے ہیں اور چار میل مربع رقبہ گھیرے ہوئے ہیں۔

رزیڈنسی۔ موسیٰ ندی کے ساحل چپ پر، شہر کے شمال و مشرق کے گوشہ کے مقابل واقع ہے۔ یہ شاندار عمارت ہے۔ ایک خوشنما رمنہ کی شکل کے قطعہ کے اندر واقع ہے۔ اس کے باغ نہایت خوبصورت آراستہ اور اچھی حالت میں ہیں۔ اسکی تعمیر سنہ ۱۸۰۰ء سے شروع ہوکر ۱۸۰۵ء میں ختم ہوئی تھی۔ اس کے اندر اور باہر بھی افسروں کے لئے کوٹھیاں بنی ہیں۔ انگریزوں کا قبرستان بھی ہے۔

حسین ساگر پانی کی ایک بڑی چادر ہے۔ جب خوب بھری ہوتی ہے تو آٹھ میل مربع سے زائد رقبہ پر پھیل جاتی ہے۔ اس سے رزیڈنسی اور مضافات شمال دریائے موسیٰ کو پانی پہونچتا ہے۔ پشتہ یا بند (باندھ) ڈھائی ہزار گز لمبا ہے۔ اسی پر وہ سڑک رواں ہے۔ جو مضافات شمالی کو سکندرآباد سے ملاتی ہے۔ اسکو سلطان ابراہیم قطب شاہ نے قریب ۹۸۲ھ (۱۵۷۵ء) کے ڈھائی لاکھ کے خرچہ سے بنوایا تھا۔

پانی کی ایک اور عظیم چادر میر عالم نام آٹھ میل کے دور میں ہوگی۔ یہ شہر کے جنوب غرب میں ہے۔ اس کا طول

بلگرام کے علماء و مشائخ کی ایک اچھی تاریخ مآثر الکرام فارسی میں لکھی ہے۔ ہندوستان کی ایک دلچسپ مختصر تاریخ عربی میں سبحۃ المرجان نام تحریر کی ہے۔ جس میں اس ملک کے خصائص و فضائل و شرائف کے بیان کے علاوہ فضلاء و فقراء کا ایک پسند تذکرہ لکھا ہے۔

ہندوستان کے مخصوص فنون، موسیقی اور شاہد پرستی یعنی نایکہ بھید پر ایک نہایت مدلل مقدمہ اور مفصل تبصرہ قلمبند کیا ہے۔ اس میں کچھ حصہ اپنی دوسری عربی تالیف شمامۃ العنبر فی ما ورد فی الھند من سید البشر سے نقل فرمایا ہے۔ عربی میں سات دیوان سبعۂ سیارۃ

۲۰۱۱ گز ہوگا۔ اسکی تعمیر فرانسیسی انجنیروں نے کی تھی جو نظام کی ملازمت میں تھے۔ سرنگاپٹم کے فتح ہو جانے سے جو زر غنیمت میر عالم وزیر کے حصہ میں آیا تھا اُس سے اُس نے اس تالاب اور بارہ دری اور دیگر عمارات کو تیار کرایا۔ صرف اسی باندھ میں آٹھ لاکھ لگا ہوگا۔ ان دونوں تالابوں سے شہر اور مضافات کو خوب پانی پہونچتا ہے۔ واٹر ورکس بھی یہاں قائم ہے اور نفع عام پہونچا رہا ہے۔ باغ عامہ نہایت خوبصورت آراستہ و پیراستہ نوبت پہاڑ کے دامن سے ملحق واقع ہے۔ وسط میں دو بڑے بڑے تالاب ہیں خوشنما دیوار چار طرف محیط ہے۔

ایک تالاب گندی پیٹھ خاصکر قابل ذکر ہے جو گولکنڈہ سے دو میل جانب شمال واقع ہے۔ سنہ ۱۹۰۸ء کے طوفان موسیٰ ندی کے بعد حکومت کے اہل حل و عقد کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس دریا کو کہیں روک کر اسکا زور و تلاطم کم کر دیا جائے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء میں ایک قابل ہندوستانی انجنیر کی تجویز سے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر جانب شمال اسکو ایک مضبوط بند سے روک دیا گیا۔ ایک تند و پر زور طوفان خیز دریا کو جس سے تین سو مربع میل زمین زیر آب ہوتی ہو سوا سو فٹ بلند دیوار سے روک دینا دُنیا کے محیر العقول انسانی کارناموں میں داخل ہے۔ اس سے دو غرضیں پوری ہوتی ہیں ایک تو پورے شہر حیدرآباد اور سکندرآباد کو صاف و شیریں پانی نلوں کے ذریعہ سے بہم پہونچتا ہے۔ دوسرے رود موسیٰ کے آئندہ طوفان خیز اور باعث ہلاکت ہو جانے کے مواقع بہت گھٹ گئے ہیں۔ اب موسیٰ میں صرف اتنا ہی پانی آتا ہے جتنا کہ گندی پیٹھ کی چادر سے زائد سمجھکر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ وسعت و عظمت میں گندی پیٹھ حسین ساگر سے چہار چند ہے۔ بعض انجنیروں کا خیال ہے کہ کسی وقت آفت سماوی یا زلزلہ وغیرہ کے صدمہ سے (خدا نہ کرے) اگر یہ ایک سو پچیس فیٹ بلند بند ٹوٹ گیا تو گندی پیٹھ کا پانی شہر حیدرآباد میں بھر کر چار مینار کی بلندی سے بھی اونچا جائے گا:

سررشتۂ آرائش بلدہ نے لاکھوں روپیہ کے مصارف اُٹھا کر دو تین سال سے نیا دارالشفاء و ضلع بسط

نام سے لکھے حرمین شریفین و فارس و مصر میں انکی زندگی میں ان کے کلام نے بڑی شہرت و قبولیت پائی۔ سادات کے فضائل میں ایک جداگانہ کتاب ۱۱۷۲ھ تسند السادات فی حسن خاتمۃ السادات تحریر کی ہے۔ روضۂ شریفۂ خلد آباد کے آسودگان خاک و بزرگان کرام کا ایک تذکرہ روضۃ الاولیا ۱۱۶۱ھ کے نام سے لکھا ہے۔ تسلیۃ الفؤاد ان کے تمام قصائد کا مجموعہ ہے۔ حدیث پاک سے توغل تھا۔ صحیح بخاری اکثر زیر مطالعہ و زیر عمل رہتی تھی۔ اس کی ایک شرح

شہر کی گنجان آبادی کے ہزارہا ناموزوں اور بدترتیب مکانات منہدم کرا دیے ہیں۔ اب ان کے بجائے حفظان صحت اور رونق شہر کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک خوش آیند و آرام دہ وضع کے مناسب مکانات اور سڑکیں اور پارک وغیرہ بنائے جا رہے ہیں۔ امید ہے کہ تین چار سال کے اندر آرایش بلدہ کا یہ کام تکمیل پا جائیگا۔

۱۳۱ سنہ ۱۱۶۹ھ (۱۷۵۵ء-۱۷۵۶ء) میں نور الحسن ایک تالاب میں غسل کرتے وقت عین شباب میں غرق ہوگئے تھے۔ آزاد نے ان کا نہایت دردانگیز مرثیہ لکھا ہے ؎

قیامت بر سر این بوستان رفت   کہ یک گل داشت آں ہم نوجواں رفت

۱۳۲ امیر حیدر کے باپ میر نور الحسن جب غرق ہوئے ہیں تو امیر حیدر تین سال کے تھے۔ سنہ ۱۱۶۵ھ (۱۷۵۱-۵۲ء) کی پیدائش تھی۔ اولاً تحصیل علوم بلگرام میں کی۔ اپنے دادا کے ماموں میر سید محمد شاعر سے اکتساب فضائل کیا۔ پھر اپنے جد امجد کے پاس اورنگ آباد چلے آئے۔ اور وہیں تکمیل و تربیت ہوئی۔ آزاد کی رحلت پر بلگرام واپس آگئے۔ اور بود و باش اختیار کی۔ کلکتہ پریسیڈنسی میں عدالت کل (سپریم کورٹ) کے عہدۂ افتا پر مامور تھے۔ بنگالہ سے وطن آرہے تھے کہ مرشدآباد پہنچکر ہاتھ میں ایک پھنسی (دانہ) نکلا جو اس جہان فانی سے انتقال کا سبب ظاہری ہوا۔ "وائے دریغا امیر حیدر رفت" سنہ ۱۲۱۷ھ (۱۸۰۲ء) تاریخ وفات ہے۔ جب مفتی امیر حیدر بلگرام میں تھے تو آزاد نے کئی خط ان کے نام عربی میں لکھے تھے جو آزاد کے دیوان میں موجود ہیں۔ مفتی صاحب کے ایک رسالہ "بیان مالیہ ہائے سرکار و تقابض اراضی حسب شرع محمدی" کا ترجمہ انگریزی اورنیٹل مسلینی Oriental Miscellany مطبوعہ کلکتہ سنہ ۱۷۹۹ء (سنہ ۱۲۱۳ھ) میں میری نظر سے گذرا ہے۔ نہایت قابلیت و تحقیق کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ عہد اکبر بادشاہ کی ایک نہایت مستند و مکمل تاریخ سوانح اکبری کے نام سے لکھی ہے جس کی مورخین و محققین فرنگ بیحد ستایش و تحسین کرتے ہیں۔

۱۳۳ تاریخ فرخ آباد مولفہ مفتی محمد ولی اللہ اور اتحاف النبلا مصنفہ نواب سید محمد صدیق حسن خاں اور تذکرہ خازن الشعرا مصنفہ شاہ محمد فاخر افضلی اور مسٹر بیل کی اورینٹل بیاگرافیکل ڈکشنری

اول کتاب سے لے کر آخر کتاب الزکوٰۃ تک ضوء الدراری[۱۴۲] تحریر فرمائی۔ حضرت شیخ مجدد سرہندی کے مکاتیب میں سے بعض کا عربی میں ترجمہ کیا تھا۔

ان کے کلام کا بڑا حصہ مدائح و مناقب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں واقع ہوا ہے اس لئے یہ حسان الہند[۱۴۳] کے لقب سے مشرف تھے۔

آزاد ہندی یا ہندوستانی (ریختہ یا اردو) میں شعر نہیں کہتے تھے وہ اسکو اپنے مرتبہ عالی

Oriental Biographical Dictionary اور اکثر مستند تذکروں اور تاریخوں میں آزاد کا سال وفات سنہ ۱۲۰۰ھ (۸۶-۱۷۸۵ء) لکھا ہے۔ قطعہ تاریخ یہ ہے۔ امام اہل سخن فخر اتقیا آزاد کہ بود مسند والا نژاد نیک نہاد چو رخت بست ز دنیا بہ عالم عقبیٰ بیا بہ روضۂ قدسی فلک ندا در داد لیکن سہو کتابت یا عدم تحقیق سے ضلع ہردوئی کے گزیٹر مطبوعہ سنہ ۱۹۰۴ء میں صفحہ ۱۶۸ پر سن رحلت ۱۲۰۲ھ (۸۸-۱۷۸۷ء) تحریر ہے۔ میر شیر علی افسوس نے بھی آرایش محفل میں سنہ ۱۲۰۲ھ لکھا ہے۔

۱۳۴ید بیضا۔ غیر مطبوع ہے۔

۱۳۵سرو آزاد۔ مطبوعہ رفاہ عام اسٹیم پریس لاہور سنہ ۱۹۱۳ء

۱۳۶خزانۂ عامرہ مطبوعہ نول کشور پریس لکھنؤ سنہ ۱۸۷۱ء

۱۳۷ماٰثر الکرام مطبوعہ مفید عام پریس۔ آگرہ۔ سنہ ۱۹۱۰ء

۱۳۸سبحۃ المرجان۔ مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۳۰۳ھ۔ جس کے ابتدائی اجزاء کا اردو ترجمہ موسوم بہ مظہر آزاد نولکشور پریس لکھنؤ میں سنہ ۱۸۷۶ء میں چھپا تھا۔

۱۳۹السبعۃ السیارۃ کا انتخاب "مختار دیوان آزاد" کے نام سے مطبع آسی لکھنؤ سے سنہ ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا

۱۴۰سند السعادات طبع ہو گئی ہے اور میرزا محمد شیرازی تاجر کتب بمبئی کے یہاں ملتی ہے۔

۱۴۱روضۃ الاولیا۔ مطبوعہ اورنگ آباد دکن۔

۱۴۲ضوء الدراری۔ شیخ شہاب الدین کی ارشاد الساری سے بزیادت بعض فوائد ملخص ہے۔

۱۴۳حضرت حسان بن ثابتؓ کی کنیت ابو الولید تھی۔ آپ انصاری خزرجی اور رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے شاعر خاص تھے۔ آپ کا شمار فحول شعرا میں ہوتا ہے۔ ابو عبیدہؓ فرماتے ہیں کہ اس امر پر عرب کا اجماع ہے کہ حسان بن ثابت سب سے بڑے شاعر اہل مدر (دیہات و صحرا والوں) میں سے تھے۔ آپ کی شان جلالت و مرتبہ یہ ہے کہ حضرات عمر و ابو ہریرہ و عائشہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے روایت کی ہے۔ سنہ ۴۰ھ (سنہ ۶۶۰ء) سے قبل زمانۂ خلافت حضرت علی

سے پست و دُون سمجھتے تھے سا تھ تذکروں اور احوال میں وہ اپنی ہندی شاعری سے انکار بحت کرتے ہیں۔ جو غزل ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے اس کی روایت بے اصل اور غیر مستند ہے ان کو قائم چاند پوری کا شاگرد بتانا محض بہتان وا تہام ہے، اور ان کے خاندان کی خصوصیات محفوظ روایات کے بالکل منافی۔ بازاروں میں ایک چند ورقہ رسالہ "گربہ نامہ" نام ملتا ہے۔ اس میں چوہے بلی کا قصہ عوام یا نوعمروں کی تفریح خاطر کے لئے اردو میں قلمبند کر دیا ہے۔ پرانی زبان ہے جا بجا آیات قرآنی و احادیث بھی موجود ہیں۔ سادات و شیوخ بلگرام کا نسب نامہ "شجرہ طیبہ" کے نام سے نہایت احتیاط و تحقیق کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ ان کتابوں کے سوا آزاد کا دیوان فارسی، اور کشکول اشعار منتخبہ اور چند منظومات اور رسائل بھی انکی یادگار ہیں۔

مآثر الامرا کی ترتیب جدید اور اس کی تہذیب و تکمیل، آزاد کی حیات علمی کا ایک بڑا کارنامہ ہے اور انکی بقائے شہرت کی ضامن۔

آزاد کی پرورش اور تربیت، تعلیم و تعلم، رفاہیت اور امیرانہ گزران کے متعلق میر عبدالجلیل کے بہت سے حقوق آزاد پر تھے۔ اصل یہ ہے کہ میر عبدالجلیل نے ہی میر غلام علی کو "آزاد" و "حسان الہند" بنایا تھا۔ یہ شہرہ و فضل انہیں کے فیوض و برکات سے حاصل ہوا تھا۔ آزاد نے بھی ہر ممکن اسلوب سے ان حقوق کو ادا کیا اور ہر موقع پر ان کو یاد رکھا ہے۔ عبادات مالی و جانی ادا کی ہیں اور ید بیضا تو خاصکر میر عبدالجلیل کے تذکرہ و یادگار میں لکھا ہے۔ اس کے بیان کی تمہید میں معذرت کرتے اور فرماتے ہیں کہ:-

---

رضی اللہ عنہ و کرم اللہ وجہہ میں وفات پائی اور بعض لکھتے ہیں کہ ۵۴ھ میں سن مبارک ایک سو بیس سال کا تھا۔ ساٹھ سال جاہلیت میں گزارے تھے اور ساٹھ زمانہ اسلام میں۔

جو شعرا رسول اللہ صلعم کی ہجو کرتے تھے انکا جواب حسان دیا کرتے تھے۔

خاقانی شروانی بھی آنحضرت صلعم کی مدح و نعت اکثر کیا کرتا تھا۔ وہ حسان عجم کہلاتا تھا۔

"بر مطالعہ کنندگان ایں سطور مخفی و مستور نماند کہ علت غائی تسوید این کتاب ذکر آنجناب تقدس مآب است۔ پس اگر عندلیب ناطقہ زمزمہ بلند کشد داز دراز نفسی بیندیشد کلیم وار معذور لذت گفتار است؎

اعد ذکر نعمان لنا ان ذکرہ　　　هو المسك ما کررته یتضوع "

تسلیۃ الفواد میں آزاد نے اپنے بہت سے قصائد اور مختلف مضامین وحالات جمع کئے تھے۔ ان میں سے کچھ سبحۃ المرجان میں بھی نقل کر دیئے ہیں۔ میر عبد الجلیل کے تذکرہ اور قصائد واشعار مدحیہ نے اُس میں بھی حصہ غالب پایا ہے۔ ایک زبردست قصیدہ سینتیس ۳۷ شعر کا لکھا تھا جس نے اُدبائے عرب سے بھی خراج تحسین وصول کیا۔ قصیدہ کا مطلع یہ ہے؎

ادرك علیلا لقاء منك یکفیه　　　وطرفك الناعس الممراض یشفیه

ایک دوسرے محل پر میر غلام علی آزاد اپنے نانا کی مدح میں فرماتے ہیں؎

ان فاض امواه العراق فاننی　　　اسعی علی راسی الی البحرین

اعنی یدی سلطان مملکة الندی　　　ینصب عن هاتین ماء لجین

آزاد کا مفصل تذکرہ قلمبند کر چکا ہوں، اقدرسے تحقیق مزید اور نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ بارگاہ تعالیٰ شانہ میں دست بدعا ہوں کہ اس عاجز ناکارہ کی محنت ٹھکانے لگے۔ اور وہ اوراق مطبوع ہو کر اہل علم کے حضور میں بار یاب ہوں۔ آزاد کے کلام اور تصنیفات کو بہت سے قدر شناسوں نے اپنی توجہ اور عنایت اشاعت سے زندہ کر رکھا ہے۔ ممکن ہے کہ خود آزاد کے احیاء و ابقا کا شرف تقدیر الٰہیہ نے فقیر ہیچمدان کے لئے ودیعت فرمایا ہو؎

زخیل دُرد کشاں غیر ما نہ ماند کسے
بیار بادہ کہ ماہم غنیمتیم بسے

ردّ و قبول

شیخ وجیہ الدین اشرف، صاحب بحر زخار، موج احوال شمار ۰۰، میں تحریر کرتے ہیں کہ میر سید عبد الجلیل متخلص بہ واسطی، خواص اتقیا اور اجلّۂ علماء سے تھے۔ تزکیۂ قلب، تصفیۂ باطن تقدس ذات اور جلائل صفات میں یگانۂ زمانہ تھے۔ راقم اوراق زخار کو آپ کے حالات کے لکھنے میں توقف و تامّل تھا۔ آپ کی ثروت ظاہری اور رفاقت و مصاحبت سلاطین پیش نظر اور وجہ تردد تھی۔ لیکن میں (شیخ اشرف) نے ایک شب حضرت سید غلام علی آزاد کو معاً (خواب) میں دیکھا کہ اپنی تصنیف مآثر الکرام کا نسخہ میرے سامنے رکھتے اور اپنے حالات کے متعلق اوراق دکھا کر فرما رہے ہیں کہ ان تین شخصوں کا حال ضرور لکھئے گا اور اس کے لئے اصرار فرمایا۔ صبح کو میں بیدار ہوا، کتاب کھول کر وہ جگہ نکالی۔ تحریر یہ تھا کہ بندۂ آزاد نے علامی میر سید عبد الجلیل اور ان کے خلف الصدق میر سید محمد و نیز سید طفیل محمد سے تحصیل علوم کی ہے۔ اس لئے میں (صاحب تذکرۂ زخار) نے ان تینوں حضرات کا حال لکھ کر اپنی کتاب میں داخل کر دیا۔ خود میر صاحب کو درویشوں کی صف میں جگہ دی، ان کے فرزند رشید کو مریدان شاہ لدھا کے زمرہ میں، اور میر طفیل محمد کو متفرقات میں رکھا۔

صاحب بحر زخار نے میر جلیل کی بیعت علویہ اور طریقت اویسیہ و قمویہ کا بھی حوالہ دیا اور آپ کو مصاحب و محرم اسرار حر تقنو یہ بتایا ہے۔ آپ کے کمال و کلام اور وفات اور نعش کے متعلق خرق عادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ واقعہ بھی نقل فرمایا ہے کہ حضرت کی رحلت کے بعد، ایک بار میر آزاد اورنگ آباد میں تپ محرق میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بہت دن گزر چکے تھے اور تپ مفارقت نہیں کرتی تھی۔ ایک شب کو عالم رویا میں حضرت کو دیکھا فرماتے ہیں کہ بیشک بہت تکلیف اٹھائی کل تپ جاتی رہیگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

شیفتہ کا قول مختصر یہ ہے کہ میر کو شعر گوئی میں مرتبہ عالی حاصل تھا اور بلگرام کا نام آپ ہی کے وجود فائض الجود سے شہرۂ آفاق ہوا ؎

مضی واعظم مفقود فجعت بہ   من لا نظیر لہ فی الناس یخلفہ

ذکر خیر

میر صاحب کے حالات کم و بیش اکثر کتابوں میں پائے جاتے ہیں وہ شہرت و ناموری جو انکو زندگی میں نصیب نہیں ہوئی تھی مرنے کے بعد انکے حصہ میں آئی انکی قابلیت و سخن سنجی کی داد اہل فن اور اہل نظر نے دی اور کمالات کا اعتراف کیا ہے۔ بے شبہ میر کے نام کے احیا اور انکو حیات ابدی بخشنے میں آزاد اور انکے قلم نے دم عیسوی کا کام کیا ہے اور انکے بعد مقبول ستام گمنام نے لیکن کچھ ایسے حضرات بھی ہیں جنکو آزاد کے بعض اقوال و تحریرات سے اختلاف رہا ہے مگر میر جلیل کے متعلق وہ بھی متفق المدح اور رطب اللسان ہیں (۱) تاریخ آرائش محفل (۲) منتخبات ہندی و ہندوستانی برائے ترجمانان فوج مطبوعہ کلکتہ ۱۸۲۷ء (۳) جامع التواریخ (۴) حدیقۃ الاقالیم (۵) تاریخ فرخ آباد۔ مولفہ مولوی محمد ولی اللہ حسینی مفتی (۶) گلشن بیخار (۷) الفرع النامی من الاصل السامی مصنفہ نواب صدیق حسن خاں میں میر اور میر کی شاعری کا حال درج ہے (۸) نواب صاحب نے غصن البان المورق بمحسنات البیان مطبوعہ الجوائب قسطنطنیہ ۱۲۹۶ھ میں میر کی بعض لطیف عربی تاریخوں کا ذکر کیا اور (۹) تذکرہ شمع انجمن میں بڑے احترام سے یاد کیا ہے (۱۰) انتخاب اشعار سراپا موسوم بہ ارمغان گوکل پرشاد مطبوعہ کانپور بھی میر کے اس رنگ کے کلام سے خالی نہیں رہا مسٹر طامس ولیم بل نے (۱۱) مفتاح التواریخ فارسی تالیف ۱۲۶۴ھ ۱۸۴۸ء اور (۱۲) تذکرہ مشاہیر شرق The Oriental Biographical Dictionary 1881 میں میر کے سوانح و احوال تحریر کئے ہیں (۱۳) میر حسین دوست سنبھلی نے جو آزاد کے ہم عصر تھے تذکرہ حسینی (شعرا) میں میر جلیل کو "سر دفتر علماے نامی عمدہ بلغاے زمان، قدوہ کمالات دستگاہ" لکھا ہے۔

پایانِ سخن

عذر و شکر

کارسازِ حقیقی کا شکر ہے کہ منزل ختم ہوئی اور قلم کا مسافر تھک کر بیٹھ گیا۔ جسکے آہنگ بلند سے کبھی مُغنی کی دیہ، صدا آتی تھی ؎

لَاَسْتَسْہِلَنَّ الصَّعْبَ اَوْ اُدْرِکَ الْمُنٰی　　فَمَا انْقَادَتِ الْآمَالُ اِلَّا لِصَابِرٖ

اُسکی نگاہ کے سامنے کوئی فراخ دست میدان نہین، بلکہ ایک پُرخار وخطرِ دشت تھا جس کے طے کرنے کیلئے وہ کبھی چلا، کبھی بھاگا اور کبھی بیتابی سے دوڑا۔ بالآخر اُسکی آبلہ پائی نے جواب دیدیا اور وہ باہمت، ہمت ہار گیا، ہر چند کہ حوصلہ شایستہ رسوائی نیست! الرفیق ثم الطریق مشہور مقولہ ہے مگر اِس دلیر مسافر نے یکہ و تنہا قدم نکالا تھا اور اِسی طرح اِس دیارِ بیگانہ سے گزار کیا۔ توفیقاتِ ربّانی اور تائیداتِ یزدانی نے دستگیری و رہبری فرمائی اور وہ "یہ کہتا ہوا مرحلہ مقصود پر پہونچ گیا ع

مژدہ باد اہلِ ریا را کہ زمیدان رفتم۔ اس نے اپنی منزل کس طرح طے کی؟ اسکا فیصلہ اِس وقت نہین بلکہ غالباً میرے بعد اہلِ نظر کرین گے مین نہ لذتِ عاجل کا طالب ہون نہ اجرِ آجل کا متمنّی محنت کی داد اور کام کی قدر و تحسین کی آرزو مجھکو نہ اب ہے نہ شاید کبھی ہوگی ؎

دل لذّتِ ظلم ذوقِ جراحت می خواست　　تختہ ہائے دل خود را بہ نمکدان زدہ ام

دُنیا معترضین سے خالی نہین۔ اگر جاننے اور سمجھنے والے نکتہ بینی و نکوہش فرمائین تو مجھ ایسے ہیچ میرز کے لئے سرمایۂ صد نازش اور موجبِ فخر و امتیاز ہے لیکن ستم ظریفی تو یہ ہے کہ بعض مدعیانِ ہمہ دانی (بھی) جو تصنیف و تالیف کے دشوار گزار کوچہ سے نابلد و ناآشنا ہوتے ہیں

سالہ مین دشواریون کو ضرور آسان سمجھتا رہون گا، یہان تک کہ اپنی آرزؤن کو پورا کرلون۔ کیونکہ صبر کے ساتھ کام کرنیوالے کی سوا امیدین اور کسی کے قابو مین نہین آتین۔

اور جن کو چند سطرین صحیح یا غلط لکھنے کی نوبت، اتفاق سے آتی ہے خوردہ گیری اور عیب جوئی کو اپنا جوہر و شعار بنا لیتے ہین۔ للہ الحمد کہ این فقیر آزادہ رو کو نہ تحسین ناشناس کی آرزو ہے نہ سکوت قدرشناس کی شکایت ہوگی۔ مین تو بلبل شیراز کا ہمنوا ہون ع دل نہی بر خوب ما طعنہ مزن زشت ما۔ مین اپنی تقصیرات و فروگزاشتون سے بے خبر نہین۔ آگاہی ہے کہ اس آوارہ گردی و بادیہ پیمائی مین بارہا غلط روی و کج راہی کا شکار ہوا ہون۔ اسی لئے مجھے قارئین کریم النفس سے محض عفو و مکرمت کا مترصد و متوقع رہنا چاہئے ؎

خوے آدم دارم، آدم زادہ ام آشکارا دم ز عصیان می زنم

عذر۔ بزرگان فرنگ[۱۴۵] کا دستور ہے کہ نقل و روایت کے وقت اپنی معلومات کا ذریعہ و ماخذ بتاتے جاتے ہین میرے ہم وطن ہم عصر صاحب قلم بھی اُن کا تتبع کرتے اور اس بارہ مین کوتاہی کرنے والون پر زبان لعنت دراز فرماتے ہین۔ اس ناچیز تذکرہ مین حتی الوسع اس عاجز نے بھی اسکی تقلید کی ہے۔ لیکن حواشی و اذیال و تحت المتن مین پوری پابندی نہ کرسکا اور اس التزام کو خیرباد کہنا پڑا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض نکتہ بین حضرات کو اس سے ملامت و تشنیع کا موقع ملے ؎

پاک زندہ دل نہ رفت سلامت ز عیب جو کین ماجرا بہ خضر علیہ السلام رفت

عذر مقبول اسی قدر ہے کہ اس پانسو صفحے کی کتاب مین ایسی باتین بہت کم درج ہین جو اس ہیچمدان ہی دوست کی ذاتی واقفیت و معلومات پر مبنی ہون، الا ما شاء اللہ۔ ان اوراق مین سیاہ و سفید، رطب و یابس جو کچھ ہے وہ دوسرون ہی کے دست و بازو سے بہم پہنچا ہے۔ مین نے متقدمین و معاصرین کے خوان کرم سے زلہ ربائی اور خرمن علم سے خوشہ چینی کی ہے

---

[۱۴۵] حقیقتاً یہ معمول تو ہمارے ائمہ حدیث اور سلف صالح کا تھا رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ۔ یورپ نے یہ دولت اکابر اسلام سے پائی اور اس کی پوری حفاظت و قدر کی۔ مصنفین متقدمین کی روش یہی تھی کہ نقل و روایت کے ساتھ سلسلہ رواۃ کو بھی بتا دیتے جاتے تھے۔ وہ نہ صرف کسی واقعہ کو بلکہ اسکے ہر ایک جزو کو علیحدہ سلسلہ سے ذکر کرتے تھے اس قسم کے تحفظات نے گو پیچیدہ طرز بیان سے نہ تو مضمون کا تسلسل قائم رہتا تھا اور نہ مطالعہ کا لطف سننے والوں کی

کانٹوں کو ہٹا کر چند برگِ گل چن لیے ہیں اور اُن کو محلِ مناسب پر یکجا کر کے یہ دستۂ گل
تیار کر دیا ہے۔ بندہ اپنی تنگ دامنی سے مجبور تھا۔ ورنہ خدا کے ہرے بھرے چمن میں
مقبولِ دریوزہ کے لئے نہ پھولوں کی کمی تھی نہ کلیوں کی۔ کہاں تک اُن لکھنے والوں کا
حوالہ دیتا اور اپنے مآخذ و مسانید کو شمار کراتا جن کی تعداد احاد و اعشار سے تجاوز
کر کے مآت تک پہونچتی ہے۔ مکنوناتِ الٰہیہ کی ازلی و قدیم ترین کتاب سے لے کر جس کی
اس عالم کی تنزلی عمر بھی ساڑھے تیرہ سو سال سے زائد ہے، کل شام تک کی مفید مطلب تحریر
جو میری نگاہ سے گذری ہے میں نے اُس سے فائدہ اٹھایا اور اقتباس و استنباط کیا ہے
اگر ہر ایک موقع پر ہر ایک راوی یا قائل کا نام لیتا جاتا تو تکرارِ بے سود کے علاوہ قرائے معظم
کی بے لطفی و زحمت کشی کا باعث ہوتا۔ ناگزیر ضخامتِ کتاب بھی بڑھ جاتی۔ اس لئے مدعیانہ
و حریفانہ نہیں بلکہ نیاز مندانہ و مخلصانہ اتنا عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس عاجز نے
بلا تحقیق و تفحص کچھ نہیں لکھا ہے۔ بلکہ تا امکان خود متعدد و مختلف ذرائع سے اپنی معلومات
کی توثیق کی اور اپنی تحریر کی صحت و صواب کا اطمینان کر لیا ہے ع زہر دیوانہ درز زیر لب
افسانہ سادارم۔ روایات و منقولات کے مقابلے میں معقولات یا اپنے معتقدات کو دخل
نہیں دیا ہے۔

شکر۔ میں جملہ بزرگانِ اہلِ قلم (الاحیاء منہم والاموات) کا زیرِ بارِ احسان اور ان کے
نتائجِ قلم کا رہینِ منت ہوں۔ بعض اوقات میں نے اپنی کم نظری کے باعث چند حضرات
کے کسی خیال یا تحریر سے اختلاف کیا ہے مگر یہ احساس باقی ہے کہ اس دریوزہ گر دکم مایہ نے
انہیں کے تیار کئے ہوئے خوانِ کرم و نعم سے فائدہ اٹھایا اور انہیں کے خرمنِ علم و ادب سے

دہشت بڑھنے لگی تو رفتہ رفتہ یہ طریقہ بھی اٹھتا گیا۔ الحمد! ان حنبل اور علما نے تو اس تغیر کو پسند نہیں فرمایا
وہ توثیق و استناد اور ضبط اعتبار و اعتماد کے لئے سلسلۂ روایات کے مستقل حقوق پر مصر رہے۔ مگر طبیعتوں
پانی کی خواہش غالب آئی اور اس کا رواج گھٹتا گیا۔

ریزہ چینی کی ہے۔ الفضل للمتقدم کی مصداق یہی نام آور دعالی قدر ہستیاں ہیں، جنکے درخشاں کارنامے صفحات روزگار پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ یہی ذوات گرامی ہمارے امتنان وتشکّر کی مستحق ہیں۔ مقبول عاجز بھی انھیں کی ہدایت و رہبری سے متنفع و مستفید ہوا اور اُن کے نقوش قدم پر چلا ہے۔ ترک ادب یا اعتراض جسے کہ سوء ظن بھی اس عصیاں کار کا شیوہ نہیں۔ معہذا جانتا ہوں کہ ناشکری و کفران نعمت کی جز اعیب جوئی و خوردہ گیری کے سوا کچھ نہیں۔ مجھے ایک ممتاز جرمن فاضل کا قول یاد ہے جس نے اپنے سے بھی زیادہ ممتاز اور متبحّر علوم باپ کے سایۂ شفقت میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ اس بلند فطرت انسان نے جب ایک اعلیٰ درجہ کی ادبی تصنیف شائع کی تو اس کی شرح و تحشیہ میں اپنے مطالعہ اپنے خیال کے اظہار کا آغاز ان کلمات سے کیا تھا (gutidissime quter meus)

"پولی ڈیسی می پیٹری اس" "بابائے بزرگ نے کمال غلط کاری سے" یا "پدر مکرم نے بدترین ذوق سے".... صریحاً مقصود یہ تھا کہ میں عملی سبیل البدل (اس کی بجائے) یہ تجویز کرتا ہوں۔ ایسی رائے زنی یا خود ستائی و خود پسندی دور حاضرہ کی روز افزوں روشنی اور کمال ارتقا و تہذیب کا نتیجہ سمجھی جاسکے یا فطرت کی نیرنگی کا اقتضا، لیکن اکبر مرحوم اس کو درس عبرت و بصیرت بتاتا ہے ؎

یہ جو ہنگامہ ہے جھگی ہر طرف تائید ہے   آپ کی تعلیم ہے اور آپ کی تقلید ہے
مستحقان ادب کو آپنے رسوا کیا   آپکے وصول عظمت کی بھی اب تردید ہے

میں اُن تمام ارباب ادب و اصحاب علم کا منت شناس و سپاسگزار ہوں جنھوں نے اس کتاب کی تالیف کے دوران میں میری ہمت افزائی کی اور نیک مشوروں اور صحیح معلومات سے دستگیری و اعانت فرمائی ہے۔ حبیب لبیب مولوی زبید احمد صاحب ادیب العربیا خطیب جامعۂ الہ آباد جن کا نام نامی آغاز کتاب میں آچکا ہے بالخصوص قابل ذکر ہیں جن کی متواتر و مسلسل تحریک نے مجھے مشتغل رکھا اور اس ناچیز تذکرہ کی اشاعت و طباعت

کے لئے ایک بہتر صورت تجویز فرمادی۔

صاحب مناقب فاخرہ مولانا حکیم سید اسحق علی پروفیسر نے بہ کمال شفقت ان اوراق پر نگاہ ڈالی اور اپنے فیضان کمال سے حتی الوسع مجھے جادۂ مستقیم پر گامزن رکھا۔

عزیز محترم منشی محمد الشبیہ علیخان کا بھی بہت ممنون منت و کرم ہون جن کی توجہ و التفات سے تذکرہ ہذا کی کتابت بہ آئین شایان تذکرہ نگار کی نظرون سے دور مقام پر ہوئی اور جنھون نے باوصف اشتغال خدمات سرکاری کبھی دریغ عنایت نہ فرمایا۔

بااین ہمہ سعی و کاوش اس حقیر مجموعہ مین بہت سی غلطیان اہل نظر کی نظر سے گزرین گی کچھ تو کاتبین کرام (کاپی نویسون) کے طفیل مین، مگر زیادہ تر خود اس غلط کوش کی بدولت سیدنا عمر فاروق رضی کا قول ہے رَحِمَ اللّٰہُ مَنْ اَھْدٰی اِلَیَّ عُیُوْبِیْ (خدا اُس کا بھلا کرے جو میرے عیوب کا تحفہ میرے پاس لائے) مین اُن صاحبون کا شکر گذار ہون گا جو میری تقصیرات اور غلطیون سے مجھ آگاہ فرمائین گے ہوسکا تو طبع آئندہ مین ان کی درستی و اصلاح کر دون گا، ورنہ جس کسی کے دل مین جو کچھ آئے کہہ ڈالے کہ انسان اُنہی امور مین قابل سرزنش ہوسکتا ہے جو اُسکے بس کا ہو۔ ؎

اَلَا لِیَقُلْ مَنْ شَآءَ مَا شَآءَ اِنَّمَا   یُلَامُ الْفَتٰی فِیْمَا اسْتَطَاعَ مِنَ الْاَمْرِ

۲۷ ذی قعدہ ۱۳۴۵ھ   سمدن۔ (فتح گڈھ)

نامہ سیاہ مقبول

ملحقات

استدراک و اضافہ

تذکرہ ہذا کی کتابت وطباعت میں پورے دو سال صرف ہو گئے۔ خود فراموش مقبول کو اس دوران میں بہت سی باتیں لکھنے کے قابل یاد آئیں۔ بعض طاق نسیاں میں محفوظ ہیں باقی سپرد قلم کیجاتی ہیں۔

قرائے کرام ان سطور کو خواہ یہاں رہنے دیں خواہ کتاب میں مناسب موقع پر منتقل فرمائیں۔ حیات مستعار کا بھروسہ نہیں جو طبع آیندہ میں اضافہ و اصلاح کی امید کرسکوں ؎

از ہستی ما ہمیں نمونہ است چو موج   نقشے است وجود ما کہ بر آب زدند

آخر جمادی الآخر ۱۳۴۷ھ
مقبول

حصہ اول

صفحہ ۱۰۔ نوٹ ۳۳۔ اضافہ (آخر میں:-)

ذیل کی تقادیم وزائیچات بھی قابل ذکر ہیں

(۱) ہیملٹن Capt. A. Hamilton نے سنوات ہندی کی

ایک کلید تیار کی تھی جو ۱۸۲۰ء میں کیمبرج سے دو جلدوں میں شائع ہوئی۔

(۲) ایک "جدول تقاویم" ۱۸۳۵ء میں کلکتہ میں چھپی تھی۔ اسمیں صوبجات بنگال، بہار، اوڑیسہ، بنارس و دیگر ممالک مفوضہ و مفتوحہ میں جو مختلف سال رائج تھے اُنکی تاریخیں بالمقابل درج تھیں۔

(۳) احاطۂ بمبئی میں جو مختلف سن یعنی عیسوی، ہندی، اسلامی و پارسی مستعمل تھے اُنکی متوازی و متقابل تاریخوں کا ایک زایچہ "جدول تقاویم" کے نام سے پوری ایک صدی کا (از ۱۷۵۲ء تا ۱۸۵۲ء) بمبئی سے ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

(۴) بوناڈ W. A. Bonnaud نے بھی ایک جنتری ہندوستان کے مختلف سالوں (سنوں) کی ۱۸۴۸ء سے لیکر ۱۸۷۵ء تک کی ۱۸۷۵ء میں مرتب کی تھی جو کلکتہ اور بمبئی دونوں مقامات سے شائع کی۔

صفحہ ۱۴۱۔ نوٹ ۲۷ متعلق سمدن۔ اضافہ (آخر میں)

قنوج کی ہندو سلطنت کا وہ بڑا اور قدیم صومعہ اور آشرم جو ہندوستانی تہذیب و شایستگی اور تربیت و آموزش کا سرچشمہ تھا اور جسکا شمار ہندوستان کے لئے آرہونکے بخشے ہوئے بڑے بڑے فیوض و برکات میں ہوتا ہے اسی موضع میں اُس بلند مقام پر تھا جہاں اب بڑی عیدگاہ واقع ہے۔ اس خانقاہ یا مٹی نواس کے گرد جنگل تھا جہاں مرتاض رشی مع اپنے کنبہ و خاندان کے رہتے تھے۔ انکے گوشہ عافیت مساکن "تپوون" کہلاتے تھے۔ اِن مقدس ہستیوں کی توجہات تمام تر توسیع و ترقی علم اور حسن سیرت و نکوئی اخلاق کے سکھانے اور پھیلانے پر منعطف و مصروف رہتی تھیں۔

پرچم اسلام تو اس مقام پر محمود غزنوی کے عہد دولت میں بلند ہوا ہے لیکن سب سے پہلا مسلمان جس کے قدم سمدن کی خاک نے چومے تھے زبدۃ الہ

کلابی تھا جو پہلی صدی ہجری کے آخر یعنی تقویم مسیحی کی آٹھویں صدی کے آغاز میں ولید بن عبد الملک اموی خلیفہ دمشق کا فرمان لیکر سفیرانہ حیثیت سے قنوج کے راجہ کے یہاں گیا تھا۔ تاریخوں کے پڑھنے والے جانتے ہیں کہ محمد بن قاسم اول مجاہد و فاتح ہندوستان نے سندھ سے اپنے سپہ سالار ابو حاکم شیبانی کو ان اطراف میں دعوت اسلام اور اعلائے کلمۃ الحق کے لئے روانہ کیا تھا۔ لیکن مختلف انتظامی وجوہ اور فوجی مصالح سے وہ خود تو اودے پور میں ٹھہر گیا اور اس اولوالعزم و بہادر جنرل (کلابی) کو ادھر بھیجدیا۔ اصابہ فی تمییز اسماء الصحابہ میں جو علم رجال میں حافظ احمد بن حجر عسقلانی کی مستند و ضخیم تالیف ہے نیز کتاب الذیل میں اسحاق بن ابراہیم طوسی (جنکی عمر اسوقت ستانوے برس کی تھی) اور سرباتک بادشاہ ہند کی ملاقات و گفتگو کا حال مرقوم ہے۔ مگر اہل تحقیق عموماً اور امام ذہبی خصوصاً جو رجالی بھی ہیں محدث بھی اور عظیم الشان مورخ اور مصنف بھی اپنی تحریروں میں انکی یا (یوں کہئے کہ) سرباتک کی باتوں کو کذب واضح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس واقعہ اور مکالمہ کو اور بھی بہت سے راویوں نے کم و بیش نقل کیا ہے۔ عمر بن احمد نیشاپوری کا قول ہے کہ سرباتک نے ۳۳۳ھ (۹۴۴ء) میں وفات پائی تھی۔ بہرکیف قابل وثوق ذرائع سے اسقدر ثابت ہے کہ اسحاق بن ابراہیم طوسی تبلیغ و ہدایت کے لئے اسیطرف ہوکر قنوج گئے تھے۔

چند سلاطین دہلی کو بھی سمدن میں ٹھہرنے یا گذرنے کا اتفاق ہوا ہے تاریخوں کی ورق گردانی خصوصاً فیروز شاہی (ترجمہ ڈوسن Dowson) و طبقات طبقات ناصری و طبقات اکبری و مبارک شاہی و فرشتہ وغیرہ کے مطالعہ سے اسکا پتہ چلتا ہے۔

ہاں سمدن۔ تقریباً قنوج اور بھوج پور کے وسط میں ہے غیاث الدین بلبن کو

وہاں کے آنے جانے میں دو بارہ یہاں آنیکا اتفاق ہوا تھا۔ پہلے ۶۴۵ھ (۱۲۴۷ء)
میں بزمانۂ وزارت بعد ازاں ۶۶۵ھ (۱۲۶۶ء) میں بطور شاہنشاہ۔

۲۔ جلال الدین خلجی نے جب الغ خاں پر فوجکشی کی تھی جسکا ذکر امیر خسرو نے
مفتاح الفتوح (غرۃ الکمال) میں کیا ہے تو وہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) میں سمدن ہوتا ہوا
گیا تھا۔

۳۔ محمد جونا بن تغلق۔ پہلی مرتبہ سُرگ دواری جاتے ہوئے ۷۴۶ھ (۱۳۴۵ء)
میں دوسری دفعہ ۷۴۷ھ (۱۳۴۶ء) میں واپسی قنوج پر اور

۴۔ ناصر الدین محمد تغلق اٹاوہ جاتے ہوئے ۷۹۴ھ (۱۳۹۲ء) میں گذرے تھے۔

۵۔ محمود شاہ تغلق ۸۰۴ھ سے ۸۰۸ھ (۱۴۰۱ء سے ۱۴۰۵ء) پانچ سال تک
قنوج میں مقیم فرمانروا رہے سیر و تفریح کے لئے اس طرف اکثر نکل آتا تھا۔
وہ اس کشت زار کی لطافت و دلفریبی اور دلکشی کا بڑا معترف تھا سمدن کا پرانا
اور شیریں کنواں اٹھ کونا اسی عہد کی یادگار اور فیض جاری ہے۔

۶۔ بہلول لودی یہیں سے دو بار شمس آباد گیا تھا۔ انہیں ہنگاموں یا کوکبۂ شاہی
کے غلغلوں سے متاثر و مرعوب ہوکر بعض سادات تلاش معاش اور ترک وطن کے لئے
مجبور ہوئے تھے۔ بعض اہل شوق تحصیل و تکمیل علوم و فنون کے لئے باہر نکل گئے تھے
صاحب شرائف عثمانی کا بیان ہے کہ میر غلام علی آزاد کے بزرگوں نے اسی زمانہ
میں اور اسی ضرورت سے سمدن کو چھوڑا تھا۔

۷۔ شاہزادہ جوان دولت و اقبال ہمایوں مرزا جب بابر کے حکم سے سلطان محمد
دہیار خاں پر فوج لیکر گیا ہے تو سمدن میں فروکش ہوا تھا۔ یہ روایت مقامی سینہ بسینہ
چلی آتی ہے کہ سمدن کے ساتھ ہمایوں کو اسی وقت سے الفت ہوگئی تھی حتیٰ کہ جب وہ ایران
سے واپس آیا اور ہندوستان کو پھر فتح کیا ہے تو سمدن کو یاد کیا اور اپنے رفقا سادات

مشہدی کو یہاں اقامت گزیں ہونیکا مشورہ دیا تھا۔

ـــــ۔ شاہ عالم بعض سیاسی وجوہ و مصالح سے خود تو یہاں نہ آ سکا تھا مگر اُس نے اظہار ارادت و عقیدت کے لئے اپنا دیوان اشعار حجۃ الملۃ والامہ سید برہان الدین مولانا انار اللہ برہانہ کی خدمت میں بھیجا تھا۔ شقہ مصحوب میں لکھا تھا کہ آپ کا آستان مدتوں سے زیارت گاہ خلائق اور مرکز فیوض و سعادات رہا ہے۔ آپ کا قصبہ کئی جہت سے ایک مخصوص امتیاز و شہرت رکھتا ہے۔ وہ علم کے لعل ہائے درخشاں کے لئے مدتوں سے بدخشاں اور فنون و کمالات کے لآلی آبدار کا عدن بنا ہوا ہے۔ (یہ شقہ بہ دستخط خاص شاہان سلف کے دیگر فرامین کے ساتھ میرے آبائی کتب خانہ میں محفوظ ہے)

فرخ آباد کے نواب رئیس بھی بڑی قدر و احترام ملحوظ رکھتے تھے۔ انکی سرکار میں بعض باشندگان سمدن کو پورا اقتدار و اختیار حاصل تھا۔ مسلمانوں کی سلطنت میں ضعف آنے اور انکی دولت و قوت کے زائل ہونے کے ساتھ ساتھ سمدن کی عظمت ایک علمی و روحانی مرکز ہونے کی حیثیت سے روز بروز گھٹنے لگی حتیٰ کہ یہاں کے سادات و مشائخ کے بعض اخلاف سبحہ و سجادہ چھوڑ کر تلاش معاش اور تیغ و تفنگ اُٹھانے پر مجبور ہوئے اور اس خرقہ پوش و طیلساں بردوش جماعت کے افراد چست فوجی وردی زیب تن کئے نظر آنے لگے تقریباً ڈیڑھ صدی یعنی امن و سکون کے موجودہ دور کے آغاز تک یہ مقام جنگی زاویہ نگاہ سے ایک اہم مقام رہا ہے۔ بعض متاخرین اسی حیثیت سے اسکی تقریب کرتے ہیں۔ شیخ مرتضیٰ حسین الہ یار خانی حدیقۃ الاقالیم (مطبوعہ نولکشور صفحہ ۱۲۳) میں اُس میدان کا نشان دیتے ہیں جہاں جولائی [illegible] میں نصیر الدین حیدر اُسکے بخشی ہزار جنگ آزمودہ سپاہیوں اور سرداروں کو احمد خاں بنگش نے زیر دست شکست دی تھی اور ہمیشہ یا کم از کم ایک زمانہ کے لئے نواب وزیر الممالک فرمانروائے اودھ کی حکومت اس قطعہ ملک سے اُٹھا دی تھی۔

احمد خاں بن محمد خاں باغوائے افاغنہ۔۔۔۔شمس آباد کہ سرگروہ آں رستم خاں نام داشت خروج کردہ و با راجہ نول رائے متصل سمدن رزمے صعب نمودہ او را بقتل رسانید۔" انگریزوں کی نظر میں اسکی خاص وقعت تھی۔ اسکو بہت سے جنرلیوں اور افسروں نے سپرد قلم کیا ہے۔

(۱) ایڈورڈ تھارنٹن Edward Thornton نے جو ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی تاریخ کا مشہور مولف ہے سرکار ایسٹ انڈیا کمپنی کی مقبوضات اور اقلیم ہند کی دیسی ریاستوں کا گزیٹیر بحکم آنریبل کورٹ آف ڈائرکٹرس مرتب کیا تھا اور جس میں خاص طور پر اُن وثائق و دستاویزات سے استنباط و استناد کیا گیا تھا جو کمپنی کے قبض و تصرف میں تھے۔

A Gazetteer of the Territories under the Government of the East-India Company, and of the Native States on the continent of India. Vol. IV,-page 615.

اسکی جلد چہارم صفحہ ۶۱۵ مطبوعہ ۱۸۵۴ء لندن میں سمدن کا حال لکھتا ہے اور گریں ایچہ (انگلستان) کی مساحت کے اعتبار سے عرض البلد ستائیس درجہ بات دقیقہ اور طول البلد اٹھاسی درجہ چھیالیس دقیقہ بتاتا ہے۔

(۲) وہ لکھتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اکثر سرکاری تحریرات و دستاویزات E. I. C. Mis Doc. میں اس کا ذکر موجود ہے معروف نام سمدن Sumdun ہے مگر عوام کالانعام سمجن Sumjun بولتے ہیں۔" یہ ایک چھوٹا سا قصبہ a small town فرخ آباد کے برطانوی ضلع اور صوبجات شمال و مغرب کی

لفٹنٹ گورنری میں اُس سڑک پر واقع ہے جو کانپور سے چھاؤنی فتحگڈھ کو جاتی ہے۔
(۳) گارڈین اپنی کتاب "شوارع وسُبل" کے صفحہ ۱۲۱ پر۔

Garden. Tables of routes, 121.

اسکے موقع و مناظر کو بیان کرتا ہے اور اُس کا فاصلہ قریب کی بعض لشکرگاہوں
سے بتاتا ہے۔
(۴) کپتان آرمنڈی نے "قلم و پنسل کے نقوش" یعنی ہندوستان میں ایک دورہ
کا سفرنامہ دو جلدوں میں لندن سے ۱۸۳۲ء میں شائع کیا تھا۔

Mundy (Cap.-R.)—Pen and Pencil sketches, being the Journal of a tour in India. London, 1832, Vol. I-44.

اسکی جلد اول کے صفحہ ۴۴ میں۔ اور
(۵) میجر ای سی آرچر نے اپنی سیاحت کی یادداشتیں نہایت مکمل لکھی تہیں
جو بالائے ہند اور بعض حصص کوہ ہمالیہ کے دورے۔ مع حالات دربارہائے
امرائے ہند کے نام سے لندن میں ۱۸۳۳ء میں دو ضخیم جلدوں میں چھپی تہیں۔

Archer (Maj. E. C.)—Tours in Upper India, and in parts of the Himalaya Mountains; with accounts of the Court of the Native Princes. London. 1833. Vol. I-43.

اسکی پہلی جلد کے صفحہ ۴۳ پر۔
یہاں کے راستہ کی عمدگی کا اعتراف کیا گیا ہے۔ زمین کے ہموار و سطح ہونے
اور لہلہاتے ہوئے سرسبز قطعات اور مراتع و مزارع کی تحسین کی ہے۔
حال کی تاریخوں میں سے میر بہادر علی چہبرا موی (اصلاً صمدنی) کی لوح تاریخ

(۱۲۵۵ھ) رائے بہادر منشی کالی رائے ڈپٹی کلکٹر کے فتحگڈھ نامہ (مطبوعہ ۱۸۴۹ء) اور مسٹر ولیم آیروین کی انگریزی تاریخ نوابین بنگش فرخ آباد (۱۸۷۸ء) اور اسکے اردو ترجمہ (مطبوعہ حسنی پریس ۱۸۸۰ء) میں سمدن کا ذکر موجود ہے۔

حضرت قلندرؒ کا خمیر پاک اسی خاک سے تھا جو وطن آبائی سے دور دیار مشرق میں پیدا ہوئے اور آگرہ میں پیوند زمیں ہوئے ملا طاہر غنی کشمیری نے اسی بلند پایہ مصنف و شاعر کی شان میں فرمایا تھا ؎

از اہل سخن کس بہ قلندر نہ رسد — در شعر باو عرفی و سنجر نہ رسد

العجب ثم العجب! کہ ایسا نکتہ شناس بالغ نظر ان کو عرفی کیسے قادر الکلام (کاشی) سے برتر بتاتا ہے!!

زندۂ جاوید فیضی کی گور معطر رہے جس نے بزرگان سمدن کے حسب حال یہ شعر کہا تھا ؎

شدیم خاک ولیکن بہ بوئے تربت ما — تواں شناخت کزیں خاک مرد می خیزد

بہو بیگم صاحبہ (زوجہ نواب شجاع الدولہ) کی رحلت پر اہل کمال فیض آباد سے رخصت ہونے لگے تو استاذ الاساتذہ میر مستحسن خلیق (پدر میر انیس) نے فرخ آباد کا رخ کیا۔ رجب ۱۲۴۳ھ میں سمدن پہونچے۔ سادہ دل سادہ منش سیدوں نے کمال محبت و احترام سے اپنے غریب الوطن بھائی کو روکا۔ خاطر و مدارات کی۔ مہمان عزیز بھی ان کے خلوص و بے تکلفی سے متاثر ہوا۔ کچھ روز یہاں بسر کئے نواب رئیس (والی فرخ آباد) کے یہاں ہی سمدن ہی کے ایک با اقتدار سید زادہ نے تقریب وسعی کی۔ سمدن کے بعض خاندانوں میں مرثیہ گوئی کی بنیاد اسی زمانہ میں پڑی۔ ان سادات کے اخلاف تحت اللفظ پڑھتے ہیں اب تک اسی روش اجداد پر قائم ہیں۔

صفحہ ۵۲ - نوٹ ۵۴ - نواب مبارک خاں کا پورا قطعہ یہ ہے ؎

مالک ملک نظم شیخ نظام — شاعرے نادر و فصیح کلام
در قصیدہ شدہ ظہیر زماں — در غزل گشتہ خسرو ایام
بست رخت بقا ز ملک فنا — کرد آہستہ سوئے خلد خرام
کردم اندیشہ بہر تاریخش — خردم گفت آہ آہ نظام ۱۱۰۰ھ

صفحہ ۵۳ - نوٹ ۵۵ - آخر - شیخ سلیمان بلگرامی کی رحلت کا قطعۂ تاریخ مولانا ضمیری نے لکھا تھا ؎

سپہر جاہ و دولت اے سلیماں — کہ تاج کنگرش شد تا سر ماہ
شدہ پیمانہ اش پر چوں بنقد — بوقت رحمت حق اولیں ماہ
ہمیشہ خلق و احسان و عطایش — شدہ افسانہ در عالم بافواہ
بسوئے جنت عالی رواں شد — بحکم ایزدی آں جناب شواہ
چو با جاہ و جلال خویش آں شیخ — گرفتہ جانب خلد بریں راہ
پئے تاریخ فوتش در بدیہہ — خرد گفتہ کہ آں شیخ با جاہ ۹۹۷ھ

دوسری تاریخ ایک مصرع "شمار سال وفاتش سلیمان خلد بریں" سے نکلتی ہے

صفحہ ۵۵ - سطر ۱ - حاشیہ متعلق شیخ اللہ یار (پسر شیخ عبدالسبحان) - شہید ہونے کے بعد

یہ واقعہ بیسات تاہیں دسہرہ کے دن ہوا تھا - شیخ روح الامین نے قطعہ تاریخ لکھا ؎

ناگہاں ہاتفے از در کشید آہ و بگفت — کشتہ و داد اللہ یار لشکر اسلام

سے تاریخ (۱۱۲۹ھ) نکالی تھی۔ شیخ غلام حسین نحیف نے شعر آخر کو بدل کر دائرۂ تاریخ تیار کر دیا

ناگہاں ہاتف غیب از سر اعلام بگفت — حرف شد داد اللہ یار بفوج اسلام ۱۱۲۹ھ

صفحہ ۵۵ سطر ۳ اضافہ شیخ روح الامین کسی وقت نواب کمال الدین خاں کے مصاحب رفیق تھے ۔ ۔ ۔ کے محاصرے کے بعد نواب نے قلعہ فتح کیا تو شیخ نے فی البدیہہ تاریخ لکھی ؎

چو تاریخش زعقل خویش جستم — بگفت اینک شکست از پائے کفار ۱۱۰۲ھ

صفحہ ۵۸۔ سطر ۱۶۔ حاشیہ۔ رفع اشتباہ کے لئے یہ لکھدینا ضروری ہے کہ اسی نام (قاضی محمد یوسف) کے ایک اور مشہور بزرگ بھی بلگرام میں گزرے ہیں۔ جو قاضی بھکاری فرزند قاضی کمال کے بیٹے تھے۔ ۵ ذیقعدہ ۹۸۴ھ کو وفات پائی سید ضیاء اللہ نے تاریخ لکھی ؎

آہ قاضی یوسفم کو آہ آہ — بادشاداں او برضواں اللہ
در سن ہشتاد و چارم با ہزار — خامس ذیقعدہ رفت آں بار غار
سال فوت آں شریعت دستگاہ — آہ قاضی یوسف آمد آہ آہ ۹۸۴ھ

تاریخ بحساب مکتوبہ آہ قاضی یوسف آہ آہ سے نکلتی ہے۔ ایک (کا عدد) زائد معلوم ہوتا ہے اور لفظ آمد مادہ تاریخ سے باہر۔

صفحہ ۶۰۔ سطر ۸۔ اضافہ حاشیہ پر۔ تردی بیگ، نامور امرا و اعیان دولت سے تھا۔ اوائل جلوس اکبر بادشاہ میں حکومت و حراست دہلی پر مامور تھا۔ ہیمو بقال کے معرکہ سے روگرداں ہو جانے یا منہ چھپانے کا اتہام لگا کر بیرم خاں نے بے اطلاع بادشاہ ۹۶۳ھ میں اسکو قتل کرادیا تھا یہی فعل خود بیرم خاں کے زوال و معزولی کا سبب ہوا۔

صفحہ ۶۷۔ سطر ۱۰۔ ترجمہ آیت کے بعد۔ اُس کا قول ہے ۲العلم ۲فضل ۲النسب ۲الشرف ۲للقب۔ علم ہی بزرگ ترین نسب اور برترین لقب ہے۔ اس شرف سے بڑھکر کوئی شرف نہیں۔ شرافت خاندانی کوئی چیز نہیں۔

صفحہ ۶۸۔ نوٹ ۶۲۔ سطر ۱۳۔ اضافہ۔ لاڈلی بیگم کا روضہ مسٹر ہیل نے ۱۸۴۹ء میں دیکھا تھا۔ مفتاح التواریخ میں اسکے حسن تعمیر و استحکام کی تعریف کرتے اور ضروری حالات درج کرتے ہیں آگرہ کے دو دولتمند بنیوں کی بدولت یہ رفیع الشان سنگین عمارت

اب صفحہ روزگار سے محو ہو چکی ہے۔ اسکی شاندار باؤلی، بلند چار دیواری، خوشنما گنبد اور عمارات، پر تکلف تہہ خانے سب کھد گئے۔ مقبرہ کا دمدمہ نہایت مضبوط تھا اور سے کھد نہ سکا تو سرنگین لگا کر اُس کا اینٹ پتھر سب نکال لیا گیا۔ رہے نام باقی بس اللہ کا

صفحہ ۱۰۷۔ نوٹ ۲۰ کے آخر میں۔ ہندوستان کے اول مسلمان فاتح عماد الدین محمد بن قاسم نے ابو حاکم شیبانی کو ایک لشکر جرار کے ساتھ قنوج کی مہم پر بھیجا تھا وہ اودے پور تک (جسکو عربی مورخین اُوذافر لکھتے ہیں) پہونچا تھا کہ سپاہیوں کی بے انتہا تکلیف و زحمت، تعب سفر اور تجربے نے اسکو آگے بڑھنے سے روکا تو وہ اودے پور میں ٹھہر گیا اور اپنی طرف سے زید بن عمر کلابی کو سفیر بنا کر خلیفہ ولید بن عبدالملک اموی کے خط کے ساتھ قنوج بھیجدیا۔

مشہور مورخ Mill اپنی تاریخ ہندوستان جلد دوم (صفحہ ۳۵۰) میں لکھتا ہے کہ اودے پور ایک کوہستانی قطعہ مابین اجمیر و مالوہ کے واقع ہے۔ یہاں کا رئیس اگرچہ مسلمانوں کی اطاعت کا اعتراف کرتا رہا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ پہاڑوں سے محفوظ ہونے کی وجہ سے اُس نے واقعی طور پر کبھی اطاعت نہیں کی تھی۔"

تھارنٹن Thornton لکھتا ہے کہ "اودے پور کا شاہی خاندان تمام راجپوتوں میں بیحد ممتاز و محترم رہا ہے۔ اس خاندان کو افتخار و دعویٰ ہے کہ اُس نے دہلی کی شاہنشاہی سے رشتہ و قرابت کرنیکا عار و ننگ گوارا نہیں کیا۔"

رینل Rennell اپنے تذکرہ سیر و سیاحت میں تحریر کرتا ہے۔ "رانا یعنی فرمانروائے اودے پور ہمیشہ راجپوت ریاستوں کا سردار شمار ہوتا رہا ہے ایسے راجہ بھی ہیں جو اُسکی برتری و تفوق کسی اور نہج پر تسلیم نہیں کرتے ہیں مگر قدیم الایام سے ان کا دستور بھی اطاعت و بندگی کا رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ثبوت

راناکے مورثوں کے ہاتھ میں اصلی قوت کے موجود ہونے کا تھا جسکو ہسٹاریئے ہیں غالباً کسیوقت راجپوتانہ میں اسکے تحت میں ایک مسلّم بادشاہت یا شاہنشاہی قائم تھی۔"

ٹاڈ Tod راوی ہے کہ حکمراں خاندان اور کُل قبیلہ اہل فارس کی نسل سے ہے۔ پہلے گھلوت کہلاتے تھے جو انکے ایک سردار کا نام تھا۔ پھر سیسودیا کا لقب اختیار کر لیا۔"

صفحہ ۱۱۔ سطر ۴۔ چتور پر نوٹ۔ حاشیہ۔ چتور گڈھ کا مشہور وزبردست قلعہ اودیپور کے شمال و مشرق میں پینسٹھ میل کے فاصلہ پر اور چھاؤنی نصیر آباد سے سو میل کے قریب جانب جنوب واقع ہے۔ چھٹویں صدی مسیحی میں اسکو راجہ چترنگ نے تعمیر کیا تھا۔ ترکوں اور مغلوں کے عہد میں یہ قلعہ اکثر جولانگاہ سپاہ بادشاہان رہا ہے یہاں کی خونریزیوں سے اوراق تاریخ ہمیشہ رنگین رہینگے۔

قلعہ جس پہاڑی پر واقع ہے تین ہزار فٹ بلند ہے۔ اسکا طول شمالاً جنوباً تین میل کے قریب اور عرض شرقاً غرباً سوا دو میل ہوگا۔ دامن کوہ کی آبادی سے ایک وسیع و ہموار راستہ قلعہ کو جاتا ہے۔ اس راستہ میں تین موڑ پڑتے ہیں۔ اسوجہ سے قدرتاً چڑھائی کے بھی تین حصے ہوگئے ہیں۔ اسی طرح پھاٹک بھی تین رکھے گئے ہیں۔ پہلا۔ پہاڑ کے دامن میں۔ دوسرا وسط میں۔ تیسرا قلعہ کی بلندی کے قریب۔ ایک چھوٹا سا دروازہ دیا کھڑکی مشرق کی سمت بھی تھا جواب بند کر (پاٹ) دیا گیا ہے۔ قلعہ کے آثار قدیمہ میں سب سے زیادہ قابل توجہ دو منارے یا استمبھا ہیں جنکو فرمانروایان وقت نے اپنی فتح کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا۔ پورب طرف کا منارہ اگرچہ نہایت قدیم ہے لیکن جو منارہ قلعہ کے مغربی پہلو میں ہے اُس سے زیادہ عظیم الشان بلند اور خوشنما ہے۔

انگریز اہل قلم لکھتے ہیں کہ اسکو پندرہویں صدی مسیحی کے وسط میں یہاں کے راجہ کُمبھا نے محمود خلجی پر فتح پانے کی یادگار میں تعمیر کیا تھا (مگر تاریخی نقطۂ نظر سے مجھے اس واقعہ کے اس زمانہ کو صحیح ماننے میں تامل ہے)۔ اسکی بلندی اکتالیس گز ہے۔ آٹھ گز کے مربع چبوترے پر یہ قائم ہے۔ حسب دستور اسکے اندر زینے اور دریچے بنے ہوئے ہیں۔ ان سے کوسوں تک کے خوشنما اور دلکش مناظر نظر آتے ہیں۔ اسکی بیرونی سطح پر سنگ تراشی اور نہایت عمدہ صنعت کاری کی گئی ہے۔ بہت سی مورتیں بنی ہوئی ہیں لیکن اب اُنکے چہرے صاف طور پر نمایاں نہیں۔ انگریز کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے اپنی فتح ہوجانے پر ان بتوں کے چہرے بگاڑ دیئے تھے۔

صفحہ ۱۵۵۔ پانچویں سطر کے بعد اضافہ۔ سلطان احمد شاہ بہمنی سادات کی بڑی تعظیم و تکریم کرتا تھا۔ ملا قاسم فرشتہ لکھتا ہے ؎

نہ پرسے کس از خویش و از اجنبی   گرامی تر از اہل بیت نبی
چنان معتقد بود سادات را   ہمان اہل تقوی و طاعات را
یقینش قوی بود و دینش درست   بجز داد گر یاری از کس نجست

صفحہ ۱۶۳۔ سطر آخر۔ حضرت شہر بانو۔ ترکی میں یہ نام اب بھی بہت مقبول ہے اور اکثر کہا جاتا ہے مگر وہاں تلفظ اور املا دونوں شہربان رہ گیا ہے۔

صفحہ ۱۶۴۔ سطر ۸۔ قاضی سید نور اللہ شوستری پر حاشیہ۔ قاضی صاحب جملہ فضائل حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے جامع اور تمام اصناف علوم معقول و منقول کے حامل تھے۔ علم و حلم کے سوا خوبصورتی طبع و صفائے ذہن اور زیرکی میں قلیل نظیر رکھتے تھے۔ بیل لکھتا ہے کہ انصاف، نیک نفسی، حیا و تقوی اور تمام صفات شریفانہ آپکی ذات میں مجتمع تھیں۔ معاصرین کے کمال و کلام کی داد فیاضی سے دیتے۔ فیضی کی بے نقط تفسیر سواطع الالہام پر نہایت لطیف و نفیس تقریظ

کیا تھا۔ حکیم ابوالفتح شیرازی کی سعی وسفارش سے اکبر کے دربار میں جگہ پائی اور شیخ معین کے بجائے قاضی مقرر ہو کر لاہور بھیجے گئے۔ اپنے زمانہ میں خائن اور بد دیانت قاضیوں اور مفتیوں کو اچھا سبق دیا تھا۔ رشوت کا دروازہ بند ہو گیا۔ اگرچہ مذہباً امامیہ تھے اور نہایت پابند مذہب لیکن فقہ حنفی پر بھی عبور کامل حاصل تھا مقدمات کا انفصال اُسی کے مطابق کرتے تھے۔ جہانگیر نے لاہور سے تبدیل کر کے اپنے لشکر کا میر عدل مقرر کر لیا تھا۔

۱۰۱۹ھ (۱۶۱۰ء) میں وفات پائی۔ آپ کا مرقد آگرہ میں مشہور اور مرجع اہل عقیدت ہے۔ اسی احاطہ میں اور بہت سی قبریں ہیں جنکے کتابے قابل دید اور عبرت آموز ہیں

صفحہ ۱۳۴ سطر ۷ متن کے خاتمہ پر۔ شرفائے بلگرام کو سادات ہوں خواہ شیوخ، متوطن ہوں خواہ مہاجر، میر عبدالجلیل اور میر غلام علی کے خاندان کو بلگرامی الاصل ماننے سے ہمیشہ احتراز رہا ہے۔ وہ انکے طبقہ کو چھتّہ کے لقب سے ملقب بتاتے ہیں۔ انکے خاندان کے مراسم و رسوم اور طرز معاشرت برادران سادات صغراوی سے قطعاً جدا و مختلف رہی ہے۔

انکے نزدیک تمام پرانی تاریخوں اور روایات اور متقدمین وسابقین کی تحقیقات و تحریرات سے ثابت ہو چکا ہے کہ سید صغری کے صرف ایک ہی فرزند سید سالار نام تھے۔ جو سید السادات اور دُر یکدانہ جد السادات کہلاتے ہیں تمام سادات صغراوی بلگرامی انہیں کی اولاد ہیں مگر میر عبدالجلیل نے اس قصیدہ (؟) اور میر غلام علی آزاد نے اپنے تصنیف کردہ نسب نامہ سادات بلگرام موسوم بہ شجرہ طیبہ میں سید محمد صغری کا ایک اور فرزند سید عمر قائم کر کے اپنا سلسلہ نسب پیوند کر دیا اور اپنے خاندان کے سادات کو بھی صغراوی بلگرامی قرار دیدیا

بلگرام کی ایک نہایت پرانی تاریخ جامع البرکات نام ہے۔ اسکے مولف شیخ برکت الدین شیخ شاکر فرشوری رقم طراز ہیں" سید محمد واسطی از واسط بہ بلگرام تشریف آوردہ سکونت ورزیدند و میر محمد صغری یک پسر داشت بروایت صحیحہ سید سالار ..... واز قوم بُہنہ سید عمر بعد آں سید حسین، باز سید نصیر، باز سید حسین، باز سید سالار، باز سید لطف اللہ لدہا کلاں، باز خدادا دعرف دادن، باز سید محمود بُہنہ لقب بود۔ ایشاں باز سید پیارا لے پسر داشت مسمی سید حسین و سید حسن ہمعصر شیخ المشائخ حافظ کمال علمائے دین متولی فرشوری بلگرامی۔ درہمیں عرصہ سادات بُہنہ در بلگرام آمدہ سکونت ورزیدند سید حسین بن پیارا پسرش لطف اللہ، باز سید کرم اللہ، باز سید لطف اللہ، باز سید نوازش علی شاہ لالہ میاں، باز شاہ رحم میاں۔ دومی سید حسین بن پیارہ کہ بہ بلگرام آمدہ سکونت اختیار نمودند و قیام کردند"

صفحہ ۱۴۸۔ نوٹ ۱۲۷ فضائل خاں کا آخر۔ آزاد نے فضائل خاں کا اصلی نام نہیں لکھا۔ تحقیق مزید سے خیال ہوتا ہے کہ شیخ سلیمان نہ ہوں بلکہ میر ہادی سے مراد ہو۔ میر ہادی نے بھی بارگاہ عالمگیری سے فضائل خاں خطاب پایا تھا۔ انکے والد ملا میر حاجی، وزیر خاں، شاہزادہ محمد اعظم کے دیوان تھے۔ میر ہادی ملا شیخ عبدالعزیز اکبر آبادی کے ممتاز شاگرد تھے اور علم و فضل میں یگانۂ زمانہ۔ عربی فارسی کے سوا ہندی میں بھی دستگاہ کامل رکھتے تھے۔ دربار سلطانی میں مختلف مناصب جلیلہ پر مثل میر منشی داروغہ کتب خانہ سرکاری و خانساماں وغیرہ پر مامور رہے تھے۔ بڑے علم دوست تھے۔ آپکا دل و دماغ علوم اور کتابوں کا خزانہ تھا اور زبان مشاہیر کی ترجمان۔ ۱۴۔ ذیقعدہ ۱۱۱۳ھ کو رحلت فرمائی مدفن آگرہ تھا۔ مگر اب مزار ہے نہ نشان مزار باقی ہے۔ ایک بے مثل و نادر کتاب خانہ یادگار چھوڑا تھا۔ اپنے استاد معظم کیخدمت میں ایام آخری تک موجود ہو کر بیٹھے رہے۔ ملا عبدالعزیز جسوقت بستر مرگ پر تھے اسوقت بھی تالیف و تصنیف

میں مشغول تھے۔ وہ جو کچھ ارشاد فرماتے اُسکو میر ہادی (فضائل خاں) اور محمد سعید اعجاز قلمبند کرتے جاتے تھے۔

صفحہ ۱۷۵۔ نوٹ ۳۳۱۔ آخر میں اضافہ۔ اپنی دلچسپی اور اہمیت کے لحاظ سے یہ عنوان زیادہ تفصیل و تحریر کا مستحق تھا۔

ہندوستانی موسیقی میں بہت سے راگ راگنیاں تال اور ٹھاٹ ہیں۔ سنگیت کور و انکو کہتے ہیں۔ ہر صنعت موسیقی کے ماہرین اُسی خاص صنعت سے منسوب مشہور ہوتے ہیں مثلاً جو بین (وینا) میں ید طولےٰ رکھتے ہیں بین کار اور رباب یا کہلاتے ہیں۔

تانسین یا میاں تانسین کو اکبر نے ۱۵۶۶ء میں مرزا کا خطاب دیا تھا۔ وہ ربا بجانے کے فن کا بادشاہ تھا اسکے کمال کے متقدمین و متاخرین سب معترف ہیں۔ اس کا گورو ہریداس سوامی تھا جو بندرا بن میں جمنا کنارے رہا کرتا تھا۔ بیلے جو نام اوپر لئے ہیں ان میں سے ہر ایک فرد اپنے کمال فن میں فرد تھا۔ بیجو باورے کے گانے سے جنگل کے وحش و بہائم مسحور و متاثر ہو کر دوڑے چلے آتے تھے۔ گوپال نایک جب الاپتا اور دیپک راگ گاتا تھا تو چراغ خود بخود روشن ہو جاتے تھے اہل فرنگ کہتے ہیں کہ آرفیوز یونانی Orpheus جب اپنا بربط بجاتا تھا تو ہیبت ناک و خونخوار درندوں کے دل پر چوٹ لگائے بغیر نہ رہتا تھا۔ وہ بھی وجد و کیفیت میں آجاتے تھے۔ آرفیوز یورپ کا بہترین مغنی تھا جس پر مغرب کی دنیا کے موسیقی کو بڑا ناز ہے مگر مشرق کا وہ یکتائے فن جسکی ہنرمندی و کمال کا اعتراف یورپ کو بھی کرنا پڑا ہے تانسین تھا مسٹر پوپلے نے موسیقی ہند میں

Music of India—H. A. Popley.

اسکے متعلق بہت سی حکایات اور عجیب و غریب واقعات نقل کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ ایک مرتبہ

اکبر نے تان سین سے رات کا راگ گانے کی فرمایش کی۔ دوپہر کا وقت تھا چلچلاتی دہوپ پڑ رہی تھی۔ تعمیل حکم بغیر چارہ نہ تھا۔ تانسین نے گانا شروع کیا تو وہ جس مقام پر کھڑا تھا وہاں رفتہ رفتہ تاریکی و سیاہی دوڑ آئی اندھیرا چھا گیا۔ اُسکی آواز جہانتک پہونچ رہی تھی تیرگی و ظلمت طاری تھی۔ خود اکبر کی آنکھوں کے سامنے اندھیری رات کا سماں چھایا ہوا تھا۔

صفحہ ۱۶۴۔ نوٹ ۱۳۶۔ اضافہ۔ آخر میں مفتی صاحب دو کتابوں کا حوالہ اور دیتے ہیں (۱) حاشیہ قاموس موسوم بہ القول المانوس۔ شیخ عبد الباسط بن خلیل حنفی سبط سراج الدین بلقینی نے لکھا تھا۔ شیخ صاحب کا سال وفات ۹۲۰ھ ہے (۲) کسی اور فاضل نے بھی حاشیہ سعدی اور بلقینی کو یکجا کیا اور اُسکا نام القول المانوس شرح متعلق القاموس رکھا تھا۔

صفحہ ۱۶۸۔ سطر اول۔ حاشیہ متعلق نوشہرہ ــــ اقصائے مشرق ہند میں بیٹھ کر اس مقام کی تحقیق میرے لئے دشوار ہے تاہم دو مواضع کا تذکرہ لابد ہے۔

ایڈورڈ تھارنٹن اپنے گزیٹیر کی جلد دوم مطبوعہ ۱۸۵۴ء میں لکھتا ہے۔ نوشہرہ یا نوشہر سرائے۔ ایک نہایت وسیع کاروان سرائے اُس راستہ پر ہے جو لاہور سے کشمیر کو پیر پنجال کے درہ ہو کر جاتا ہے۔ خشت پختہ سے تعمیر ہے مگر پھاٹکوں میں سامنے کی طرف پتھر لگا ہوا ہے۔ ابتداءً ایسی مستحکم و محفوظ تھی کہ قلعہ اور کاروان سرائے دونوں کا کام دیتی تھی۔ لیکن اب شکستہ حال ہے۔ یہ دریائے توہی یا تھوئی پر واقع ہے جو پینتیس یا چالیس میل جنوب و مشرق کو چل کر چناب میں گرتا ہے۔ پھاٹک کے ایک کتبہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسکی تعمیر مغل شاہنشاہ اکبر کے حکم سے ہوئی تھی۔
نوشہر سرائے کا عرض البلد ۳۳ درجہ ۹ دقیقہ اور طول البلد ۷۴ درجہ ۱۷ دقیقہ ہے۔

الیف وان ہیوگل F. Von Hugel نے اپنے سیاحت نامہ کشمیر میں اور

مور کرافٹ Moorcroft نے سفر نامہ پنجاب و بخارا میں اسکا ذکر کیا ہے۔
ٹھارٹن ایک دوسرے نوشہرہ کا نام بھی لیتا ہے۔ یہ سندھ میں ایک قصبہ زیر حکومت میر علی مراد کے تھا سکھر سے جنوب و مغرب میں چہتر[۷۶] میل پر اور شکار پور سے اٹھاسی[۸۸] میل پر جنوب و غرب میں۔ عرض البلد ۲۶ درجہ ۱۵ دقیقہ اور طول البلد ۶۸ درجہ ۵ دقیقہ
صفحہ ۱۷۱ نوٹ ۱۴۲۔ خاتمہ۔ مشاہیر کاملین میں چند حضرات اور مستحق تذکرہ ہیں جنکی بدولت اس شریف فن نے خاک ہند کو کیمیا بنا دیا تھا۔

میر[۱] عبدالحیٔ مشہدی اکبر آبادی۔ کمالات شاعرانہ میں یگانہ تھے اور حلیہ علم و عمل سے آراستہ و پیراستہ۔ اکثر فنون میں دستگاہ تام حاصل تھی۔ ہمایوں کے عہد ہمایوں میں منصب صدارت پر ممتاز ہوئے خط بابری مخترعہ بابر بادشاہ کو خوب جانتے اور خوب لکھتے تھے۔

محمد[۲] یوسف۔ قلمرو خوش نویسی کا بادشاہ تھا۔ کابل میں پیدا ہوا۔ تربیت و نشو و نما ہندوستان جنت نشان میں پائی۔ حسن خط کے سوا شعر گوئی میں دخل کامل اور سخن فہمی کا ذوق سلیم رکھتا تھا۔ اکبر بادشاہ کا منشی خاص تھا۔ سنہ ۹۷۶ھ میں ریعان جوانی میں وفات پائی۔

خواجہ[۳] ابراہیم حسین۔ بزرگ زادگان قصبہ بلوقی سے تھا۔ خط نستعلیق نہایت عمدہ لکھتا۔ اسکے کمال خوشنویسی نے کمال شہرت پائی تھی۔ دربار اکبری کے ملتزمان خاص سے تھا۔ عین شباب میں سفر سنہ ۱۰۰۱ھ میں اس جہان فانی سے رخصت ہوا۔

میر[۴] عبداللہ تبریزی، شاہ نعمت اللہ ولی کی اولاد سے تھے۔ دینوی علوم شاہ غیاث اور مولانا راقمی سے حاصل کئے تھے۔ طریقت میں شیخ فیض اللہ چشتی سہارنپوری کے عقیدتمند و دست گرفتہ تھے۔ ہفت قلم لکھنے میں استاد تھے بالخصوص نستعلیق میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ دربار جہانگیری سے مشکین قلم خطاب پایا تھا۔ ایک موقع پر افتخار

فرماتے ہیں ؎

وصفی تخلص من و مشکیں قلم خطاب ‏ ‏ ‏ ‏ ایں نامہ از شاہِ شہنشاہ یافتم

مختلف مقامات میں اکثر کتبے آپکی سحر طرازی و جادو نگاری کی یادگار اب بھی نظر آتے ہیں۔ سخنور و سخن فہم تھے۔ کلام نہایت دلکش و شیریں ہوتا تھا پانچ مثنویاں اور ایک دیوان اولاد معنوی یادگار اور میر محمد صالح کشفی اور میر مومن دو نامور و رشید فرزند چھوڑے تھے۔

۱۰۳۵ھ (۱۶۲۵ء) میں رحلت فرمائی۔ مزار آگرہ میں ہے۔ محمد صالح حسینی موصوف نے اسپر عالیشان گنبد بنوایا تھا متعدد قطعات تاریخ بخط نستعلیق کندہ ہیں۔

میر صالح ؒ مرد صالح اور الولد سر لابیہ کے پورے مصداق تھے۔ زہد و اتقاء و تقدس میں بے نظیر تھے زیور علم و فضل سے متحلی۔ مذاق سخن آبائی تھا۔ فن خطاطی بھی پدر نامور سے سیکھا تھا "مشکیں قلم" موروثی خطاب سے مفتخر تھے۔ شاہجہاں کے اصرار سے ملازمت سرکاری منظور کر لی تھی۔

آپکی تصانیف میں (۱) مناقب مرتضوی اور (۲) مجموعہ راز شہرت کافی رکھتے ہیں۔ ۱۲۔ شعبان ۱۰۶۱ھ کو (۱۶۵۱ء میں) انتقال کیا۔ اپنے والد ماجد کے مقبرہ کے پہلو میں استراحت گزیں ہیں۔

صفحہ ۱۷۱۔ نوٹ ۱۴۳۔ فیروز نے قطعہ تاریخ بھی لکھا تھا ؎

اے دریغا کہ مشفق و مکرم	عارف وقت خضر بحر نوال
آں محقق مدقق دوراں	آں مفتح درِ سرائے جلال
سال ہشتاد و چار در دنیا	کرد تلقین دین مبارک فال
چوں ندا در رسید از عالم غیب	گشت پنہاں بسان آب زلال
اسم و تاریخش از خرد جستم	گفت ہاتف بدانکہ شیخ کمال

باش آزاد از غمش فیروز   صبر بہتر ازیں ملال منال ۱۰۰۱ھ

صفحہ ۲۰۶ - نوٹ ۸۳ - امام ابوحنیفہ - سطر ۵ - کم وبیش انہیں حالات کو صاحب عجائب القصص نے بھی نقل کیا ہے اور وہ حوالہ محمد بن علی بن الحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہم کا دیتا ہے حضرت محمد سے مراد امام محمد باقرؓ کا نام نامی ہے۔

صفحہ ۲۵۱ - سطر ۱۷ - ملانواں - اضافہ - درگاہ اب کسیقدر شکستہ حالت میں ہے اکبر کے عہد میں کنکر کے چوکوں سے تعمیر ہوئی تھی حسب معمول انگریزوں کا خیال ہے کہ یہ کنکر غالباً کسی قدیم عمارت سے لئے گئے ہونگے خواہ وہ ہندوؤں کی رہی ہو خواہ جینیوں خواہ بودھوں کی چونکہ یہ مقام قنوج کے قریب ہے اسلئے زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ ملانوہ بھی بودھوں کے تابع رہا ہوگا جبکہ قنوج بدھ مذہب کا گھوارہ تھا۔

حصہ دوم

صفحہ ۲ - سطر ۷ - ہویدا است کے بعد اضافہ - شیخ مرتضیٰ حسین بلگرامی حدیقۃ الاقالیم (صفحہ ۱۵۸) میں آزاد پر اعتراض یا ان الفاظ میں طعن کرتے ہیں "...... درعہد سلطنت التمش سید محمد صغرا کہ جد سادات واسطی ساکنان محلہ سید واڑہ است وسلسلہ نسب خود را باو رسانیدہ .. "

صفحہ ۱۵ - سطر ۶ - حاشیہ پر اضافہ - قلعہ بسنت گڈھ ۱۲ - جمادی الآخرہ ۱۱۱۱ھ کو اولیائے دولت عالمگیری کے تصرف میں آیا تھا۔

صفحہ ۱۵ - سطر ۱۲ - حاشیہ - اضافہ - برولی کا قلعہ بھی دکن میں ہے - ۲۳ - محرم ۱۱۱۲ھ کو فتح ہوا تھا ھذا نصر اللہ ۱۱۱۲ تاریخ فتح ہے۔

صفحہ ۳۲ سطر ۱۳ - حاشیہ ادونی اضافہ - ادونی کا قلعہ شہر بیجانگر سے پچاس کوس اور شہر احمد آباد بدر سے ایکسو ستر کوس پر ہے مورخ فرشتہ اسکو قلاع دکن میں عدیم المثال بتاتا ہے سلطان مجاہد شاہ بہمنی نے اسکے محاصرہ کے لئے صفدر خاں سیستانی کو امیر الامرا بہادر خاں اور اعظم ہمایوں کی معیت میں ۷۷۶ھ میں بھیجا تھا - عالمگیر نے گول کنڈہ فتح کرنیکے بعد ۱۰۹۸ھ میں اس قلعہ کو

فتح کیا اور امتیاز گڈھ نام رکھا تھا۔ "فتح اودی نمودہ پادشہ دیں پناہ" تاریخ فتح ہے۔

صفحہ ۴۹۔ سطر ۱۹۔ حاشیہ۔ مولانا قاسم خطاب، سید نجم الدین محمد، نام کاہی تخلص تھا۔ عام طور پر میاں کالے کہلاتے تھے۔ مولد کابل تھا۔ فرماتے ہیں ؎

کاہی تو بلبل چمن آراے کابلی   زاغ و زغن نہ کہ بہ ہندوستان شوی

تفسیر، تصوف، ہیئت، تاریخ اور موسیقی میں کامل مہارت رکھتے تھے۔ فن موسیقی میں بہت سی کتابیں یادگار ہیں۔ اکثر مشاہیر اساتذہ کی خدمت کی تھی۔ صغر سن میں حضرت جامی کا شرف زیارت بھی حاصل کیا تھا۔ شاعری میں ایسی شہرت پائی کہ انکے اور کمال چھپ گئے۔ بڑے سیر چشم و غنی مزاج تھے۔ مرزا عسکری والی بدخشاں نے اپنا تمام خزانہ جو زر خطیر تھا صلہ سخن میں عطا کیا۔ آپ نے دفعتاً سارا مال تقسیم و خیرات کر دیا۔ بھکر کی راہ سے ہندوستان آئے دربار اکبری میں رسائی ہوئی۔ ایک غزل (لازم فیل) کے صلہ میں بادشاہ نے ایک لاکھ تنکہ مرحمت فرمایا۔ اسکو بھی ایک ہفتہ میں بانٹ کر بیٹھ رہے۔ شاعرانہ نازک مزاجی بھی رکھتے تھے بادشاہ قدرشناس کا حکم تھا کہ دربار میں جب کبھی کاہی حاضر ہو تو اسکو دیکھکر اربیہ بصیغہ پا مزد ملا کرے۔ طبع نازک پر گراں گزرا اور آپ برداشتہ خاطر ہو کر بہادر خاں (برادر خانزماں) کے پاس بنارس چلے گئے۔ کچھ مدت بعد وہاں سے آگرہ آئے اور پانوں توڑ کر ایسے بیٹھے کہ اُٹھنے کا نام نہ لیا۔ ایکسو دس سال کی عمر میں ۲ ربیع الثانی ۹۸۸ھ کو سفر آخرت اختیار کیا۔ ایک شاگرد مولانا قاسم بخاری نے "رفت ملا قاسم کاہی" مولانا عارفی نے "زجہان رفت قاسم کاہی" میر یوسف استرآبادی نے "خوش طبع" (۹۸۷ یکی عدد بیک) تاریخ کہی ملک الشعرا فیضی نے تاریخ نکالی۔

تاریخ وفات سال و ماہش جستم   گفتا دویم از ماہ ربیع الثانی

مقبرہ آگرہ میں مدار دروازہ کے قریب تھا۔ اب نشان بھی باقی نہیں۔

دیوان ضخیم چھوڑا تھا۔ بوستان سعدی کے جواب میں گل افشاں مثنوی لکھی تھی۔

پہلا شعر یہ تھا ؎

جہاں آفریدہ بجاں آفریں　　　بجاں آفریں صد جہاں آفریں

اللہ عزّ اسمہٗ کے نام کا یہ معمّا لکھا تھا ؎

نیست از ہستیش کسے آگہ　　　ابداً کان لا نہایۃ لہ

اسم نبی کا معمّا اوپر مذکور ہو چکا ہے ؎

تا رہ شرع را شناختہ ام　　　از محمد نبی شگافتہ ام

میر آزاد نے تیرہ شرع لکھا ہے۔

ملا کاہی کے معاصر ایک اور معمّہ گو شاعر مولانا شہاب الدین معمائی گزرے ہیں۔ بابر بادشاہ کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ جملہ علوم عقلی و نقلی میں فرد کامل تھے فن معمّا میں نظیر نہ رکھتے تھے۔ یہ کمال آپکے تمام کمالات پر غالب آگیا تھا۔ اس فن میں ایک نادر رسالہ لکھ کر ہمایوں کو پیشکش کیا تھا۔ سخن فہم سلطان نے صلہ جزیل کے علاوہ یہ رباعی آپکی شان میں لکھ کر بھیجی تھی ؎

نامت ز عجم رفتہ بملک عرب است　　　وز نامۂ تو در دل محزوں طرب است

ہر کس بدر آرد ز معمّا نامے　　　نام از تو بر آوردہ معمّا عجب است

سنہ ۹۴۲ھ (۱۵۳۵ء) میں رحلت فرمائی۔ شہاب الثاقب تاریخ ہے۔ مدفن آگرہ متصل مسجد ہمایوں (کچھپورہ) امیر خسرو دہلوی کے مرقد پر آپ نے ایک لوح تاریخ کندہ کرا کے نصب کرا دی تھی۔

صفحہ ۹۳۔ سطر ۹۔ شادی دختر پر حاشیہ۔ تاریخ فیض بخش میں بھی لکھا ہے شرائط صلح میں یہ طے ہوا تھا کہ شادی کے تمام انتظامات کا انصرام خود راجہ کرائے اور بادشاہ کے لئے ایک لڑکی بھیجے جو عمر کے لحاظ سے محل سرائے سلطانی میں داخل ہونے کے قابل ہو چکی ہو۔

صفحہ ۱۷ سطر ۶۔ شیلان پر حاشیہ۔ شیلان یا دسترخوان یا خوان طعام، سفرہ۔ مجازاً محفل

طعام کو بھی کہتے ہیں۔

صفحہ ۱۰۱ سطر اول۔ پدماوت پر نوٹ۔ اس وفا شعار بہادر راجپوت رانی کا واقعہ حصہ اول میں صفحہ ۱۰۱ پر نوٹ نمبر ۸۲ میں مختصراً حوالہ قلم کر چکا ہوں۔ پدماوت کا سب سے پہلا مصنف ایک نامور مسلمان شاعر ملک محمد جائسی تھا۔ یہ قصبہ جائس ملک اودھ میں ۹۱۷ھ مطابق ۱۵۴۰ء میں پیدا ہوا تھا۔ انگریز اہل قلم لکھتے ہیں کہ پوربی ہندی میں یہ ایک عمدہ اور اعلیٰ کورس ہے یورپ میں بھی اسکی کم و بیش قدر ہوئی ہے۔ فرانس کے ایک شہرۂ آفاق موسیقی نواز البرٹ رسل Albert Roussel نے بھی پدماوت کا ڈراما مرتب و تصنیف کیا تھا جو پانشر روش M. Rouche مشہور آپرا ڈائرکٹر کے زیر اہتمام دکھایا گیا تھا۔ بعض ہندو اہل نظر حضرات کا قول ہے کہ اس ڈراما اور اپنے متذکرہ قصہ میں مصنف نے بعض مقامات پر تاریخ کی متعارف شاہراہ سے لغزش کی ہے تاہم اس نے پدماوت کی وفاداری بہادری اور نسوانی خوبیوں کو بہ آئین بہیں نمودار کیا ہے۔

صفحہ ۱۰۲۔ نوٹ نمبر ۸۸ کے آخر میں۔ ملا احمد ٹھٹوی جو ملا قاسم فرشتہ کا استاد تھا ٹھٹہ کا رہنے والا تھا تاریخ الفی اپنی یادگار چھوڑی ہے۔ مولانا عبدالرشید حسینی مدنی بھی اسی شہر ٹھٹھہ کے باشندے تھے منتخب اللغات شاہجہانی آپکی تالیف ہے شاہجہان آپکی بڑی قدر و احترام کرتا تھا۔

صفحہ ۱۲۳۔ متن آخر میں اضافہ۔ پنڈت تربھون ناتھ سپرو متخلص بہ ہجر۔ اودھ پنچ کے ایک طباع و جدت پسند مضمون نگار تھے کسی موقع پر ایک خط میں بے فصل کی بارش کے سلسلہ میں لکھتے ہیں

"...... ہاں آپ سے کچھ اور بھی سنا۔ فرخ سیر کے وقت میں ع

باران بار بد بہ نیشکر قند و نبات

واللہ۔ اچھا چاشنی دار ابر تھا۔ مگر افسوس لکھنؤ میں ایسی بارش نہ ہوئی کہ ہر ایک

چھینٹے کے بعد ذرا منہ میٹھا ہوتا"

صفحہ ۱۳۱۔ سطر سوم کے بعد متن میں اضافہ۔ مولانا محمد فیض بخش اپنی تاریخ فرح بخش میں تحریر کرتے ہیں کہ قطب الملک سنی مذہب تھے۔

پانچ ہزار سالانہ حضرت شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی کی فاتحہ گیارہویں پر خرچ کرتے تھے۔ حالت اسیری و حبس میں جب خبر پاتے کہ آج گیارہویں ہے تو کسی نہ کسی امیر یا درباری کو لکھ بھیجتے۔ وہ اس کار خیر کے لئے روپیہ سید کے پاس ضرور بھیج دیا کرتا تھا۔ اپنی اسیری کے چار سال پورے کر کے اسی تاریخ پر قید ظاہری سے مخلصی پائی تھی۔

صفحہ ۱۳۷۔ سطر ۷۔ حاشیہ مرزا ایزد بخش رسا۔ یہ مرزا جعفر آصف خاں وزیر جہانگیر کے پوتے تھے۔ جملہ علوم و فنون میں کامل اور فصاحت و بلاغت و انشا پردازی میں یگانہ عصر تھے۔ عہد عالمگیر میں میر منشی رہے تھے۔ مدفن آگرہ حویلی ایزد بخش میں تھا جو اب محلہ سیلن گنج میں رابرٹ صاحب کی کوٹھی کے نام سے مشہور ہے۔ تعویذ قبر ۱۸۴۹ء تک سلامت تھا جب اسکو مسٹر بیل نے دیکھا تھا۔

صفحہ ۱۵۳۔ نوٹ نمبر ۱۸۔ سطر ۱۸۔ اضافہ۔ طبقات اکبری میں لکھا ہے کہ صفر آغا نامی غلام سلطان محمود گجراتی نے جسکا خطاب خداوند خاں تھا سورت میں یہ قلعہ نہایت مستحکم و استوار ۹۴۷ھ میں دریائے عمان کے کنارے فرنگیوں کے فتنہ و فساد دفع کرنے کے لئے بنایا تھا۔ تعمیر سے پہلے نیز دوران تعمیر میں ان لوگوں نے بڑے شر و فساد برپا کیا تھا۔ تمام رعایا خصوصاً مسلمانوں کو بہت ستاتے اور تنگ کرتے تھے۔

صفحہ ۱۶۹۔ متن۔ آخر میں اضافہ۔

مولانا مفتی سید محمد ولی اللہ حسینی نے اپنی تاریخ فرخ آباد میں میر عبد الجلیل کو بڑی عظمت و ادب کیساتھ یاد کیا ہے۔ چند باتیں قابل نقل ہیں۔

(۱) حکیم جعفر جونپوری در شاہجہاں آباد بود۔ انتساب دارد بحکیم مصری کہ سرآمد اطبائے عہد بادشاہ اکبر بودہ۔ (نوٹ ۲۰ صفحہ ۲۸۔ تذکرہ ہذا۔ حصہ دوم متعلق حکیم جعفر)

(۲) نواب صمصام الدولہ خاندوران خاں کی مجلس میں معموں کے بارہ میں گفتگو ہو رہی تھی۔ نواب صاحب نے فرمایا کہ قرآن شریف میں رطب و یابس ہر چیز موجود ہے مگر معما کہاں ہے؟ ایک حاضر طبع درباری نے عرض کیا کہ اُس (کلام پاک) کا اوّل بائے (ب) اور آخر سین (س) ہے۔ دونوں کا مجموعہ "بُس" ہوا یعنی یہ کتاب تم کو بس ہے۔ اور اس معمے کے استخراج کو امیرالمومنین سیدنا علی ابن ابی طالب رضی سے منسوب کیا۔ اعتراض پیش ہوا کہ بس تو فارسی لفظ ہے۔ آنجناب سے اس کا استخراج کیا معنی رکھتا ہے؟ حاضرین میں سے ہر شخص نے اپنی استعداد و فہم کے موافق جواب دئے۔ نواب کو انکے ماننے میں تامل تھا۔ حتے کہ میر عبدالجلیل بلگرامی نے "بُس" کا عربی ہونا ثابت کر دیا اور شہادت میں قاموس کا حوالہ دیا اور عبارت پڑھ دی۔ نواب مستطاب نے نہایت پسند فرمایا

چنانچہ مفتی صاحب فرماتے ہیں ؎

اول و آخر کلام اللہ ۔۔۔ باؤ سین آمدہ دو حرف شگرف

یعنی اے اہل دیں بر اے شما ۔۔۔ بس بود ایں کتاب من بے حرف

(صفحہ ۴۰۔ سطر ۱۱۔ آخر۔ حصہ دوم تذکرہ ہذا)

(۳) جب ۱۱۳۵ھ میں اودہم بائی کے بطن سے احمد شاہ فرزند محمد شاہ پیدا ہوا تو میر عبدالجلیل بلگرامی نے تاریخ لکھی ؎

خسرو جم نشاں محمد شاہ ۔۔۔ رتبہ افزائے تخت و تاج و نگیں

حق تعالے باو کرامت کرد ۔۔۔ بادشہ زادۂ شگفتہ جبیں

بہر تاریخ مصرعے گفتم ۔۔۔ "شہر یار ملوک روئے زمیں" ۱۱۳۵ھ

(صفحہ ۴۹۔ بعد سطر ۱۶۔ تذکرہ ہذا۔ حصہ دوم)

سطر ۸ صفحہ ۳۔ حصہ اول (نعت شریف کے چھٹے شعر کے دوسرے مصرع) میں "قدسی انسان سرشت" کی بجائے "خاکی قدسی سرشت" بنا لیجئے۔

HAYĀT-I-JALĪL

OR

The Life, Teachings and Works of

LLĀMA MĪR 'ABD-UL-JALĪL BILGRAMĪ

CONTAINING ALSO THE BIOGRAPHICAL SKETCHES OF

ꞌWĀB ĀSAF JĀH I of the Deccan, SAIYIDS HASAN 'ALĪ KHĀN and HUSAIN 'ALĪ KHĀN of Bāraha, MĪR SAIYID MUHAMMAD, SHĀ'IR and MĪR GHULĀM 'ALĪ ĀZĀD, BILGRĀMĪ

WITH COPIOUS NOTES ON

everal useful subjects and interesting matters and on numerous new and ancient towns in India and detailed accounts of many men of learning and power.

BY

IAULAVĪ SAIYID MAQBŪL AHMAD SAMDANĪ,

Late Member of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, Fellow of the Royal Society for the encourage-ment of Arts, Manufactures & Commerce, London, etc., etc.

RAM NARAIN LAL,

Publisher and Bookseller.

ALLAHABAD,

1929